ابنِ صفی
جلد نمبر
40
جاسوسی دنیا
119- موروثی ہوس
120- دہشت گر

پیش رس

"موروثی ہوس" ملاحظہ فرمائیے۔ قاسم سے ملئے۔ اس بار انہوں نے بھی کسی قدر ہاتھ پیر ہلائے ہیں۔ بس کسی طرح کھوپڑی پر جمی ہوئی برف پگھلنی چاہئے اس کے لئے ضروری ہے کہ انہیں کسی بات پر شدت سے غصہ آ جائے۔ ایک بات اور واضح کر دوں (پہلے بھی مطلع کر چکا ہوں) تا کہ نئے پڑھنے والے بھی آگاہ ہو جائیں۔ قاسم صاحب مستقل طور پر "ک" کو "ق" یا "گ" کو "غ" نہیں بولتے۔ بس کبھی "قاعدے" سے بولتے ہیں اور کبھی "کائدے" سے۔ اُن کی ذہنی رو زبان کی حرکات پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ وضاحت اس لئے ضروری تھی کہ بعض کاتب حضرات اسے میرے قلم کی بھول چوک سمجھ کر اصلاح فرماتے چلے جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قاسم صاحب کے بعض جملے پڑھنے والوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اگر خود میں نے کاپیاں چیک کیں تو بات بن جاتی ہے ورنہ قاسم صاحب کے "اصلاح شدہ" مکالمے جوں کے توں چھپ جاتے ہیں۔

اس بار ایک دلچسپ خط ہاتھ آیا ہے۔ ایک پڑھنے والے کو شکایت ہے کہ حمید فریدی اور عمران انہیں جیتی جاگتی دنیا کے افراد نہیں معلوم ہوتے۔ کیونکہ نہ کبھی اُن کے سر پھٹتے ہیں اور نہ کبھی گولیوں سے زخمی ہوتے ہیں۔ وہ سوال کرتے ہیں کیا یہ غیر فطری امر نہیں ہے۔ ہوگا بھائی! اگر میں انہیں زخمی کر کے پلنگ پر ڈال دوں تو بقیہ کہانی کا صرف "ہائے ہائے" بن کر رہ جانا بھی فطری امر ہوگا۔

انگریزی کے بعض ناول نگاروں ہی کے بس کی بات ہے کہ پہلے ہی باب میں ہیرو (جاسوس) کی پسلی کی تین ہڈیاں تڑوا دیں۔ کالر بون میں کریک ڈال دیا اور اس کے باوجود بھی اُس نے پورے ناول میں وہ دھاچوکڑی مچائی کہ مصنف کو بھی دانتوں پسینہ آ گیا اور بعد میں بیٹھا سوچ رہا ہے کہ اس کی تو تین ہڈیاں ٹوٹی ہوئی تھیں اب کیا کیا جائے اور آخر میں وہی کہ "سب چلتا ہے" ہیرو بھی چلا اور مصنف بھی کہ Best Seller قرار پایا۔

آخر میں خود کو آزمائش میں کیوں ڈالوں۔ لیکن چلئے! اس بار آپ کی یہ خواہش بھی پوری کر دی ہے۔ شروع ہی میں حمید صاحب کا سر پھاڑ دیا ہے کہ سر کا زخم بھاگ دوڑ میں اتنا زیادہ مخل نہیں ہوتا جتنی کہ پسلی کی ٹوٹی ہوئی ہڈیاں۔ ایسا آدمی تو بسا اوقات سیدھا کھڑا بھی نہیں ہو سکتا اور کالر بون کا کریک ہاتھ کی جنبش تک میں مانع ہوتا ہے۔

والسلام

ابن صفی

رات کی واردات

آج کل پھر دونوں شیر وشکر ہو رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آپس میں کبھی کوئی کھٹ پھٹ ہوئی ہی نہ ہو۔ قاسم سب کچھ بھول گیا تھا۔ دراصل خود اُس کی اپنی کمزوریاں ہی اُسے حمید کو ہر بار "معاف" کر دینے پر مجبور کر دیتی تھیں۔

قاسم ان دنوں شہر سے نکل بھاگنا چاہتا تھا۔ لیکن تنہا نہیں! لہٰذا جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ کیپٹن حمید دو ہفتے ٹائیفائیڈ میں مبتلا رہنے کے بعد دو ماہ کی چھٹی میں بھی "ملوث" ہو گیا ہے تو اُس نے تہیہ کر لیا کہ اُس کے پچھلے سارے قصور نہ صرف معاف کر دے گا بلکہ آئندہ کے لئے بھی حمید کو کھلی چھٹی ہوگی کہ جس طرح چاہے اُسے استعمال کرے۔

لہٰذا پروگرام بنا تھا وادی سرخاب کا اور قاسم کی رال بھی ٹپکنے لگی تھی۔ وادی سرخاب کے سیخ کباب اُسے ابھی تک نہیں بھولے تھے۔ سرِ شام ہی وہاں کے سارے بازار سیخ کبابوں کی خوشبو سے مہک اٹھتے تھے۔

بارہا قاسم کو وہ خوشبوئیں یاد آئی تھیں اور اُس کے منہ میں پانی آ گیا تھا اور بے خیالی میں قالین پر تھوک کی پچکاری چل جانے کی بناء پر بیوی کی جھڑکیاں بھی سنی تھیں۔

بہرحال اس وقت تو وہ دونوں ایک تیز رفتار جیپ میں وادی سرخاب کی طرف اُڑے جا رہے تھے۔ کریم آباد تک ہوائی جہاز سے آئے تھے اور کریم آباد کے پولیس اسٹیشن سے

ایک جیپ حاصل کی تھی۔ کسی آفیسر کی نجی گاڑی تھی جو تعلقات کی بناء پر مل گئی تھی۔

کریم آباد سے چلے تھے تو مطلع بالکل صاف تھا لیکن آدھا راستہ طے ہو جانے کے بعد مغرب سے سیاہ بادلوں کے پرے کے پرے اُمنڈنے لگے تھے۔

حمید خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اندازہ تھا کہ شام ہونے سے قبل ہی وادی سرخاب میں داخل ہو جائیں گے۔

''یہ تو بہت بُرا ہوا؟'' وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔

''قیا ہوا......!'' قاسم چونک کر بولا۔ وہ اُس کے برابر ہی بیٹھا ہچکولے کھا رہا تھا۔

''آسمان کی طرف دیکھو۔''

''ہاں...... ہاں موسم سہانا ہو غیا ہے۔'' قاسم خوش ہو کر بولا۔

''اس وہم میں نہ رہنا...... پہاڑی سڑک ہے۔''

''ہوغی...... سسٹران لا۔''

''کیا مطالب...... سسٹران لا......!''

''ہی ہی ہی...... کچھ نہیں...... وہ آج کل ذرا اونچی سوسائٹیوں میں اُٹھ بیٹھ رہا ہوں ...... نا...... اُمے لانت ہے۔''

نہ جانے کیوں اُسے یک بیک غصہ آ گیا۔ ورنہ بات تو ''ہی ہی'' سے شروع ہوئی تھی۔

''ہوش میں تو ہو۔''

''بالقل...... دراصل کہیں بھی پیچھا نہیں چھوڑتی......!''

''تو کیا پھر کسی سسٹران لا کا چکر ہے۔''

''اَمے نہیں...... وہ چپاتی بیغم...... خدا غارت کرے۔''

''آہا...... تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ خود ساتھ نہیں ہوتیں تو خیال سر پر سوار رہتا ہے۔''

''یہ بھی نہیں! اُسی تی وجہ سے اونچی سوسائٹیوں میں اٹھنا بیٹھنا پڑتا ہے اور وہ مجھے ایٹی کیٹ سکھاتی ہے... ہات تیری ایٹی کیٹ کی۔''

''ایٹی کیٹ کو بھی چھٹی کا دودھ یاد آ گیا ہوگا۔ ایسی کریہہ گالی نکلی تھی قاسم کے حلق سے۔''

''اَبے دماغ تو نہیں خراب ہو گیا...... گوبر انڈیل رہا ہے میرے کانوں میں۔''

''قیا قروں...... کہتی ہے بات بات پر سالا سالی نہ قہا کرو۔''

''اچھا...... اچھا...... ظاہر ہے شریفوں میں بیٹھ کر شرفاء ہی کی زبان بولنی پڑتی ہے۔''

اس پر قاسم نے شرفاء کی بھی ایسی کی تیسی کر کے رکھ دی تھی۔

''اَے...... کیا ہو گیا ہے تم کو۔''

''دسسٹران لا...... اور برادران لا......!''

''اچھا...... اچھا...... میں سمجھا...... انگریزی میں سالا سالی بولنے لگے ہو۔ گفتگو کے دوران میں۔''

''یہی بات ہے۔''

''لیکن یہ پہاڑی سڑک سسٹران لا نہیں ہے۔ ذرا سی بارش بھی ہو جائے تو بے حد خطرناک ہو جاتی ہے۔ ادھر کی گہرائیاں اور کھڈ تو تم دیکھ ہی رہے ہو گے۔''

''الاقسم آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا اُس طرف...... اگر دیکھوں تو چکر آ جائے۔''

''بس تو پھر اب خدا کو یاد کرو...... بارش ضرور ہوگی...... ان اطراف میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے...... محکمہ موسمیات کے بھی چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔''

''یار قیوں ڈرا رہے ہو۔''

''بس جتنی جلد ممکن ہو کم از کم ریگم بالا کے ڈاک بنگلے ہی تک پہنچ جائیں۔''

''وہ قتنی دور ہے...... ابے یہ تو بلقل اندھیرا ہو غیا...... ہائیں...... ابھی تو چار ہی بجے ہیں۔ ارے باپ رے...... ابے تم نے پورا سفر ہوائی جہاز ہی سے قیوں نہیں کیا تھا۔ قریم آباد میں...... یہ سسٹران لا جیپ قیوں پکڑ لی تھی۔''

''سفر سے پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔''

''اب کی اللہ نے چاہا تو ملیریا ہی ہوگا۔ سالے اٹھے ہیں ٹائیفائیڈ سے اور جیپ ڈرائیو کر رہے ہیں۔''

''بکواس بند کرو...... اور مجھے سکون سے ڈرائیو کرنے دو۔''

''میں سالا قیوں پاغل ہو جاتا ہوں۔''

''خاموشی سے سوچو۔''

گاڑی کی رفتار بتدریج بڑھ رہی تھی۔ حمید نے غلط نہیں کہا تھا۔ سڑک خطرناک تھی۔ اس پر آمد و رفت کے اوقات مقرر تھے کیونکہ دوسری طرف سے آنے والی کسی گاڑی کو راستہ دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی خراب بھی ہو جاتی تھی اور پھر لوگوں کو جن دشواریوں سے گزرنا پڑتا تھا وہی جانتے تھے۔

گھرے بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا تھا اور ہوا بھی کسی قدر تیز ہو گئی تھی۔

''اب اُڑ جائیں گے بادل......!'' قاسم چہک کر بولا۔ ''ہوا چل گئی ہے۔''

''یہاں تیز ہوا طوفانی بارش کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔''

''تو سالے جان بوجھ کر تم نے پھر میری مرمت کر ڈالی۔''

''بکواس مت کرو...... میں نے تم سے کب کہا تھا کہ میرے ساتھ چلو۔ میں تنہا ہی آ رہا تھا۔''

بات ٹھیک ہی تھی۔ قاسم خود ہی سر ہوا تھا۔ لہٰذا چپ ہو رہا۔ لیکن پھر تھوڑی دیر بعد جو اُس نے اپنی چہاتی بیگم سے متعلق بہ آواز بلند سوچنا شروع کیا تو حمید کو دن میں تارے نظر آ گئے۔ اُس کی بکواس سنتا یا دلجمعی سے گاڑی چلاتا رہتا۔ بار بار ذہن بٹ جاتا۔

پھر شائد وہ قسمت کے سکندر ہی تھے کہ پہلی بوند اُسی وقت آئی تھی جب اُن کی جیپ ریگم بالا کے ریسٹ ہاؤز کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی۔

''اُوہو...... یہاں تو ایک اسٹیشن ویگن بھی موجود ہے۔ ڈاک بنگلہ ویران نہیں ہے۔''

''سونگھو......سونگھو جلدی سے۔'' قاسم ہنس کر بولا۔ ''قوئی لڑکی وڑکی بھی پائی جاتی ہے یا نہیں۔''

''اب تم اپنی چونچ بند رکھنا۔ ابھی کچھ دیر پہلے دم نکلا جا رہا تھا۔''

''سب چلتا ہے...... ٹھینگے سے۔''

حمید نے جیپ بھی اسٹیشن ویگن کے قریب ہی روکی تھی۔ بارش شروع ہو چکی تھی اور کچھ اس رفتار سے شروع ہوئی تھی جیسے بہت دیر سے ہوتی رہی ہو۔ جیپ سے اُتر کر برآمدے تک پہنچتے پہنچتے ہی خاصے بھیگ گئے تھے۔ ہواؤں کا شور بڑھ گیا تھا۔

صدر دروازے سے گزر کر وہ ایک مختصر سی راہداری میں پہنچے۔ یہاں اتنا اندھیرا تھا کہ حمید کو جیبی ٹارچ روشن کرنی پڑی۔

''جس کمرے میں روشنی نظر آ رہی ہے اُسی طرف چلو۔'' حمید بولا۔

ہر طرف تاریکی تھی۔ بس ایک کھڑکی کسی قدر روشن نظر آ رہی تھی اور یہ روشنی بھی اتنی توانا نہیں تھی کہ باہر کے اندھیرے کا کچھ بگاڑ سکتی۔ کھڑکی بند تھی لیکن اُس کے شیشے اتنے گندے نہیں تھے کہ وہ کمرے کے اندر کا جائزہ نہ لے سکتے۔

''ایک نوجوان......ایک لڑکی اور ایک......!'' حمید جملہ پورا کئے بغیر خاموش ہو گیا۔

''ہاں ہاں قہو......رُق قیوں گئے۔''

''اور ایک معمر عورت......!''

''دیکھوں......!'' قاسم آگے بڑھ کر بولا۔ چند لمحے جھکا ہوا اندر جھانکتا رہا پھر بولا۔ ''اَمے جاؤ......اچھی خاصی تو ہے۔ قہتے ہیں معمر عورت۔ وزن دو سو پونڈ سے کسی طرح کم نہ ہوگا۔''

''ہاں! تم تو گوشت ہی آنکتے ہو...... تمہیں عمر وغیرہ سے کیا سروکار۔'' اچھا لڑکی کے بارے میں کیا خیال ہے۔

''پتا نہیں قیوں پیدا ہو گئی ہے۔ بخاکت کی پڑیا......اب مری اور تب مری۔''

''تو تمہیں پسند نہیں آئی۔''

''اَمے جاؤ......اپنی والی کیا بُری ہے...... اگر اسے پسند کرنے بیٹھوں۔''

حمید نے چوکیدار کو آواز دینی شروع کر دی تھی۔ لیکن نہ تو اُس کی طرف سے جواب ملا اور نہ اُس کمرے ہی کا دروازہ کھلا۔ وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ آئے تھے۔

بارش کچھ اور تیز ہو گئی اور اب تو گرج اور چمک کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

''اَمے اسی کمرے کا دروازہ پیٹو......وہاں سالے آتشدان میں آگ جلائے بیٹھے ہیں اور یہاں سردی سے کباڑا ہو رہا ہے۔'' قاسم نے کہا۔

حمید نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی تھی۔

''کون ہے۔'' اندر سے مردانہ آواز آئی۔

''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ چوکیدار کہاں مر گیا۔''

دروازہ کھلا تھا اور اُسی نوجوان کی آواز سنائی دی تھی۔ ''بیچارہ اپنی کوٹھری میں پڑا بخار میں بھن رہا ہے۔''

"دُوسرے کمرے بھی مقفل ہیں......اب ہم کہاں جائیں۔" حمید بولا۔

"ادھر ہی آجائیے......اچانک بارش نے بہتوں کو پریشان کیا ہوگا......؟"

"شکریہ......!" حمید بولا۔

"لیکن میری ایک درخواست ہے۔" نوجوان نے آہستہ سے کہا۔ وہ دروازہ بھیڑتا ہوا راہداری میں نکل آیا۔

"فرمائیے......!" حمید نے بڑے خلوص سے کہا۔

"میری والدہ تیز مزاج ہیں......اور بہن بدتمیز ہے......اگر کوئی بات گراں گزرے تو معاف کردیجئے گا۔"

"اجی چھوڑیئے بھی۔" قاسم جلدی سے بولا۔ "سبھی کی مائیں بہنیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

"آپ سمجھے نہیں۔" نوجوان بولا۔ "نہ وہ مار بیٹھیں گی اور نہ بہن گالیاں دے گی بس خواہ مخواہ دخل درمعقولات کی عادت ہے اور والدہ صاحبہ ہر ایک کو شبہے کی نظر سے دیکھتی ہیں۔"

"لیکن آپ بہت سادہ لوح معلوم ہوتے ہیں کیا۔ اجنبیوں سے اس قسم کی گفتگو کررہے ہیں۔" حمید سرد لہجے میں بولا۔

"اسے سادہ لوحی مت کہئے۔ اسے صاف گوئی کہتے ہیں۔"

"چلئے......چلئے......ہم خیال رکھیں گے۔" حمید نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

وہ کمرے میں داخل ہوئے......دونوں ہی اپنی جگہوں سے اُٹھ گئی تھیں اور صرف قاسم کو دیکھے جارہی تھیں۔

دفعتاً نوجوان کھنکار کر بولا۔ "میں ناصر ہوں، یہ میری والدہ ہیں......اور یہ بہن شاہدہ ہے۔"

"مجھے ساجد حمید کہتے ہیں......اور یہ میرے ساتھی مسٹر قاسم......!"

معمر عورت اپنے بیٹے کو گھورتی ہوئی بیٹھ گئی اور لڑکی نے کہا۔ "آپ تو ساجد حمید ہوسکتے ہیں۔ لیکن یہ......!" اُس نے قاسم کی طرف انگلی اٹھائی تھی۔

"شاہدہ......!" بڑی بی نے اُسے للکارا۔

"ممی پلیز......کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔ ان کا نام قاسم نہیں قراقرم ہونا چاہیے۔"

"میں آپ سے متفق ہوں۔" حمید جلدی سے بولا۔

"ہو غئے متفق......!" قاسم نے سرہلا کر آہستہ سے پوچھا۔ "قراقرم سالا قون تھا۔ میں نہیں جانتا۔"

"پہاڑ کا نام ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔" قاسم سرہلا کر بولا۔

لڑکی خاموش ہوکر آتشدان کی طرف متوجہ ہوگئی اور معمر عورت اُسے خونخوار نظروں سے گھورے جارہی تھی۔

"ہمیں بے حد افسوس ہے۔" حمید بولا۔ مجبوراً ہمیں مخل ہونا پڑا۔ سارے کمرے مقفل ہیں۔ ہوا تیز نہ ہوتی تو برآمدے ہی میں گزارا کرلیتے۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" ناصر جلدی سے بولا۔ "آتشدان کے قریب آجائیے......آپ کے کپڑے بھی بھیگے ہوئے ہیں۔"

"یہیں ٹھیک ہیں۔" حمید بیزاری سے بولا۔

بارش کے زور اور ہواؤں کے شور میں گرج اور چمک کا اضافہ شدید ہوتا جارہا تھا۔ ایک بار تو ایسی گرج سنائی دی کہ قاسم اوپر سے نیچے تک تھلتھلا کر رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوا تھا جیسے بجلی اُسی پر گری ہو۔

ٹھیک اُسی وقت شاہدہ کا قہقہہ بھی کمرے کی محدود فضا میں گونجا تھا۔

"شاہدہ ہوش میں رہو۔" ماں نے غصیلی آواز میں کہا۔

"مجھے اس پہاڑ جیسے آدمی پر ہنسی آئی تھی۔ کس بُری طرح سہم گیا تھا۔ بجلی کے کڑاکے پر۔"

"سنا تم نے کیا کہہ رہی ہے۔" حمید بولا۔

"ود مائی تھمب (with my thumb) یعنی میرے ٹھینگے سے۔"

"جو کچھ کہنا ہے زور سے کہئے۔" شاہدہ ڈپٹ کر بولی۔

پھر بجلی کڑکی تھی اور شاہدہ نے قہقہہ لگایا تھا۔

"شاہدہ! تم باز نہیں آؤ گی۔" معمر عورت غرائی۔

"میں بُرا نہیں مانتا......انہیں قہنے دیجئے۔" قاسم دانت نکال کر بولا۔

"پہاڑوں پر پھینکے جانے والے پتھر ان کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔"

"شاہد......!" اس بار ناصر نے بھی اُسے متنبہ کیا تھا۔

"مجھے کہنے دیجئے! کائنات کو مسخر کرنے والا آدمی بجلی کے کڑاکے سے ڈرتا ہوا کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

قاسم ہکلایا۔ "یہ آپ قق...... قیا کہہ رہی ہیں۔ میں نے کبھی قائینات کو مسخر نہیں قیا...... اللہ قسم...... میرے دشمنوں نے اڑائی ہوگی...... واہ بھئی۔"

شاہدہ ہنس پڑی اور معمر عورت اٹھ کر تیزی سے اس کی طرف جھپٹی تھی۔

"ارے نہیں جانے دیجئے۔" حمید بولا۔ "ہم محظوظ ہو رہے ہیں۔"

وہ برابر ہنسے جارہی تھی۔ ماں سے ذرہ برابر بھی مرعوب نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے برخلاف ناصر کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"اب قہیں مجھے غصہ نہ آجائے۔" قاسم بڑبڑایا۔ "حمید بھائی یہ قائینات مسخر کیا چیز ہوتی ہے۔"

"کسی بہت موٹی عورت سے شادی کرنے کو کہتے ہیں۔"

قاسم ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "اللہ...... ایسا مقدر کہاں...... میرے باپ نے تو اپنی مریل بھتیجی مسخر کرادی تھی۔"

"ارے...... ارے...... پھر سرگوشیاں...... کیا ہمارے خلاف کوئی سازش ہو رہی ہے۔"

"شاہدہ پلیز......!" ناصر کے لہجے میں بے بسی تھی۔ حمید سختی سے ہونٹ بھینچے آتشدان کو گھورتا رہا۔ لڑکی پاگل بھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ معصوم صورت اور بچکانہ خدوخال والی تھی۔

"بھائی جان! دخل اندازی مت کیجئے۔ جانور بھی اکٹھے ہوکر اپنی اپنی بولیاں بولتے ہیں۔ پھر آدمی کیوں منہ باندھے بیٹھے رہیں۔"

"اگر یہ بات ہے تو ہم نے قطعی بُرا نہیں مانا...... آپ تو فلسفیوں جیسی باتیں کررہی ہیں۔"

"اس بار کڑاکا ایسا ہی تھا جیسے کہیں قریب ہی بجلی گری ہو۔"

"ارے باپ رے......!" قاسم کی زبان سے بیساختہ نکلا تھا اور معمر عورت کلمہ پڑھ کر گڑگڑانے لگی تھی۔ "یا اللہ رحم کر...... ہمارے گناہ معاف کردے......!"

لیکن شاہدہ اب بھی قہقہے لگا رہی تھی۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے فطرت کی قہرمانیوں

کو چیلنج کررہی ہو۔

"آپ لوگ کہاں تشریف لے جائیں گے۔" ناصر نے قریب آکر پوچھا۔

"وادی سرخاب کے لئے نکلے تھے...... لیکن دیکھیں اب مقدر کہاں لے جائے۔" حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "اگر شاہدہ بی بی کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اپنا پائپ سلگا لوں۔"

دوسرا جملہ اُس نے اتنی اونچی آواز میں ادا کیا تھا کہ شاہدہ تک پہنچ جائے۔

"مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے...... اس غیر انسانی حرکت پر......!"

"شاہدہ تم بکواس بند نہیں کروگی۔" ماں نے پھر آنکھیں نکالی تھیں۔ لیکن وہ لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دے کر آتشدان کی طرف مڑ گئی۔

ہواؤں کا شور اب آہستہ آہستہ کم ہوتا جارہا تھا۔ بارش میں بھی وہ تیزی نہیں تھی اور بجلی کے کڑاکے بھی مضمحل ہوتے جارہے تھے۔

"کیا وہیں قیام ہے......؟" ناصر نے پوچھا۔

"جی...... نہیں...... تفریحاً نکل آئے تھے۔"

"ہم وہیں رہتے ہیں......!" ناصر بولا۔

دفعتاً قریب ہی کوئی بلی بولنے لگی تھی۔

"ممی......!" انہوں نے شاہدہ کی کپکپاتی ہوئی سی آواز سنی اور چونک کر اُس کی طرف متوجہ ہوگئے۔

بلی کی آواز نسبتاً اس بار قریب سے آئی تھی۔

"ممی......!" شاہدہ کی چیخ میں خوفزدگی کا عنصر غالب تھا۔

"قق...... قیا بات ہے ناصر صاحب۔" قاسم ہکلایا۔

"کک...... کچھ نہیں۔"

"بھگاؤ اسے......!" شاہدہ سہمے ہوئے انداز میں چیخی تھی۔ لیکن بلی تھی کہ مسلسل بولے جارہی تھی۔ ناصر اور معمر عورت کے چہرے فق ہوگئے تھے۔

حمید اور قاسم حیرت سے ایک دوسرے کو گھورتے رہے تھے۔

"بھگادو...... خدا کے لئے بھگادو۔!" شاہدہ کی آواز میں رو دینے کا سا انداز پیدا ہوگیا

تھا۔

''ہوش میں آؤ شاہدہ...... دروازے بند ہیں۔'' معمر عورت اُسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہہ رہی تھی۔ ''وہ اندر نہیں آسکتی۔''

''میں بھگائے دیتا ہوں۔ آپ فکر نہ کیجئے۔'' حمید دروازے کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

''مم...... میں بھی...... چل رہا ہوں۔'' قاسم نے خوفزدہ لہجے میں کہا اور پھر حمید سے پہلے وہی کمرے سے باہر نکلا تھا۔

اُن کے باہر آجانے کے بعد دروازہ آواز کے ساتھ بند ہوا تھا اور بولٹ سرکنے کی آواز بھی آئی تھی۔

حمید نے ٹارچ روشن کرلی تھی اور صدر دروازے کی طرف بڑھتا رہا تھا۔

برآمدے میں سناٹا تھا۔ بلی نہ جانے کہاں چلی گئی تھی اب اُس کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ صرف بارش کا ہلکا سا شور فضا میں گونج رہا تھا۔

''اے واپس چلو......!'' قاسم غرایا۔ ''اُلو بنا رہی ہے...... بجلی کے قڑاقے پڑتے لگائیں غی اور بلی کی میاؤں پر دم نکل جائے گا۔ میری ہوتی تو گردن ہی مروڑ دیتا۔''

حمید کچھ نہ بولا۔ برآمدے کے ایک تاریک گوشے میں کچھ دیکھنے کے لئے آنکھیں پھاڑتا رہا۔ پھر اچانک اُس نے ٹارچ روشن کرلی۔ کوئی برآمدے سے کود کر باہر بھاگا تھا۔

''ٹھہرو...... ورنہ فائر کردوں گا۔'' حمید ڈپٹ کر بولا۔

''بلی کو دھونسا رہے ہو...... چغد کہیں کے۔'' قاسم منہ دبا کر ہنسنے لگا۔

''نہیں! وہ کوئی آدمی تھا۔'' حمید آگے بڑھتا ہوا بولا۔ لیکن قاسم جھپٹ کر اُس کا بازو پکڑتا ہوا بولا۔ ''جاسوسی واسوسی نہیں چلے گی بتائے دیتا ہوں...... ڈرتی ہے تو ڈرنے دو سسٹر ان لاکو...... ہمارے ٹھینگے سے۔''

''پھر بھی دیکھنا تو چاہئے۔''

''آپ سالے خواہ مخواہ ہیرو بننے قی توشش نہ فرمایئے۔ لونڈیا میں رکھا ہی قیا ہے۔ ہونہہ...... کھال اور ہڈیاں...... اُلو کی دم فاختہ برادران لا نہیں تو......!''

''مت بور کرو۔''

''اچھا تو مرو جاکر......!'' قاسم نے اُسے دھکا دیا۔

''کک...... کیا بات ہے۔ کون تھا......؟'' انہوں نے ناصر کی آواز سنی۔

''قوئی بھی نہیں۔'' قاسم جلدی سے بولا۔ ''حمید بھائی بھی تمہاری بہن ہی کی طرح سنکی ہیں۔''

''آخر کیا بات تھی۔''

''اے بلا تھا...... بلی تو دوڑا لے گیا...... آپ بلے کو اردو میں دھمکی دے رہے تھے کہ ٹھہر تو جانا برادران لا ورنہ غولی مار دوں گا۔''

''کیوں حمید صاحب......؟''

''جی ہاں...... ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ اگر کوئی بلا آدمی کی طرح دو ٹانگوں پر دوڑ سکتا ہو۔''

''اے جاؤ...... خواہ مخواہ الجھا رہے ہو معاملے کو...... وہ اُسے ٹہلا لے گیا۔ اب نہیں آئے گی ادھر...... چلو واپس چلو...... بھوخ کے مارے میرا دم نقلا جارہا ہے۔ اچھی خاصی رات ہوگئی ہے۔ بلا...... بلی...... موسم خوشگوار ہے۔ رحم کرو بیچاروں پر۔''

وہ پھر کمرے میں واپس آئے۔ شاہدہ یہاں فرش پر بیہوش پڑی تھی اور ماں اُسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کررہی تھی۔

''کمال ہے۔'' نمید بڑبڑایا۔

''ایک بہت بڑی بدنصیبی۔'' ناصر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''سب چلتا ہے......!'' قاسم بولا۔ ''میری ایک خالا جان قیچوے کو دیکھ کر بیہوش ہوجاتی تھیں اور میں انہیں چھیڑنے کے لئے قیچوے ڈھونڈتا پھرتا تھا۔''

''تم اپنی زبان بند ہی رکھو تو بہتر ہے۔''

''میں نے قہہ دیا نہیں چلے غی......!'' قاسم نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''اسے ہوش نہیں آرہا۔'' ماں نے بھرائی ہوئی آواز میں ناصر کو مخاطب کیا تھا۔ ناصر اُس کی طرف بڑھ گیا اور یہ دونوں جہاں تھے وہیں کھڑے رہے۔

''شاہدہ...... شاہدہ...... بیٹی...... آنکھیں کھولو...... ہوش میں آؤ۔''

قاسم نے آہستہ سے جلے کٹے لہجے میں کہا۔ ''ہاں ہاں...... آنخیں خولو...... اور پھر قوئی شوشہ چھوڑو...... ابے اب تو بھوخ قے مارے دم نقل رہا ہے۔ چلو غاڑی سے ناشتہ دان لائیں۔''

"نہیں......ٹھہرو......!"

"ممی......!" شاہدہ منمنائی تھی۔ "بھگا دیا۔"

"ہاں...... ہاں بھگا دیا......اب نہیں ہے۔"

شاہدہ اٹھ کر بیٹھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ "یہ لوگ کون ہیں؟"

"چلو چھٹی ہوئی۔" قاسم ہنس کر بولا۔ "سین نمبر دو شروع ہوتا ہے...... قیمرہ مین ریڈی......اشٹشٹپ کلیپ دو......!"

"پلیز......قاسم صاحب۔" ناصر نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ "ہم بہت پریشان ہیں۔"

"سنئے جناب۔" حمید تلخ لہجے میں بولا۔ "ہم بھی کم پریشان نہیں ہیں۔"

"یہ ایک بیماری ہے۔ ذہنی طور پر مریضہ ہے میری بہن۔"

"خاموش رہو۔" ماں نے اُسے للکارا۔ "اجنبیوں کے سامنے سب کچھ اگل دینے کی ضرورت نہیں۔"

"چلو یار......غاڑی میں بیٹھ کر خالیں گے۔" قاسم نے حمید کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا اور حمید دروازے کی طرف مڑ گیا۔

بارش تھم چکی تھی۔ لیکن برآمدے کے نیچے ایک ایک فٹ پانی کھڑا تھا۔ وہ چھپاک چھپاک کرتے ہوئے جیپ تک پہنچے۔

"بڑھیا خاصی جیالی معلوم ہوتی ہے۔" حمید بولا۔

"شیر کی بچی......اور جو چاہو تسلیم قرلو......لیکن اب ناشتہ دان۔"

قریب کھڑی ہوئی گاڑی کا دروازہ بھی کھلا تھا اور ناصر کی آواز آئی تھی۔ "ہم بے حد شرمندہ ہیں......کیوں نہ کھانا ساتھ ہی کھائیں۔"

"جی نہیں......بس شکریہ۔" قاسم بولا۔ "اگر کھاتے وقت بھی کوئی ٹریجڈی ہوغئی تو میں بھوکا ہی مرجاؤں غا۔"

"خیر......خیر......ہم بے حد شرمندہ ہیں۔"

گاڑی کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تھی۔ شائد ناصر بھی کھانے کی باسکٹ ہی نکالنے

یا تھا۔

"قیا تفریح ہوئی ہے۔" قاسم منہ چلاتا ہوا بولا۔ "غاؤں......غاؤں......تم سالے ہو ہی نحوس......اور میں اُلو کا پٹھا غوں......غاؤں......غاؤں۔"

"خاموشی سے کھاؤ۔"

"اندھیرے میں خاؤں یا ٹھونسوں......کہیں ناشتے دان کا ڈھکن ہی حلق سے نہ اُتر جائے۔"

اور پھر واقعی ڈھکنا ہی چبا جانے کی نوبت آ گئی تھی۔ کیونکہ انہوں نے اس بار صرف شاہدہ کی چیخیں نہیں سنی تھیں بلکہ وہ تینوں ہی چیخ رہے تھے۔

"لاحول ولا قوۃ......اب کیا ہو گیا۔"

"ٹھینگے سے......تمہیں جانا ہو تو جاؤ......میں تو خاؤں غا......مرنے دو سالوں قو۔"

حمید جیپ سے اُتر کر پھر اُدھر ہی دوڑا گیا تھا۔

اس بار عجیب منظر دکھائی دیا۔ کھانے کی باسکٹ میں ایک خوفناک قسم کا کوبرا پھن کاڑھے ہوئے ایک فٹ اونچا کھڑا تھا اور وہ دور کھڑے ہذیانی انداز میں چیخے جا رہے تھے۔

"خاموش ہو جایئے۔" حمید نے چیخ کر کہا اور پھر ایسا معلوم ہوا جیسے گراموفون پر کوئی ریکارڈ چلتے چلتے اچانک رک گیا ہو۔

"یہ کیا ہے......؟"

"باسکٹ ہی میں تھا۔" ناصر بولا۔ "جیسے ہی باسکٹ کا ڈھکنا اٹھایا......!"

"ہوں......ٹھہریئے...... پہلے اس سے نپٹ لوں پھر بات کروں گا۔" حمید آہستہ آہستہ باسکٹ کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ سانپوں سے متعلق وہ بہت کچھ جانتا تھا۔ فریدی سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ کوئی بُرا وقت پڑ جاتا تو سپیرا بن کر بھی پیٹ پال سکتا تھا۔ قریب پہنچا ہی تھا کہ سانپ نے اُس پر پھن مارنے کی کوشش کی۔ حمید نے فاؤنٹین پن جیب سے نکالا اور تھوڑے فاصلے سے اُسے اُس کے سر پر نچانے لگا۔ پھر جیسے ہی ایک بار اُس کا پھن دوسری طرف گھوما حمید نے اُس کی گردن چٹکی سے جکڑ لی۔ پھن غائب ہو گیا اور اُس کا منہ پھیل کر رہ گیا۔ شاہدہ بھی چیخ پڑی تھی۔

حمید اُسے اسی طرح چٹکی میں دبائے ہوئے آہستہ آہستہ باسکٹ سے نکالتا رہا۔ پھر وہ

کسی بے ضرر کیچوے کی طرح اُس کے ہاتھ میں جھولتا رہ گیا تھا۔ پھیلے ہوئے منہ کا رخ اپنی طرف کرتے ہوئے اس نے انہیں اطلاع دی۔ ''زہر کی تھیلی نکال دی گئی ہے...... یہ صرف زخمی کرسکتا ہے مار نہیں سکتا۔''

''بہت ہوچکا۔'' اُس نے معمر عورت کی گونجیلی آواز سنی اور چونک کر اُن کی طرف متوجہ ہوگیا۔ عورت کے ہاتھ میں چمکدار براؤنی نظر آیا تھا۔ جس کا رخ اُسی کی طرف تھا۔

''کیا مطلب......؟''

''جو اس مہارت سے سانپ پکڑ سکتا ہے وہی اُسے باسکٹ میں رکھ بھی سکتا ہے۔''

''یقیناً رکھ سکتا ہے......لیکن آپ نے مجھ بیچارے پر کیوں پستول تان رکھا ہے۔''

''اسے باسکٹ میں ڈال کر ڈھکنا بند کرو......!'' عورت نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''چلئے...... یہ بھی سہی۔'' حمید نے کہتے ہوئے اُس کے مشورے پر عمل کیا تھا۔

''اب فرمایئے۔'' وہ اُن کی طرف مڑا۔

''اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔''

''خوب...... چلئے! اٹھ گئے ہاتھ بھی۔''

''ناصر اس کے ہاتھ باندھ دو۔''

''ممی...... پلیز...... جلد بازی اچھی نہیں......غلط فہمی بھی ہوسکتی ہے۔''

''بکواس مت کرو......کیا ابھی تم نے اس سپیرے کا کرتب نہیں دیکھا۔''

''یہ تو میری ہابی ہے محترمہ۔ ورنہ میں تو ایک بے حد شریف آدمی ہوں۔'' حمید بولا۔

''میں کہتی ہوں باندھو اس کے ہاتھ...... اپنی ٹائی کھول لو...... خان شہباز کی بیٹی اتنی احمق نہیں ہوسکتی۔ میں خود ہی دیکھ لوں گی ان سبھوں کو۔''

حمید نے متحیرانہ انداز میں پلکیں جھپکائی تھیں۔ وہ ناصر کو ٹائی کھولتے بھی دیکھ رہا تھا لیکن اُس کے چہرے پر تردد کے آثار بھی صاف پڑھے جاسکتے تھے۔

طوعاً و کرہاً وہ حمید کی طرف بڑھا تھا۔ حمید نے دل میں کہا ''اچھا بڑی بی......تمہاری ساری شہبازیت پل بھر میں پھر ہوجائے گی۔''

جیسے ہی ناصر اُس کے قریب پہنچا اُس نے بڑی پھرتی سے اُس کا ہاتھ مروڑ کر اپنے

سامنے کرلیا۔ اب پوزیشن یہ تھی کہ ناصر اُس کی ڈھال بنا ہوا اپنی ماں کو بے بسی سے دیکھے جارہا تھا۔ حمید کا بایاں بازو اُس کی گردن میں تھا اور وہ اُس کے سینے سے ٹکا ہوا بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

''اب اس طرح فائر کیجئے کہ گولی صاحبزادے کے دل کو چھیدتی ہوئی میرے دل میں ترازو ہوجائے۔''

''چھوڑ دو......اسے چھوڑ دو۔''

''یہ کیا کررہی ہیں ممی......!'' شاہدہ اچھل کر اُن کے درمیان حائل ہوگئی اور اُس نے پستول ماں کے ہاتھ سے چھین لیا۔ بڑی بی پر گویا سکتہ طاری ہوگیا تھا۔

حمید آہستہ آہستہ ناصر کے کان میں کہہ رہا تھا۔ ''فکر مت کرو...... مجبوری تھی۔ ورنہ آنٹی شائد سچ مچ فائر کردیتیں......خان شہباز کا حوالہ کافی تھا میرے لئے۔''

پستول شاہدہ کے ہاتھ میں آتے ہی اُس نے ناصر کو چھوڑ دیا۔ اُدھر قاسم دروازے میں کھڑا کوئی بہت بڑا نوالہ حلق میں اتارنے میں مشغول تھا۔

''سین نمبر تیرہ......تمام ہوا......!'' وہ غاؤں غاؤں کرتا ہوا بولا اور شاہدہ ہنس پڑی۔ بڑی بی کسی تھکے ہارے چوپائے کی طرح ایک گوشے میں منہ ڈال کر بیٹھ گئی تھی۔

''میرا کارڈ......!'' حمید نے جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر ناصر کی طرف بڑھا دیا۔

''نہیں......!'' ناصر اُسے غور سے دیکھتا ہوا اچھل پڑا۔

''کیا سچ مچ مداری ہیں......!'' شاہدہ نے پوچھا۔

''بلکہ بھکاری بھی ہے...... برادران لا......!'' قاسم بولا۔

''حمید صاحب! ہمیں بے حد شرمندگی ہے۔ ممی یہ کرنل فریدی کے اسسٹنٹ کیپٹن حمید ہیں۔'' بڑی بی کچھ نہ بولیں۔ البتہ شاہدہ جھپٹ کر آگے آئی تھی۔

''دیکھوں......!'' اُس نے کارڈ ناصر سے جھپٹتے ہوئے کہا اور پھر وہ بھی نروس نظر آنے لگی تھی۔

''چلو بھئی پاپ...... کٹا......!'' قاسم چہکارا۔

''تت......تو...... یہ......یہ......!'' وہ قاسم کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ''ڈاکٹر ٹسڈل

کا بنایا ہوا کوئی دیو پیکر آدمی ہے۔"

"نہیں...... یہ اتنا ہی بڑا پیدا ہوا تھا۔" حمید ہنس کر بولا۔

"اے جبان سنبھال تے ورنہ نقال دوں غا ساری قینچانی۔"

"وہ تو نکال ہی چکے ہو گے۔ میرے لئے کچھ بھی نہ چھوڑا ہو گا...... اگر اب بھی پیٹ نہ بھرا تو ان کی باسکٹ میں ابھی بہت کچھ ہے۔"

"اچھا...... تم تو چڑیا کا کھانا لے کر چلے تھے...... بڑی خوشی ہوئی۔"

"نکال لو مرغ مسلم......!"

"کیوں بی بی......!" قاسم نے شاہدہ سے پوچھا۔

لیکن اُس سے پہلے ہی بڑی بی بول پڑیں۔ "مزید ہنگامے کی ضرورت نہیں۔ میں شرمندہ ہوں۔"

"ارے جناب! اس میں ہنگامے اور شرمندگی تی قیا بات ہے۔ کھاؤں غا اور دعا دوں گا...... تو پھر کھولوں باسقٹ......؟"

"نہیں......!" شاہدہ جلدی سے بولی۔

"آپ کی مرجی...... میں قوئی ندیدہ تھوڑا ہی ہوں۔ اللہ آپ تو بہت دے۔"

"میں پوچھتا ہوں میرے لئے بھی کچھ چھوڑا ہے یا نہیں۔" حمید نے بھنا کر پوچھا۔

"بے خودی میں سب کھا غیا...... تم تو سین نمبر تیرہ قرنے دوڑے آئے تھے۔"

"فکر نہ کیجئے...... باسکٹ کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے گاڑی میں۔" ناصر نے کہا۔

"آخر ہوا قیا...... یہ پستول وستول کیسا پکڑ رکھا ہے شاہدہ بی بی۔"

"بس مذاق تھا موٹے بھائی...... پرواہ نہ کرو۔"

"میں بھی تو سنوں۔"

"بکواس بند کرو...... جاؤ اور ناشتہ دان دھو کر رکھ دو۔" حمید نے کہا۔

"کھاؤں بھی میں اور دھوؤں بھی میں ہی...... قسی اور تو اُلو بنانا......!" قاسم ترنگ میں آ کر بولا۔

"میں شروع ہی سے سوچ رہا تھا کہ آپ کو کہاں دیکھا ہے۔" ناصر نے حمید سے کہا۔

"اب ختم بھی کیجئے اس قصے کو۔"

"آپ سے بہت سے سوال کروں گی۔" شاہدہ بولی۔

"ضرور......ضرور...... لیکن ارتھمیٹک کا نہ ہونا چاہئے۔ ورنہ مجھے نو دو گیارہ ہونا پڑے گا۔"

"اور میں نہ تین میں نہ تیرہ میں......!" قاسم بولا۔

"آپ تو مجھے پانچویں سوار معلوم ہوتے ہیں۔"

"ایسا نہ کہئے...... بیچارے گدھے کا کچومر بن جائے گا۔" حمید بولا۔

"آپ بھی تو بیچارے غدھے ہی ہیں۔" قاسم نے ہنس کر کہا۔ بے تحاشہ چہک رہا تھا۔ حمید کو بھی حیرت ہونے لگی تھی۔

"میں اور کچھ لا رہا ہوں...... باسکٹ خالی کر دی گئی تھی۔" ناصر نے کہا۔

"تو پھر قیا ہے اس میں۔" قاسم حمید کو گھورتا ہوا بولا۔

حمید اور ناصر باہر چلے گئے۔

"بیٹھ جاؤ موٹے بھائی۔ کب سے کھڑے ہو۔" شاہدہ بولی۔

"شاہدہ۔" بڑی بی سخت لہجے میں بولیں۔ "میں اجنبیوں سے بے تکلفی پسند نہیں کرتی۔"

"اجنبی...... نہیں تو ممی...... یہ بھی میرے باپ کے بیٹے ہیں۔ ابن آدم...... میں تو انہیں ہزار ہا سال سے جانتی ہوں۔"

"تم دونوں بھائی بہنوں نے میری زندگی تلخ کر رکھی ہے۔"

"ممی...... پلیز...... اجنبیوں کے سامنے اتنی ذاتی گفتگو بھی مناسب نہیں۔"

"جہنم میں جاؤ۔" بڑی بی آتشدان کی طرف کرسی گھما کر بیٹھ گئیں۔

"آپ نے ناراج قر دیا ممی قو......!" قاسم بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"دل کی بُری نہیں ہیں...... ابھی ہنسنے بولنے لگیں گی۔"

"تب تو بہت اچھی ہیں...... ایق میرا باپ ہے...... جلاد۔"

"تمہیں شرم نہیں آتی باپ کے بارے میں اس قسم کی بات کہتے ہوئے۔" بڑی بی نے کہا۔

"سچ قہہ رہا ہوں ممی......! حمید بھائی سے پوچھ لیجئے غا۔"

"پھر بھی بچوں کو اس قدر بے باک نہ ہونا چاہئے۔"

"جی بہت اچھا۔" قاسم مسمسی صورت بنا کر بولا۔ شاہدہ کو ہنسی آ گئی۔

اچانک برآمدے سے دھینگا مشتی کی آوازیں آئی تھیں اور پھر جیسے کوئی جھپاک سے پانی میں گرا تھا۔

"خبردار...... فائر کردوں گا" حمید کی آواز آئی۔ پھر ایک فائر بھی ہوا تھا۔

"شروع ہوغئی۔" قاسم بُرا سا منہ بنا کر بدبدایا۔

پھر راہداری میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز گونجی تھی اور دروازہ کھول کر ناصر اندر داخل ہوا تھا۔

"ممی...... پسٹل......!" وہ ہانپتا ہوا بولا۔ "مجھے دیجئے۔"

"کیا بات ہے؟"

"کوئی تھا برآمدے میں...... کیپٹن حمید اُس کے پیچھے تنہا گئے ہیں۔"

"تو تم کیا کرو گے؟"

"میں بھی جاؤں گا...... وہ تنہا ہیں۔"

"چلو بیٹھو...... وہ ایک تجربہ کار پولیس آفیسر ہیں۔ تمہیں تو تہذیب کھا گئی ہے۔ پستول پکڑنے کی بھی تمیز نہیں ہے۔"

قاسم دروازے کی طرف جھپٹا تھا۔ لیکن برآمدے ہی میں کھڑا آنکھیں پھاڑتا رہ گیا۔ گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

"اے جرا ٹارچ تو لانا" اُس نے تھوڑی دیر بعد ناصر کو آواز دی تھی۔

ناصر فوراً ہی آیا تھا اور اُس نے ٹارچ روشن کی تھی۔ روشنی کا دائرہ بالآخر ایک عجیب وضع کے جوتے پر جم گیا جو برآمدے کے وسط میں فرش پر پڑا ہوا تھا۔

"ہائیں......!" قاسم حیرت سے بولا۔ "یہ قیا ہے؟"

"جج...... جوتا......!" ناصر کی آواز کانپ رہی تھی۔

"جوتا ہے تو پھر اکبر اعظم یا جہانگیر کا جوتا شریف ہوغا...... میں نے تو خواب میں بھی قبھی ایسا جوتا نہیں دیکھا۔"

"ہوتا ہے...... ہوتا ہے......!" ناصر نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر اندر دوڑ

گیا تھا۔ قاسم "ارے ارے" ہی کرتا رہ گیا۔

پھر وہ بھی واپسی کے لئے مڑ ہی رہا تھا کہ راہداری میں ٹارچ کی روشنی دکھائی دی۔ اس بار ناصر کے ساتھ بڑی بی بھی تھیں۔

وہ بھی جوتے کو حیرت اور ناگواری کے تاثرات کے ساتھ دیکھ رہی تھیں۔ پھر انہوں نے جھک کر اُسے اٹھایا تھا اور واپسی کے لئے مڑ گئی تھیں۔

قاسم وہیں کھڑا رہا۔ وہ دونوں جا چکے تھے۔

"بڑی بی تے بھوت بھائی کا ہوغا......!" وہ کچھ دیر بعد بڑبڑایا۔ "یہ جوتا تھا...... یا ابتدائی ہوائی جہاز کا موڈل...... پتا نہیں قیا چکر ہے۔ سالے حمید بھائی! قتنی بار قہوں کہ میرا تیرا ساتھ ہے ہی سالا منحوس......!"

اس نے گانے کی کوشش کی تھی۔ پھر خیال آیا تھا کہ کیوں نہ چل کر حمید کو تلاش کیا جائے۔ لیکن کیچڑ پانی کی وجہ سے ہمت نہ پڑی۔ پہاڑ جیسے ڈیل سمیت اگر رپٹ کر گرا تو اٹھائے گا کون؟ مجبوراً انہی لوگوں کے پاس پھر واپس آنا پڑا تھا۔ لیکن اُن لوگوں کو جس حال میں پایا وہ اتنا مضحکہ خیز تھا کہ بے اختیار ہنسی چھوٹ گئی۔ جوتا فرش پر رکھا ہوا تھا اور وہ تینوں خاموشی سے دیکھے جا رہے تھے۔

"قق...... قیا اب یہ اُڑے گا بھی۔" اُس نے ہنسی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا تھا اور پھر شاہدہ بھی ہنس پڑی تھی۔

ماں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اسے سوٹ کیس میں ڈال دو۔"

"اس جوتے قو......!" قاسم کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں قاسم صاحب...... مجھے نوادرات اکٹھا کرنے کا شوق ہے۔ یہ جوتا پندرہویں صدی کا معلوم ہوتا ہے۔"

"جرور...... جرور...... لیقن ایک ہی تو ہے...... پتا نہیں پندرہویں صدی سے ادھر قیوں آ نکلا تھا کہ بیچارے قو ایک جوتا چھوڑ کر بھاغنا پڑا...... لل...... لیکن حمید بھائی۔"

"ہمیں انہیں تلاش کرنا چاہئے۔" ناصر چونک کر بولا۔

"تو پھر چلو...... اقیلے یوں نہیں جاسکتا کہ اگر کیچڑ میں پھسل قر گرا تو اٹھوں گا قیسے۔"

"آپ پہئے کیوں نہیں لگوا لیتے قاسم بھائی۔" شاہدہ نے پوچھا۔

"والد صاحب سے پوچھ قر بتاؤں غا......!" قاسم نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

وہ دونوں باہر آئے تھے۔ ناصر نے ٹارچ روشن کر رکھی تھی۔

"آپ واقعی پانی میں نہ چل سکیں گے۔" ناصر بولا۔ "مجھے ہی جانے دیجئے۔"

"اقیلے نہیں جاسقتے آپ......!"

"میں بچہ نہیں ہوں۔"

"اس قی بات نہیں......ایق سے دو بھلے۔"

بہر حال وہ دونوں ہی نکلے تھے۔ احاطہ پار کر کے سڑک پر آئے۔ یہ جگہ ڈھلان پر تھی۔ اس لئے اتنی بارش ہونے کے باوجود بھی یہاں کیچڑ یا پانی نہیں تھا۔

ٹارچ کی روشنی تاریکی میں گردش کر رہی تھی۔ دفعتاً ایک جگہ روشنی کا دائرہ ٹھہر گیا۔

کوئی زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھے۔ قاسم تو جھک بھی نہیں سکتا تھا۔ ناصر ہی نے اُسے سیدھا کیا تھا۔

"ارے باپ رے......حمید بھائی۔" قاسم کے حلق سے بے ہنگم آوازوں کیساتھ نکلا تھا۔

"بیہوش ہیں......اُوہ......سر سے خون بھی بہہ رہا ہے۔"

"میں تو جھک نہیں سقتا۔" قاسم بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "اٹھا سکو تو اٹھا قر میرے ہاتھوں پر رکھ دو۔"

بدقت تمام وہ زمین سے قاسم کے ہاتھوں پر منتقل ہوا تھا اور وہ اُسے اٹھائے ہوئے ڈاک بنگلے میں داخل ہوا۔

وہ دونوں بوکھلا گئیں۔

"اُوہ......یہ تو زخمی ہیں۔" بوڑھی عورت نے کہا۔ "ادھر لاؤ......ٹھہرو میں فرش پر کمبل بچھاتی ہوں......شاہدہ! کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو۔ اٹھاؤ کمبل۔"

"میں جھک نہیں سکتا۔ ناصر میاں۔" قاسم بولا۔ "پھر اٹھاؤ اور لٹا دو۔"

ناصر اور شاہدہ نے حمید کو کمبل پر لٹا دیا تھا۔

یہ گھرانا خاصا محتاط معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ ان کے پاس فرسٹ ایڈ بوکس بھی موجود تھا او

اس میں برانڈی کی ایک بوتل بھی تھی۔

شاہدہ نے بڑی پھرتی سے سر کے زخم کی ڈریسنگ کی تھی۔

"اگر تھوڑی سی برانڈی بھی۔" ناصر نے قاسم کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"نام بھی نہ لینا......ورنہ ہوش میں آتے ہی مجھے قتل قر دے غا۔"

"میں نہیں سمجھا۔"

"قہتا ہے......کہ گدھی قا پیشاب شراب سے افضل ہے۔ جب گدھی کا پیشاب نہیں پیتا تو شراب قیوں پیئوں۔"

"کمال ہے......!" شاہدہ بولی۔

"اور ان قے استاد تو نام ہی سے بدکتے ہیں۔"

"یعنی کرنل فریدی۔" شاہدہ بولی۔

"نام نہ لیجئے ورنہ فوراً پہنچ جائیں غے۔" قاسم نے ایسے انداز میں کہا کہ بڑی بی تک مسکرا پڑی تھیں۔

"اُس کا باپ بھی ایسا ہی تھا۔ ایسی پرہیز گاری کے ساتھ نوابی کر گیا کہ لوگ آج بھی عش عش کرتے ہیں۔" بڑی بی بولیں۔

"آپ جانتی ہیں۔"

"کیوں نہیں جانیں گے......میرے باپ خان شہباز کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ نواب عزیز الدین خان۔"

"ہات تیرے کی......نقل آئی رشتے داری بھی۔ اب لمبا گھپلا ہوغا......!" قاسم زیرِ لب بڑبڑایا۔

"کیا کہا......؟"

"جی قچھ نہیں۔ اپنے مقدر قو رو رہا ہوں۔ اب ہوش میں قب آؤ غے ہیرو بھائی......!"

وہ حمید کو گھونسہ دکھا کر بولا تھا۔

"آپ آخر ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں قاسم صاحب۔" شاہدہ جھنجھلا کر بولی۔

"ارے یہ......یہ تو مجھے کسی ایسی جگہ دفن کرے غا جہاں......اپنی ایسی تی تیسی میں

جائے...... مجھے پھر بھوخ لغ آئی ہے۔"

"اچھا...... اچھا...... ہم انتظار کرتے ہیں۔" ناصر بولا۔ وہ باہر چلا گیا تھا اور بڑی بی حمید کو عطر سنگھاتی رہی تھیں۔ شاہدہ نے اُن کی نظر بچا کر باسکٹ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

قاسم نے تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ کر باسکٹ پر ہاتھ ڈال دیا اور پھر ڈھکنا اٹھتے ہی جو پھنکار بلند ہوئی ہے تو وہ بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا چاروں خانے چت گرا تھا۔

شاہدہ بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ اُدھر قاسم کی دھاڑ ہی حمید کی بیہوشی رفع کرنے کی وجہ بنی تھی۔ اس طرح بوکھلا کر اٹھ بیٹھا تھا جیسے کسی مردے کے کان میں صور اسرافیل کی آواز پڑ گئی ہو۔

"کیا بات ہے...... کیا ہوا......!" وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر قاسم کو دیکھتا ہوا بولا۔

"بھاگو بیٹا...... سب بھوت ہیں۔ کچے سانپ خاتے ہیں۔ ارے باپ رے۔"

ناصر بھی دوڑا آیا تھا۔ شاہدہ برابر ہنسے جا رہی تھی۔

"کس نے کھولا تھا باسکٹ۔" اُس نے شاہدہ سے پوچھا۔ سانپ بے حد غصے میں ادھر اُدھر پھن مار رہا تھا۔ لیکن شائد باسکٹ سے نکل آنے کی ہمت اُس میں بھی نہیں تھی۔

"خود کھولا تھا...... انہوں نے۔"

بدقت تمام قاسم کو اٹھایا گیا تھا۔ "ابے بھاگو" وہ برابر کہے جا رہا تھا۔ "بلی پندرہویں صدی کا جوتا پہن کر آتی ہے۔"

"کیا پاگل ہو گئے ہو...... خاموش رہو۔" حمید بھرائی ہوئی آواز میں بولا اور پھر اس طرح چاروں طرف دیکھنے لگا جیسے ابھی تک گردوپیش کا احساس ہی نہ رہا ہو۔

"مم...... میں یہاں کیسے پہنچا۔" اُس نے ناصر سے پوچھا۔

"ہم دونوں اٹھا کر لائے تھے۔"

"وہ بھاگا تو تھا...... لیکن میری گھات ہی میں تھا۔ جیسے ہی میں کمپاؤنڈ سے باہر نکلا عقب سے سر پر کوئی وزنی چیز ماری تھی اور پھر مجھے نہیں معلوم کہ اس کے بعد کیا ہوا۔"

"پندرہویں صدی کا جوتا آیا تھا۔" قاسم ہاتھ نچا کر بولا۔

"تم خاموش رہو۔ کیوں بکواس کئے جا رہے ہو۔" دفعتاً بڑی بی کو غصہ آ گیا۔

"اے محترمہ...... جرا تمیج سے۔"

"قاسم صاحب پلیز۔" ناصر بولا۔ "آپ نے باسکٹ کیوں کھولا۔"

"اپنی ہمشیرہ محترمہ سے پوچھئے...... انہوں نے قہا تھا۔"

"کیا میں نے کہا تھا ممی۔"

"نہیں...... میں نے تو نہیں سنا تھا۔" بڑی بی نے کہا۔

"تو پھر میں ہی اُلو کا پٹھا ہوں غا...... سبھی ٹھیخ ٹھاخ ہیں...... میں قہتا ہوں حمید بھائی نقل چلو...... ورنہ اغر یہ بھوت ہماری غاڑی کا پٹرول پی گئے تو......!"

"ذرا دیر خاموش رہو۔" حمید ہاتھ اٹھا کر بولا۔

"کھاموش کھاموش قرتے اپنا بھی کباڑا قر لیتے ہو۔"

"پندرہویں صدی کے جوتے کی کیا بات تھی۔" حمید نے بڑی بی سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں! اپنی خبر تو لو...... تم زخمی ہو۔"

حمید نے ناصر کی طرف دیکھا لیکن وہ صرف ہونٹ ہلا کر رہ گیا تھا اور اپنی ماں کی طرف اس طرح دیکھنے لگا تھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ اُسے کیا کرنا چاہئے۔

"زخم اچھی طرح صاف کر دیا تھا نا......!" بڑی بی نے شاہدہ سے پوچھا۔

"جی ہاں ممی...... زخم گہرا نہیں ہے کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔ خون بند ہو گیا ہے۔"

"ہائے ہائے...... جوتے قی بات قیوں نہیں کرتیں۔" قاسم ہاتھ نچا کر بولا۔

"اس بدتمیز کو روکئے حمید صاحب۔" بڑی بی غرائیں۔

"اور...... وہ پھوں پھوں قئے جا رہا ہے اُس کا کسی کو بھی کھیال نہیں۔"

"ڈھکنا بند کر دو۔" حمید نے قاسم ہی سے کہا۔

"قیا وہ میک اپ میں تمہارا برادران لا ہے کہ ڈھکنا بھی میں ہی بند قر دوں۔"

"بکواس مت کرو۔"

"قاسم صاحب! میں آپ کے لئے کھانا لایا ہوں۔" ناصر نے کہا۔

"اور ناشتے دان سے اب کے چھچھوندر نکلے گی۔" شاہدہ بول پڑی۔

"دیکھئے! جان نہ جلائیے میری۔"

''قاسم خدا کے لئے خاموش رہو۔ جو لوگ خود ہی کچھ چھپانا چاہتے ہوں اُن سے الجھنے سے کیا فائدہ۔ بارش رک گئی ہے۔ اب ہمیں چل دینا چاہئے۔''

''میں تو اس وقت سفر کا مشورہ نہیں دوں گی۔'' شاہدہ نے کہا۔

''سوال تو یہ ہے کہ میں نے مشورہ کب طلب کیا تھا۔'' حمید اٹھتا ہوا بولا۔

''یہ باسکٹ بھی لیتے جایئے۔'' شاہدہ بولی۔

حمید نے باسکٹ کا ڈھکنا بند کردیا تھا۔ دفعتاً شاہدہ آگے بڑھی تھی اور حمید کے راستے میں حائل ہوگئی تھی۔

''آپ ہمیں تنہا چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔'' اُس نے کہا۔

''میں خود بھی نہیں چاہتا...... لیکن ایسے حالات میں جبکہ ہم پر اعتماد نہیں کیا جارہا یہاں ٹھہر کر کریں گے ہی کیا۔''

''ممی بہت پریشان ہیں۔''

''میں بھی یہی محسوس کررہا ہوں...... ورنہ وہ مجھ پر پستول نہ تان لیتیں...... اور یہ سانپ بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔ آخر وہ کون لوگ ہیں۔ جوتے کی کیا بات تھی۔''

''ہمارے نجی معاملات ہیں۔'' بڑی بی بولیں۔ ''ہم کسی کو بھی ان میں شریک نہیں کرسکتے۔ اپنے مسائل خود حل کرنے کے عادی ہیں۔''

''میں قانون کا ایک محافظ ہوں...... اس لئے خاموش بھی نہیں رہ سکتا۔''

اتنے میں ناصر نے حمید کو آنکھ ماری۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ''ان سے نہ الجھو...... میں بتادوں گا۔''

حمید طویل سانس لے کر بولا۔ ''اچھی بات ہے۔ جیسے آپ کی مرضی۔''

''تو نہیں چلو نغے تم۔'' قاسم آنکھیں نکال کر بولا۔

''نہیں چلیں نغے......!'' شاہدہ نے اُس کی نقل اُتاری اور ہنس پڑی۔

''اے اللہ میاں! اب مجھے ہی بلی بنادو۔'' قاسم دعا کے لئے ہاتھ اٹھا کر گھگھیایا۔ ''یہ برادران لاحمید بھائی تو دو کوڑی کا آدمی ہے۔ بس قوئی یلا یلی......!''

''شٹ اپ......!'' حمید اُسے گھورتا ہوا دھاڑا۔

''اچھا الا میاں! الفاج واپس...... اور اب یہ جرور جہنم میں جائے غا...... ود مائی تھمپ۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔'' شاہدہ نے پوچھا۔

''یعنی میرے ٹھینگے سے۔'' قاسم اُسے قہر آلود نظروں سے گھورتا ہوا بولا تھا۔

حملہ آور

صبح ہوتے ہوتے حمید کے علاوہ اور سبھوں نے خراٹے لینے شروع کردیئے تھے۔ سر کی چوٹ کی تکلیف بڑھ گئی تھی ورنہ وہ بھی سو ہی گیا ہوتا۔

شاہدہ کا چنچل پن اُسے اچھا لگا تھا۔ یہ وادی سرخاب کا ایک معزز ترین گھرانہ تھا۔ انگریزوں کی عملداری سے پہلے اس علاقے پر اسی خاندان کی حکمرانی تھی۔ حمید نے فریدی کی زبانی ان لوگوں کے تذکرے سنے تھے۔

ناصر کا چچا آج بھی آدھی سرخاب ویلی کا مالک تھا۔ بس شہری آبادی میں اُس کا سکہ نہیں چلتا تھا۔ مضافات میں اب بھی انہیں کے خاندان کی حکومت تھی اور سیاسی نکتہ نظر سے خان اعظم کی شخصیت اتنی ہی اہم تھی کہ ملک پر کسی بھی سیاسی پارٹی کی حکومت ہو اُسے خان اعظم کا اسی طرح خیال رکھنا پڑتا تھا جیسے برطانوی حکومت شاہی خاندان کا رکھتی تھی۔

ناصر خان اعظم کے چھوٹے بھائی کا لڑکا تھا اور یہ لوگ شہر ہی میں رہتے تھے۔ ناصر کا باپ خان عظمت علی ترقی پسند رجحانات کا حامل تھا۔ اس لئے اُس نے اپنے بچوں کو جدید دنیا اور جدید ترین علوم سے الگ نہیں رکھا تھا۔ اس کے برخلاف خان اعظم کٹر قسم کا قدامت پسند تھا۔ اپنے دیہی محل میں رہتا تھا اور شہر کا رخ بھی نہیں کرتا تھا۔

اُس نے انہی لوگوں کے بارے میں سوچتے سوچتے صبح کردی۔ پھر قاسم کو جگایا تھا اور اُسے جگانے کی کوشش کے دوران میں دوسرے بھی بیدار ہوگئے تھے۔

''آپ کا قیام کہاں ہوگا حمید صاحب۔'' ناصر نے پوچھا۔

"غالباً گلریز میں ٹھہریں گے۔"

"کیوں نہ ہمارے ساتھ چلئے۔"

"نہیں شکریہ۔ تفریح تفریح نہیں رہتی اگر ہوٹل میں قیام نہ ہو۔"

شاہدہ نے بھی اسی پر اصرار کیا تھا۔ لیکن بڑی بی ٹھس بیٹھی رہی تھیں اور اُن کے چہرے پر ایسے ہی آثار پائے جاتے تھے جیسے اپنے بچوں کی عاقبت نا اندیشانہ باتوں پر دل ہی دل میں کڑھ رہی ہو۔

"شاید ہم راستہ بھی دوسرا اختیار کریں۔"

"یعنی سڑک سے نہیں جائیں گے۔"

"شارٹ کٹ۔"

ناصر کچھ نہ بولا۔ شاہدہ نے سوال کیا۔ "ہم سے تو ملنے آئیں گے نا۔"

"اگر ہوش رہا۔" قاسم بول پڑا۔

"تم تو بولو ہی مت موٹے بھائی۔"

"اچھا جھینگر بہن۔" قاسم بُرا سا منہ بنا کر بولا۔

"شاہدہ تم باز نہیں آؤ گی۔" بڑی بی اُٹھتی ہوئی دھاڑیں۔ "اُٹھو...... چلنے کی تیاری کرو۔"

حمید اور قاسم اس وقت تک وہیں ٹھہرے رہے تھے جب تک وہ لوگ روانہ نہیں ہو گئے تھے۔

"عجیب لوغ تھے۔" قاسم ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"ہاں تھے تو...... اور وہ لڑکی شاہدہ۔"

"بس وہی تو یاد رہ جائے غی۔" قاسم ہاتھ نچا کر بولا۔ "والدہ صاحبہ اتنی لمبی چوڑی تھیں کہ تمہاری کھوپڑی میں سما ہی نہیں سکتیں۔"

دفعتاً حمید کچھ یاد کر کے بولا۔ "جوتے کی کیا بات تھی۔"

"جب تم اُس کے پیچھے بھاغ گئے تھے تو برآمدے میں ایک عجیب شکل کا جوتا پڑا ملا تھا۔ اقبر اعظم یا جہانغیر بادشاہ کے جمانے کا معلوم ہوتا تھا۔ ناصر اندر دوڑا غیا تھا اور بڑی بی کو بلا لایا تھا۔ پھر وہ اُسے حیرت اور خوف سے دیکھتے رہے تھے اور بڑی بی نے اُسے سوٹ کیس میں رکھوا دیا تھا۔ اُے میری شکل قیا دیخ رہے ہو...... خواب تھوڑا ہی دیخا تھا۔"

"اوہ...... ختم بھی کرو...... رات خواہ مخواہ غارت ہوئی۔ چلو اب نکل چلیں۔"

وہ برآمدے میں نکل آئے۔ بارش کا پانی اب تک کمپاؤنڈ میں کھڑا تھا۔ جیپ تک پہنچنے کے لئے انہیں جوتے اتارنے پڑے تھے۔

جیپ کمپاؤنڈ سے نکل کر پھر اُدھر ہی مڑی جدھر سے آئے تھے۔

"ہائیں کدھر چلے۔" قاسم چونک کر بولا۔ "قیا پھر کریم آباد......؟"

"نہیں...... ایک میل پیچھے جا کر دوسرا راستہ اختیار کریں گے۔ جلد پہنچیں گے۔"

"ٹھیخ ہے...... اب تو بھوک کے مارے دم نقلا جا رہا ہے۔"

"اسی طرح بھونکتے رہے تو دم بھی نکل آئے گی۔"

"تمہاری ایسی تی تیسی...... اب یاد آیا...... تم لونڈے تے سامنے میرا مذاخ قیوں اڑا رہے تھے۔"

"صرف تعارف کرایا تھا تمہارا...... اگر تفصیل نہ بتائی جائے تو تم دوسروں کی سمجھ میں قطعی نہیں آتے۔"

"نہیں...... تم مذاخ اڑا رہے تھے۔"

"اچھا تو پھر......!"

"قچھ بھی نہیں...... اب میں بھی مروت نہیں قروں غا۔"

حمید کچھ نہ بولا۔ چند میل سڑک پر چلنے کے بعد اُس نے جیپ ایک ایسے راستے پر موڑی تھی کہ قاسم پہلے ہی جھٹکے میں چیں بول گیا تھا۔

"ابے...... ابے یہ قیا...... مرنے قا ارادہ ہے۔"

"نہیں...... میں چاہتا ہوں کہ تم اس قدر تھلتھلاؤ کہ تمہاری جیلی بن جائے۔"

"میں نہیں جاؤں غا...... روکو غاڑی۔"

"کون سی آفت نازل ہو گئی ہے تم پر۔"

"کسی گڑھے میں جا گری جیپ تو قیا ہو غا۔"

"کچھ بھی نہیں...... بس ذرا سا مر جاؤ گے۔"

"مریں میرے دشمن...... واہ بھئی...... نہیں...... روقو غاڑی...... حرامی پن کی نہیں ہوتی۔"

"ہائیں...... ہائیں......تم پھر اردو میں گالی بک رہے ہو۔"

"مجھے حرامی پن تی انگریزی نہیں مالوم......!" قاسم جھلا کر بولا۔

"انگریزی میں ہوتا ہی نہیں حرامی پن......اسکی بجائے خیر سگالی کے دورے ہوتے ہیں۔"

"خیر سگالی کیا ہوتی ہے؟"

"تم نے دیکھا......اردو میں آ کر اس میں بھی شامل ہوگئی گالی۔ خیر سگالی۔"

"ہو ہی نہیں سکتا......تم غلط بول رہے ہو...... خیر سالی ہوغا۔" قاسم کی جھلاہٹ بڑھتی رہی اور اونچی نیچی زمین کے جھٹکوں سے سچ مچ جیلی قسم کی کوئی چیز اُسے اپنے اندر تھلتھلاتی محسوس ہوتی رہی۔

"خیر سگالی ہی درست ہے۔"

اس پر خیر سگالی کو بھی ایک گندی سی گالی ہضم کرنی پڑی تھی اور قاسم بالکل ہی آؤٹ ہوگیا تھا۔

"تمہیں بھوک لگ رہی ہے نا۔"

"لگ تو رہی ہے......!" دفعتاً قاسم نرم پڑتا ہوا بولا۔"اس خیر سغالی میں بھول غیا تھا۔"

"اس راستے پر اسی لئے آیا ہوں کہ آگے ایک قصبے میں بھیڑوں کے بچے مسلم سیخوں پر بھونے جاتے ہیں۔"

"اے جاؤ" قاسم منہ چلا کر بولا۔"وہاں پہنچ کر کہہ دو گے کہ مہنگائی کی وجہ سے بھیڑوں نے بچے ہی دینا چھوڑ دیا ہے۔"

"نہیں......ایسی کوئی بات نہیں۔ یہاں کی بھیڑیں سیاسی تقریریں سن سن کر بچے دیتی ہیں اُن پر مہنگائی اثر انداز نہیں ہوتی۔"

تقریباً دو ڈھائی میل تک جھٹکے برداشت کرتے رہنے کے بعد قاسم کی جان میں جان آئی تھی۔ کیونکہ راستہ کسی قدر ہموار ہوگیا تھا اور پھر وہ اُس قصبے تک بھی جا پہنچے تھے جس کے تصور سے قاسم کے منہ میں بار بار پانی آتا رہا تھا اور حمید نے یہ بات بھی غلط نہیں کہی تھی کہ وہاں اُس ازلی بھوکے کا پیٹ بھرنے کا خاطر خواہ انتظام ہوجائے گا۔

کارواں سرائے کے سامنے اُس نے جیپ روکی تھی۔ وہاں ایک جیپ اور بھی موجود تھی

جس کا بونٹ اٹھا ہوا تھا اور ایک آدمی انجن پر جھکا ہوا کچھ دیکھ رہا تھا۔

حمید اور قاسم اپنی گاڑی سے اُتر کر اُس حصے میں پہنچے تھے جہاں اشیائے خورد ونوش فروخت ہوتی تھیں۔ بھیڑوں کے مسلم بچے تو نہیں مل سکے تھے لیکن گوشت وافر مقدار میں موجود تھا۔ کڑھائی تکوں کا آرڈر دے کر حمید نے بیٹھنے کے لئے ایک گوشہ منتخب کیا اور وہ دونوں وہاں جا بیٹھے۔ بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو نے قاسم کا دماغ مزید خراب کر دیا تھا۔ اُس کا بس چلتا تو کچے ہی گوشت پر ٹوٹ پڑتا۔ لیکن اب تو کڑھائی تکوں کی تیاری کا انتظام کرنا ہی تھا۔ دفعتاً حمید کو اپنے قریب وہی آدمی کھڑا دکھائی دیا جیسے وہ باہر دوسری جیپ کے انجن کا جائزہ لیتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ وہ اُس سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔

"کیا بات ہے......!" حمید نے پوچھا۔

"کیا آپ شہر جارہے ہیں۔" اُس آدمی نے سوال کیا۔

"ہاں...... ہاں......!"

"وہ بیچارہ زخمی ہے اور اُسکی گاڑی خراب ہوگئی ہے۔ حالت اچھی نہیں۔ بہت سا خون ضائع ہوچکا ہے۔ اگر آپ اُسے لیتے جائیں تو بہت اچھا ہو۔ ڈیرہ غزن خان میں اُتار دیجئے گا۔"

کسی زخمی کا حال سن کر حمید نے اپنے سر کی بینڈیج بھی ٹٹولی تھی اور بولا تھا۔"کیسے زخمی ہوا۔"

"پچھلی رات رہزنوں نے گھیرا تھا۔ ران میں گولی لگی ہے۔ اُوہ......شاید آپ بھی تو زخمی ہیں۔"

"پچھلی رات کی بارش ہی کی دین ہے۔ پھسل کر گر گیا تھا۔" حمید نے بینڈیج پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔"چلو......میں اُسے دیکھوں گا۔"

"چلئے......اُدھر کوٹھری میں ہے۔ بخار میں تپ رہا ہے۔"

حمید اٹھا تھا اور قاسم نے شکوہ کیا تھا۔"اے یہ قیا......!"

"تکے آجائیں تو تم کھانا شروع کردینا۔" اس نے کہا اور اجنبی کے ساتھ اُس کوٹھری میں آیا جہاں زخمی پڑا نیم بیہوشی کے عالم میں ہذیان بک رہا تھا۔ اُس نے سیاہ پتلون اور جیکٹ پہن رکھی تھی۔ عمر زیادہ سے زیادہ چالیس سال رہی ہوگی۔ مضبوط جسم والا معلوم ہوتا تھا۔

حمید نے جھک کر زخم دیکھا۔ گولی ران کا گوشت پھاڑتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی تھی۔

''لیکن میں اسے اُتاروں گا کہاں...... یہ تو ہوش ہی میں نہیں ہے۔ کیا تم اسے جانتے ہو؟''

''صرف صورت آشنا ہوں جناب اور یہ بھی معلوم ہے کہ خان اعظم کے سپاہیوں میں سے ہے۔''

''غالباً ڈیرہ غزن خان میں خان اعظم کا منیجر رہتا ہے۔''

''جی ہاں...... بس اُنہی کی حویلی تک پہنچا دیجئے گا۔''

''اچھی بات ہے۔ ذرا ہم کھانا کھالیں۔ کیا یہاں کوئی اس کے نام سے واقف ہوگا۔''

''شائد میر سرائے جانتا ہو۔ اُسی نے اس کے لئے یہاں انتظام کیا ہے۔''

''نام معلوم ہو جاتا تو بہتر تھا۔''

''میں ابھی معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ کو مطلع کردوں گا۔''

حمید پھر اُدھر ہی پلٹ آیا جہاں قاسم کو چھوڑا تھا۔ تکے تیار ہوگئے تھے اور قاسم بڑے انہماک سے کھا رہا تھا۔

''غاؤں...... غاؤں......!'' وہ منہ چلاتا ہوا بولا۔ ''مجیدار ہیں...... چھ سات سیر تو میں ہی کھا جاؤں غا...... تم اپنے لئے...... غاؤں...... غاؤں...... الگ سے منگوالو۔''

''کھائے جاؤ...... میری فکر نہ کرو۔'' حمید نے جل کر کہا۔

''نہیں...... ایق بوٹی چکھ سکتے ہو۔''

لیکن جب حمید کئی بوٹیاں کھا گیا تو اُس نے غرا کر کہا۔ ''بس...... اپنے لئے الگ منگوالو۔''

اتنے میں اجنبی واپس آگیا اور اُس نے بتایا کہ زخمی کا نام نذرگل ہے۔

''ٹھیک ہے۔'' حمید نے کہا۔ ''ہم اُسے ڈیرے تک پہنچا دیں گے۔''

جب وہ چلا گیا تو قاسم بولا۔ ''خواہ مخواہ کیوں پڑتے ہو اس چکر میں۔''

''میں سوچ رہا ہوں۔ کہیں یہ وہی آدمی نہ ہو جس پر میں نے اندھیرے میں فائر کیا تھا۔ زخمی ہو جانے کے بعد بھی میری تاک میں رہا ہو اور میری کھوپڑی کی یہ درگت بنائی ہو۔''

''تمہاری کھوپڑی تی تو میں...... غاؤں غاؤں...... قسی دن درگت بناؤں غا۔''

حمید کے لئے بھی تکے آگئے تھے اور پھر تھوڑی دیر بعد روانگی کی ٹھہری تھی۔ کئی آدمیوں

نے زخمی کو اٹھا کر جیپ کی پچھلی سیٹ پر ڈالا تھا۔ گاڑی کے حرکت میں آتے ہی قاسم نے اونگھنا شروع کر دیا۔

''ابے...... کہیں سر ڈیش بورڈ سے نہ ٹکرا جائے۔'' حمید چیخ کر بولا تھا۔

''قیا ہوا......؟'' قاسم چونک کر آنکھیں پھاڑنے لگا۔

''آنکھیں کھلی رکھو...... ورنہ لڑھک کر کسی کھڈ میں جا گرو گے۔''

''باڈی کے فریم میں پھنس جاؤں غا...... لڑھک نہیں سکتا...... اب میں قیا قروں۔ پچھلی سیٹ پر تو وہ پڑا ہوا ہے۔''

عذر معقول تھا۔ چھ سات سیر گوشت ڈبو ہی سکتا ہے۔ اڑان پر آمادہ نہیں کرسکتا۔ لہٰذا حمید نے سوچا کہ اگر اُسے مسلسل غصہ دلایا جائے تو نیند ہوا ہو جائے گی اور پھر اُس نے اُس کی دکھتی ہوئی رگوں کو چھیڑنا شروع کر دیا تھا۔ نتیجہ مثبت نکلا۔ یعنی قاسم کی کھوپڑی زقندیں لگانے لگی اور زبان نے تالو سے نہ لگنے کی قسم کھالی۔

بہرحال وہ دونوں ہی زبانوں کے لٹھ چلاتے ہوئے ڈیرہ غزن تک پہنچے تھے۔ منیجر کی حویلی میں خاصی پوچھ گچھ ہوئی تھی اور حمید نے وہی بتایا جو زخمی کے بارے میں سرائے میں سن چکا تھا۔ اپنے بارے میں اتنا ہی بتایا کہ وہ دونوں تفریحی سفر کر رہے ہیں۔

خان اعظم کا منیجر گھماؤ پھراؤ کے ساتھ کئی بار ایسے سوالات کر چکا تھا جن کے جوابات سے شائد اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ خود زخمی نے انہیں کیا بتایا ہے۔

''کچھ بھی نہیں۔'' حمید نے کہا۔ ''وہ شروع سے اب تک نیم بیہوشی کی حالت میں رہا ہے۔ ہذیان کے علاوہ اُس کی زبان سے ہم نے کچھ بھی نہیں سنا۔''

''کس قسم کا ہذیان...... زبان سے کس قسم کے الفاظ نکل رہے تھے۔'' منیجر نے پوچھا۔

''میں نے توجہ نہیں دی......!'' حمید بیزاری سے بولا۔

''تب پھر ہمیں اُس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔'' منیجر طویل سانس لے کر بولا۔ ''ان رہزنوں نے بہت سر اٹھایا ہے۔ خان اعظم اب اپنی عملداری میں ان کا وجود نہیں برداشت کر سکتے۔''

حمید نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دی اور قاسم کی کمر تھپک کر بولا۔ ''چلو......!''

ویسے وہ لوگ قاسم کو حیرت سے دیکھ رہے تھے اور وہ یہی محسوس کرنے لگا تھا جیسے وہ اُسے انہی رہزنوں سے متعلق سمجھتے ہوں۔

حمید الجھن میں پڑ گیا تھا۔ اگر نذر گل اسی کی گولی سے زخمی ہوا تھا تو وہ دوسروں کو رہزنوں ہی کی کہانی سناتا لیکن آخر وہ لوگ یہ جاننے پر کیوں مصر تھے کہ زخمی نے اُسے کیا بتایا ہے۔ کیا سرائے میں سنے جانے والے الفاظ سے مطمئن نہیں تھے؟ آخر کیوں؟ اور اگر نذر گل وہی آدمی تھا جس کا اس سے ٹکراؤ ہوا تھا اور اُس نے محض دھمکانے کے لئے اُس پر فائر کیا تھا جب وہ بھاگ رہا تھا تو اس وقت ڈاک بنگلے میں اس کی موجودگی کا مقصد......؟

جیپ میں بیٹھتے وقت اُس نے محسوس کیا کہ وہ لوگ انہیں کینہ توز نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

''دیکھا'' قاسم سیٹ پر بیٹھتا ہوا غرایا۔ ''سالے مجھے اس طرح دیخ رہے تھے جیسے میں ہی تو رہزن ہوں۔''

''معاملہ کچھ گڑ بڑ ہے۔''

''معاملہ نہیں۔ میرے مقدر گڑ بڑ ہے۔'' قاسم بھڑک کر بولا۔ ''تمہارا ساتھ ہوا اور آئی شامت۔''

''کیوں بکواس کئے جا رہے ہو۔ میں نے کسی معاملے میں ٹانگ تو نہیں اڑائی...... جہنم میں جائیں۔''

''کھیر...... مارو غولی...... وادی سرخاب میں سیخ کباب......!'' قاسم نے کہا اور پچ سے تھوک کی پچکاری مار کر منہ چلانے لگا۔

جیپ آگے بڑھ گئی تھی۔ قاسم نے کنکھیوں سے حمید کی طرف دیکھا۔ جس نے اس طرح ہونٹ بھینچ رکھے تھے جیسے بہت شدت سے بور ہو رہا ہو۔

''یار اب میں سوچ رہا ہوں۔'' قاسم تھوڑی دیر بعد بولا۔

''کیا سوچ رہے ہو۔''

''تھوڑی تھوڑی جاسوسی آ رہی ہے کھوپڑی میں۔''

''بور کرو......!'' حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

''یار وہ لونڈیا...... بجلی کے کڑاکے پر تو قہقہے لگا رہی تھی اور بلی کی ''میاؤں'' پر بیہوش

ئی اور پھر اُس جوتے کو دیخ کر تو اُن تینوں ہی کا دم نقل گیا تھا۔ پہلے اُسے ناصر نے دیکھا پھر دوڑا غیا تھا بڑی بی کو بلانے اور وہ بڑی بی جو اتنی اکڑ دھکڑ دکھاتی رہی تھی اُس جوتے کو خ کر جیسے مر ہی غئی تھیں...... اور پھر اُسے بڑی احتیاط سے سوٹ کیس میں رکھوا دیا تھا۔''

''یہ تو طے شدہ بات ہے کہ وہ تینوں ہمارے وہاں پہنچنے سے بھی خائف ہو گئے تھے۔ نہ بڑی بی مجھ پر پستول کیوں تان لیتیں۔''

''اچھا تو پھر...... وہ سانپ قیوں لئے پھر رہے تھے ساتھ۔'' قاسم ہاتھ نچا کر بولا۔

''اُن کی لاعلمی میں کسی نے کھانے کی باسکٹ میں رکھ دیا تھا۔ لیکن وہ قطعی بے ضرر تھا۔ ر کی تھیلی نکال لی گئی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی انہیں صرف دہشت زدہ کرنا چاہتا تھا۔ ن میں سے کسی کی زندگی کا گاہک نہیں تھا۔ اُوہ یاد آیا۔ بڑی بی نے یہ بھی تو کہا تھا کہ رے نجی معاملات ہیں۔ ہم خود ہی نپٹ لیں گے۔ کسی غیر کو اس میں شریک نہیں کر سکتے۔''

''اور بڑی بی کے باپ تمہارے قرنل صاحب قے دوست تھے۔ وہ یہی قہہ رہی تھیں۔''

''ہو سکتا ہے۔''

''ٹھینگے سے...... میں تو اس لونڈیا کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

''وہ مجھے سچ مچ ذہنی مریضہ ہی معلوم ہوتی ہے۔''

''تو پھر چلو غے اُن قے گھر۔''

''ضروری نہیں۔''

''اے جاؤ...... جس گھر میں قوئی لونڈیا ہو...... وہاں تم نہ جاؤ۔''

''ضرور جاتا...... لیکن جس طرح تمہیں قاسم بھائی کہہ رہی تھی۔ مجھے بھی رو میں حمید ئی کہہ گئی تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔''

قاسم ہاتھوں سے منہ دبا کر ہنستا تھا۔

اچانک ایک زور دار دھماکہ ہوا اور جیپ اچھل پڑی۔ حمید نے پورے بریک نہ لگائے تے تو دوسری بار اُلٹ ہی گئی ہوتی۔ قاسم کا سر ونڈ اسکرین سے ٹکرایا تھا۔

''ارے باپ رے۔'' وہ کراہ کر رہ گیا۔

''پچھلا ٹائر فلیٹ ہوا ہے۔ بم نہیں پھٹا۔'' حمید بھنا کر بولا۔

وہ نیچے اُترا ہی تھا کہ اِدھر اُدھر کی چٹانوں کی اوٹ سے پانچ رائفل برداروں نے نکل کر جیپ کو گھیرے میں لے لیا۔ رائفلوں کی نالیں اُن کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

اُن پانچوں نے اپنے چہرے پگڑیوں کے بلوں میں چھپا رکھے تھے۔ صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں اور اُن آنکھوں میں سفاکی کے علاوہ اور کچھ نہیں دکھائی دیتا تھا۔

’’ہمارے ساتھ چلو۔‘‘ اُن میں سے ایک نے رائفل کی نال کو جنبش دے کر کہا۔

ان دونوں نے اپنے ہاتھ اٹھا دیئے تھے اور انہیں حیرت سے دیکھے جارہے تھے۔

’’مگر کیوں......؟ تم کون ہو؟‘‘ حمید بالآخر بولا۔

’’چلو......ورنہ جس طرح ٹائر پھاڑا تھا تمہارے سروں کے پرخچے بھی اڑا سکتے تھے۔‘‘

’’اچھا تو کیوں نہیں اڑائے پرخچے۔‘‘

’’یہ بھی ہوجائے گا اگر تم نے حکم کی تعمیل نہ کی۔‘‘

’’قہاں کے لاٹ صاحب ہو حکم دینے والے۔‘‘ قاسم غرایا تھا۔

’’خاموشی سے حکم مان لو۔‘‘ حمید بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ ’’تمہاری وجہ سے مجبوری ہے۔ ورنہ دیکھتا ان پانچوں رائفلوں کو۔‘‘

’’میری وجہ سے قیا مجبوری ہے۔‘‘

’’ایک گولی بھی پڑگئی تو تربوز کی طرح پھٹ جاؤ گے۔‘‘

’’ہاں...... یہ بات تو ہے......!‘‘ قاسم نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔ ’’میں تمہاری طرح پھرتی سے پینترے بھی نہیں بدل سکتا۔‘‘

’’کیا سنا نہیں تم لوگوں نے۔‘‘

’’کہاں لے چلو گے......؟‘‘ حمید نے بڑے رسان سے پوچھا۔

لیکن اُس کی بات کا جواب دینے کی بجائے وہ قاسم کی طرف متوجہ ہوگیا تھا جو ابھی جیپ ہی پر بیٹھا ہوا تھا۔

’’نیچے اُترو۔‘‘ رائفل والے نے اُس سے کہا۔

’’اتنا بھاری ہوں کہ جنبش بھی نہیں کرسکتا۔ تمہی لوگ اُتار لو قسی طرح۔‘‘ قاسم نے بیحد سنجیدگی سے کہا تھا۔

’’بیٹھے کس طرح تھے۔‘‘

’’پہلے اونٹ پر بیٹھا تھا پھر اونٹ نے سیٹ پر بٹھا دیا تھا۔‘‘

’’بکواس مت کرو......ورنہ زخمی کرکے نیچے کھینچ لیں گے۔‘‘

’’آخر قصور بھی تو معلوم ہو۔‘‘ حمید بولا۔

’’ہم نہیں جانتے۔ اس سے کہو نیچے اُترے۔ ورنہ سچ مچ گولی ماردوں گا۔‘‘ کہہ کر اُس نے رائفل کا بولٹ سرکایا تھا۔

’’اُتر بھی آؤ۔‘‘ حمید نے لاپرواہی سے کہا۔ ’’کوئی خاص بات نہیں معلوم ہوتی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ پچھلے سال ایک آدمی نے جوتے مار مار کر تمہیں بھینس کے پائے کھلائے تھے۔‘‘

’’قون مارے غا سالا......!‘‘ قاسم غرایا۔

’’اُو بھائی......!‘‘ حمید آہستہ سے رائفل والے سے بولا۔ ’’اس سے کہو کہ بکرے کی تین رانیں بھنی رکھی ہیں۔ رائفل کی نال پر بھی بیٹھ کر تمہارے ساتھ چلا جائے گا۔‘‘

’’تم ہی کہو......!‘‘ وہ غرایا۔

’’میری بات کا اثر نہیں ہوگا۔‘‘

’’شائد تم دونوں پاگل ہو۔‘‘ وہ آدمی بھنا کر بولا۔

’’یہ کیسے سمجھ لیا تم نے۔‘‘

’’یہ سچ مچ کی رائفلیں ہیں۔‘‘

’’میں کب کہہ رہا ہوں کہ کھلونے ہیں۔‘‘ حمید آنکھیں نکال کر بولا۔

اچانک پیچھے کھڑے ہوئے ایک آدمی نے حمید کی گردن پر رائفل کا کندہ رسید کردیا۔ وہ دھڑام سے نیچے چلا آیا اور گرتے ہی بے حس وحرکت ہوگیا۔

’’ابے اور حرام جادے...... یہ کیا قردیا تو نے۔‘‘ قاسم دھاڑتا ہوا جیپ سے نیچے اُترا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے رائفلوں کی نالیں تک چبا ڈالے گا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں اُس پر بھی رائفلوں کے کندے پڑنے لگے تھے۔

وہ چیختا رہا...... دھاڑتا رہا۔ لیکن وہ بڑے پھرتیلے تھے۔ ایک بھی اُس کے ہاتھ نہ آسکا اور پھر اُس کا بھی وہی حشر ہوا جو ذرا دیر قبل حمید کا ہوا تھا۔

کریم آباد کے ڈی ایس پی سٹی نے مضطربانہ انداز میں کرنل فریدی کی طرف دیکھا جو اُس کی کہانی سن کر غضب ناک انداز میں خاموش ہو گیا تھا۔

''وہ گولی کہاں ہے جو جیپ کے ٹائر کے اندر سے برآمد ہوئی تھی۔'' اُس نے ڈی ایس پی کی طرف دیکھے بغیر سوال کیا۔

''لیبارٹری میں...... ایکسپرٹ کی رپورٹ کے مطابق تھری ناٹ تھری کی گولی ہے۔''

''پوری رپورٹ چاہئے۔''

''ابھی منگوائے دیتا ہوں۔'' کہہ کر اُس نے فون کا ریسیور اٹھایا تھا۔ نمبر ڈائیل کئے اور کسی سے رپورٹ لانے کو کہا تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ براہِ راست پلین ہی سے کیوں نہیں گیا تھا۔ یہاں اُتر کر آپ کی جیپ کیوں لے گیا۔'' فریدی نے پُرتفکر لہجے میں کہا۔ ''اور پھر آپ کے بیان کے مطابق جیپ سرخاب ویلی کی سڑک کی بجائے ڈیرہ غزن خان کے نواح میں ملی تھی۔''

''جی ہاں! مجھے بھی اس پر حیرت ہے۔ وہ خان اعظم کا علاقہ ہے۔''

''مجھے علم ہے۔''

''اُن کے علاقے سے رہزنی کی رپورٹیں بھی ملتی رہتی ہیں۔''

''سوال یہ ہے کہ رہزن اُن دونوں کو کہاں اور کیوں لے گئے۔ رہزنی کا مقصد ہوتا ہے ڈاکہ...... اگر دونوں مارے بھی گئے تو لاشیں ہی ملنی چاہئے تھیں۔''

''میں خود بھی حیران ہوں۔''

''آپ کہتے ہیں کہ اُس دن اُس نواح میں طوفانی بارش ہوئی تھی۔ ایسی صورت میں وہ شارٹ کٹ کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔''

''لیکن اُدھر تو وہ دوسرے دن پہنچے تھے۔ کارواں سرائے سے یہی معلوم ہوا تھا۔ اُن کے ساتھی کی وجہ سے ان لوگوں کو وہاں اُن کی آمد یاد رہی تھی۔''

''دوسرے دن کا یہ مطلب ہوا کہ راستے ہی میں کہیں رک کر انہوں نے رات گزاری تھی...... لیکن کہاں......؟''

''ریگم بالا کے ریسٹ ہاؤز میں بھی گزار سکتے ہیں۔''

''لیکن ڈیرہ غزن کا راستہ ریسٹ ہاؤز سے دو ڈھائی میل ادھر ہی سے گیا ہے۔''

''کیا یہ ممکن نہیں کہ رات انہوں نے ریسٹ ہاؤز میں گزاری ہو اور صبح کو پھر پلٹے ہوں اور ڈیرہ غزن کا راستہ اختیار کیا ہو؟''

''الٹی کھوپڑیاں سب کچھ کر گزرتی ہیں۔'' فریدی طویل سانس لے کر بولا۔ اُس کی آنکھوں سے گہری فکرمندی ظاہر ہو رہی تھی۔

''کارواں سرائے میں اور کیا معلوم ہوا تھا۔'' اُس نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

''یہی کہ رکے تھے اور چھ سات سیر کے قریب کڑاہی تکے کھائے تھے اور آگے بڑھ گئے تھے۔ خوش خوراکی کا ذکر حیرت سے کیا گیا تھا۔''

''وہ دوسرا آدمی بلا خور ہے۔ ہوسکتا ہے اسی لئے انہوں نے وہ راستہ اختیار کیا ہو۔ تو پھر تفتیش کا آغاز ریسٹ ہاؤز ہی سے کرنا چاہئے۔''

''کیا فائدہ۔'' ڈی ایس پی بولا۔ ''جیپ تو ڈیرہ غزن میں ملی تھی۔''

''سوال تو یہ ہے کہ انہوں نے وہ راستہ کیوں اختیار کیا اور پھر دوسرے دن...... اُسی دن کی بات بھی ہوتی تو نظر انداز کی جاسکتی تھی۔ آخر انہوں نے رات کہاں بسر کی۔''

''کیا میں بھی چلوں۔''

''نہیں...... اس کی ضرورت نہیں۔''

''مجھے بے حد افسوس ہے کرنل صاحب۔''

''بھول جاؤ۔'' فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''مجھے دشواریوں میں ڈالتے رہنا اُس کی ہوبی ہے۔''

پھر وہ پولیس اسٹیشن سے نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھا تھا اور وادی سرخاب والی سڑک پر ہولیا تھا۔

اُسے علم تھا کہ حمید نے پلین میں دو سیٹیں وادی سرخاب کے لئے بک کرائی تھیں۔ لیکن کریم آباد ہی میں پلین کے سفر کو خیر باد کہہ کر ڈی ایس پی سٹی کی جیپ حاصل کی اور بقیہ سفر

بائی روڈ طے کرنے کی ٹھانی۔ آخر کیوں؟ ٹائیفائڈ سے اٹھا تھا۔ یوں بھی طویل ڈرائیونگ مناسب نہیں تھی۔ خیر اگر اسے افتادِ طبع کا نتیجہ باور کرلیا جائے تو سیدھا سادھا راستہ ترک کرکے ڈیرہ غزن والا دشوار راستہ اختیار کرنے والی بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آرہی تھی اور پھر دوسرے دن۔ رات اگر ریسٹ ہاؤز میں گزاری تھی تو دوسرے دن وہیں سے سڑک پر سفر جاری رکھ سکتا تھا۔ کئی میل پیچھے پلٹ کر راستہ کیوں اختیار کیا۔

فریدی اُس راستے کو نظرانداز کرکے سڑک ہی پر کار ڈرائیو کرتا ہوا ریگم بالا کے ریسٹ ہاؤز تک جاپہنچا۔ وہاں سناٹا نظر آیا۔ کمپاؤنڈ میں کوئی گاڑی بھی موجود نہیں تھی۔ برآمدے میں پہنچ کر اُس نے محافظ کو آوازیں دیں۔

اُس نے ایک کمرے سے برآمد ہوکر کہا۔ ''سٹنگ روم کھلا ہوا ہے جناب۔ میں گاڑی سے سامان اُتارتا ہوں۔''

اُسکے چہرے سے نقاہت ظاہر ہو رہی تھی اور آواز میں کراہنے کا سا انداز پایا جاتا تھا۔

''نہیں! اس کی ضرورت نہیں۔ میں قیام نہیں کروں گا۔ تھوڑی سی پوچھ گچھ کرنی ہے۔ آؤ سٹنگ روم ہی میں چلیں۔''

''ج......جی بہت اچھا۔'' اُس کے لہجے میں حیرت تھی۔

دونوں سٹنگ روم میں آئے اور فریدی نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ ''بیٹھ جاؤ۔''

''نہیں صاحب! ٹھیک ہے۔''

''بیٹھ جاؤ۔ تم کچھ بیمار بیمار سے لگ رہے ہو۔''

''جی ہاں......!'' وہ کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔ ''کئی دن سے سرِشام بہت تیز بخار ہوجاتا ہے۔ رات بھر بھنتا رہتا ہو......صبح نو بجے تک اُتر جاتا ہے۔''

''کوئی دوا وغیرہ۔''

''جوشاندہ......صاحب۔''

''نہیں......اس سے کام نہیں چلے گا۔ میں تمہیں دوا دوں گا۔ ہفتے کی شام کو یہاں دو آدمی آئے تھے۔ اُن میں سے ایک بہت لمبا چوڑا تھا۔''

''ہفتے کی شام کو'' وہ کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ''جب تک میں ٹھیک تھا اُس وقت تک تو کوئی

بہت لمبا چوڑا آدمی نہیں آیا تھا......سردی لگنی شروع ہوئی ہی تھی کہ خان عظمت کے گھرانے کے کچھ لوگ آئے تھے۔ آپ جانتے ہوں گے خان اعظم کے چھوٹے بھائی کو۔''

''میں جانتا ہوں۔''

''میں نے کنجیاں اُن کے حوالے کی تھیں اور معذرت کرکے اپنی کوٹھری میں چلا گیا تھا۔ پھر مجھے ہوش نہیں۔ اُس کے بعد اگر کوئی آیا ہو تو میں نہیں جانتا۔''

''دوسری صبح تو......تم نے انہیں رخصت کیا ہوگا۔''

''نہیں جناب! نو بجے آنکھ کھلی تھی تو کنجیاں سرہانے رکھی پائی تھیں اور وہ لوگ جاچکے تھے۔ ریسٹ ہاؤز میں کوئی بھی نہیں تھا۔''

''سنا ہے اُس شام بہت تیز بارش ہوئی تھی۔''

''جی ہاں......کچھ یاد پڑتا ہے......وہ لوگ بارش ہی کے آثار دیکھ کر یہاں رکے تھے ورنہ نکلے چلے جاتے۔''

''وہ کتنے آدمی تھے؟''

''شائد تین......خانم تھیں، اُن کا بیٹا اور بیٹی۔''

''ہوسکتا ہے وہ دونوں بعد میں آئے ہوں۔ تمہیں خبر ہی نہ ہو۔''

''ہوسکتا ہے جناب عالی۔''

''تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔''

''نہیں جناب۔ اُس دن مالی بھی نہیں تھا۔ اپنے گھر چلا گیا تھا۔ اُس کی بیوی بیمار ہے۔''

''اچھا تو گاڑی تک چلو......میں تمہیں دوا دے دوں۔ دن میں تین بار ایک ایک ٹکیہ لیتے رہنا۔ ٹھیک ہوجاؤ گے۔''

''خدا خوش رکھے جناب۔ ذرا دیر نہیں ٹھہریں گے کہ میں آپ کیلئے چائے بنادوں۔''

''نہیں شکریہ۔ پھر کبھی......!'' وہ اُس کا شانہ تھپک کر بولا۔

''کیا کوئی کھوگیا ہے جناب۔''

''ہاں......وہ دونوں ہفتے کو ادھر ہی آئے تھے اس کے بعد سے ان کا کوئی پتہ نہیں۔''

''خدا کرے مل جائیں۔''

وہ فریدی کے ساتھ گاڑی تک آیا تھا اور فریدی نے ڈکے کھول کر فرسٹ ایڈ باکس نکالا تھا اور ایک شیشی اُسے پکڑا دی تھی۔ پھر پرس سے دس دس کے تین نوٹ کھینچے تھے اور اُسے دیتا ہوا بولا۔ ''اس دوا کے ساتھ دودھ ضرور استعمال کرتے رہنا۔''

''اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔''

فریدی گاڑی میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ اُس کی نظر برآمدے کے نیچے کیچڑ کے ایک ڈھیر پر پڑی اور پھر وہاں کوئی ایسی ہی چیز دکھائی دی تھی کہ وہ پھر گاڑی سے اُتر آیا تھا۔

محافظ بھی اُسی طرف متوجہ ہوگیا کیونکہ فریدی کیچڑ کے ڈھیر کی طرف بڑھ گیا تھا۔

پہلے اُس نے جوتے کی ٹو سے سیاہ رنگ کے چڑے کے اُس تسمے کو چھوا تھا جو کیچڑ کے ڈھیر پر اُبھرا ہوا نظر آیا تھا۔ پھر جھک کر اُسے نکال لینے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ محافظ بھی پاس آ کھڑا ہوا لیکن خاموشی سے دیکھتا رہا۔

تسمے کے دوسرے سرے پر کیچڑ سے لتھڑی ہوئی جو چیز نظر آئی تھی وہ ایک ٹیپ ریکارڈر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔

''پتا نہیں کس کا گر گیا ہے۔'' محافظ بڑبڑایا۔

''ذرا دوڑ کر کسی برتن میں پانی تو لاؤ۔'' فریدی نے اُس سے کہا اور وہ وہاں سے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ٹیپ ریکارڈر دھل دھلا کر اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔

''کیا خیال ہے۔ یہ بارش ہی والی رات کو یہاں گرا ہوگا اور اس کا مالک اندھیرے کی وجہ سے اسے تلاش نہ کرسکا ہوگا۔'' فریدی نے محافظ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''خدا ہی جانے۔''

''یہی بات ہوسکتی ہے۔ ورنہ وہ اسے چھوڑ نہ جاتا۔'' فریدی نے اُس کا سوئچ آن کرتے ہوئے کہا۔ خلاف توقع سیل ضائع نہیں ہوئے تھے۔ کیونکہ کیسٹ گھومنے لگا تھا۔

پہلے تو محافظ کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی تھی۔ پھر وہ ہنس پڑا تھا۔ کیونکہ ٹیپ ریکارڈر سے کسی بلی کے مسلسل ''میاؤں، میاؤں'' کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

فریدی نے کیسٹ کو ریوائنڈ کیا اور پھر سننے لگا۔ بہرحال پورے کیسٹ میں صرف بلی ہی کی آواز بھری ہوئی تھی۔

''اچھی بات ہے...... میں اسے لے جا رہا ہوں۔'' اُس نے محافظ سے کہا۔ ''ممکن ہے یہ عظمت محل ہی والوں کا ہو۔ میں اُدھر ہی جا رہا ہوں۔''

''جیسی مرضی جناب کی۔''

پھر فریدی وادی سرخاب کی طرف روانہ ہوگیا تھا۔ ایک جگہ گاڑی روک کر اُس نے ٹیپ ریکارڈر اٹھایا اور کیسٹ نکال کر اُسے بغور دیکھنے لگا۔ پھر الٹ کر ٹیپ ریکارڈر میں لگایا اور سوئچ آن کر دیا۔ اس طرف مختلف فلموں کے گانے ریکارڈ کئے ہوئے تھے۔

اُس نے طویل سانس لی تھی اور سوئچ آف کر کے دوبارہ گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد وہ سرخاب ویلی میں داخل ہوا اور سیدھا عظمت محل کی طرف نکلا چلا گیا۔

پھاٹک پر چوکیدار نے اُس کا نام معلوم کیا تھا اور فون پر اُس کی آمد کی اطلاع کسی اور کو دی تھی۔ پھر تھوڑی دیر بعد فریدی سے بولا تھا۔ ''آپ اندر تشریف لے جاسکتے ہیں جناب۔''

اس کا استقبال ''دیوان خانے'' میں کیا گیا تھا۔ خود خانم موجود تھیں۔ ناصر اور شاہدہ تو بچھے جا رہے تھے۔

رسمی باتوں کے بعد دفعتاً خانم نے لہجہ کسی قدر بگاڑ کر کہا۔ ''اگر پرانے خاندانی تعلقات مدنظر نہ ہوتے تو میں ملنے سے انکار کر دیتی۔''

''مجھ سے کون سا قصور سرزد ہوا ہے۔'' فریدی مسکرا کر بولا۔

''میں نے تمہارے اسسٹنٹ کیپٹن حمید سے صاف کہہ دیا تھا کہ ہمارے نجی معاملات میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کی جائے گی۔''

''تو وہ اُس رات ریسٹ ہاؤز ہی میں تھا۔''

''ہاں وہیں تھا۔''

''تو پھر مجھے قطعی علم نہیں کہ اُس نے آپ کے کس نجی معاملے میں دخل اندازی کی تھی۔ کیونکہ میں خود اُس کی تلاش میں ہوں۔''

''میں انہیں اپنے ساتھ لانا چاہتا تھا۔'' ناصر بول پڑا۔ ''لیکن شائد انہوں نے کسی وجہ سے ڈیرہ غزن خان والے راستے کو ترجیح دی تھی۔''

فریدی نے ٹیپ ریکارڈر کو زانو پر رکھ لیا تھا۔ لیکن کسی نے اُس کی طرف توجہ تک نہ

دی۔ اُس نے کچھ دیر خاموش رہ کر کہا۔

''کیپٹن حمید اپنے دوست سمیت لاپتہ ہوگیا ہے۔ اُن کی جیپ ڈیرہ غزن کے نواح میں ملی ہے۔ پچھلا ٹائر فلیٹ ہوگیا تھا اور اُس کے اندر سے رائفل کی گولی ملی ہے۔''

وہ تینوں حیرت سے اُسے دیکھے جارہے تھے۔

''میں نہیں سمجھ سکتا کہ آخر اُس نے ڈیرہ غزن والا راستہ کیوں اختیار کیا۔''

''ہم نے انہیں مجبور کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہمارے ساتھ آئیں اور محل ہی میں قیام کریں۔'' شاہدہ بولی۔

''کیا آپ بتاسکیں گے کہ اُس نے وہ راستہ کیوں اختیار کیا تھا۔'' فریدی نے ناصر سے پوچھا۔

''نہیں...... اس کا ذکر ہی نہیں آیا۔ ہم اُن سے پہلے ہی روانہ ہوگئے تھے۔ ویسے انہوں نے یہ ضرور کہا تھا کہ وہ شارٹ کٹ اختیار کریں گے جو ڈیرہ غزن کے راستے کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔''

''ٹائر میں رائفل کی گولی......!'' خانم کچھ کہتے کہتے رک گئیں پھر بولیں۔ ''کئی رہزنوں کی خبریں بھی اس دوران میں ملی ہیں۔''

''رہزن مال لے جاتے ہیں۔ اُن دونوں کو کیوں لے جانے لگے۔''

کوئی کچھ نہ بولا۔

تھوڑی دیر بعد فریدی نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''خیر...... اتنا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے وہ رات ریسٹ ہاؤز میں ہی گزاری تھی۔ اُوہ...... یہ تو بھول ہی گیا۔''

اُس نے خاموش ہوکر ناصر کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔ ''کیا آپ لوگ اپنی کوئی چیز ریسٹ ہاؤز میں بھول آئے تھے۔''

''نہیں تو [illegible]''

''یادداشت [illegible] دیجیے۔'' فریدی نے ٹیپ ریکارڈر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''نہیں [illegible] چیز نہیں۔''

''یہ ٹیپ [illegible] مجھے کمپاؤنڈ میں کیچڑ کے ڈھیر میں دبا ہوا ملا تھا۔ میں نے سوچا

شائد آپ ہی کا ہو۔''

دفعتاً ناصر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں اور وہ ہکلایا تھا۔ ''جج...... جی ہاں...... شش شائد میرا ہی ہے۔''

''کیا آپ کو بلی کی آواز بہت پسند ہے۔''

''کیا مطلب......؟'' خانم تڑک کر بولیں۔

''کیسٹ میں ایک طرف صرف بلی کی آواز بھری ہوئی ہے۔''

ان الفاظ کا ردِعمل فریدی کو بڑا عجیب لگا۔ خانم کا منہ پہلے تو حیرت سے کھلا تھا پھر انہوں نے قہر آلود نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا تھا اور بیٹے کا یہ عالم تھا جیسے اب بیہوش ہی ہوجائے گا۔ شاہدہ اٹھی تھی اور کچھ کہے سنے بغیر وہاں سے چلی گئی تھی۔

''ممی......!'' ناصر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''کسی نتیجے پر پہنچنے میں جلدی نہ کیجئے گا۔''

''میں معافی چاہتی ہوں کمال میاں۔'' خانم نے کہا تھا اور وہ بھی اٹھی تھیں اور دیوان خانے سے چلی گئی تھیں۔

فریدی خاموش بیٹھا جواب طلب نظروں سے ناصر کی طرف دیکھتا رہا۔

''یہ ہماری بدنصیبوں کی کہانی ہے کرنل صاحب۔'' ناصر بالآخر بولا۔ ''ممی نہیں چاہتیں کہ بات گھر سے باہر نکلے اور میں نہیں جانتا کہ اب وہ میرا کیا حشر کریں گی۔ مجھے یقین ہے کہ کیپٹن حمید کو ضرور کوئی حادثہ پیش آیا ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے ہماری مدد کرنے کی کوشش کی تھی۔''

وہ خاموش ہوگیا اور فریدی سگار کا گوشہ توڑنے لگا۔ اُس نے سگار سلگایا تھا اور نظریں ناصر کے چہرے پر جمادی تھیں۔

''کیپٹن حمید زخمی بھی ہوگئے تھے۔'' ناصر رک رک کر بولا۔

''ناصر میاں! اب اس سسپنس کو ختم کرو۔'' فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔ حمید کے زخمی ہوجانے کی اطلاع پر اُس نے کسی قسم کے اضطراب کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔'' ناصر بولا۔

''کہیں سے بھی شروع کردو۔ میں کڑیاں ملالوں گا۔''

''شاہدہ ایک عجیب وغریب مرض میں مبتلا ہوگئی ہے۔ ممی اُس کی پبلسٹی نہیں چاہتیں۔ وہ

ایک دلیر لڑکی ہے۔خوف اور دہشت نام کے الفاظ اُس کی ڈکشنری ہی میں نہیں ہیں۔لیکن پچھلے دو ماہ سے اُس کا یہ عالم ہے کہ جہاں اُس نے کوئی بلی دیکھی یا بلی کی آواز سنی۔ چیخ مار کر بیہوش ہو جاتی ہے۔ اس ٹیپ ریکارڈر کی بناء پر کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جایئے گا۔ اس کی طرف بھی آ رہا ہوں۔ بہر حال میں نے ممی سے کہا تھا کہ شاہدہ کو کسی ماہر نفسیات کے پاس لے جاؤں۔لیکن انہوں نے سختی سے اس کی مخالفت کی۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح بات پھیل جائے گی اور شاہدہ کا رشتہ ملنے میں دشواری ہو گی۔''

''ہاں......ایسا بھی ہوتا ہے۔اُن کا خیال درست ہے۔'' فریدی سر ہلا کر بولا۔

''لیکن میری نظروں میں انسانی زندگی زیادہ اہم ہے اور بقیہ چیزوں کو ثانوی حقیقت دیتا ہوں۔ میں نے اُن کی لاعلمی میں یہاں کے سب سے بڑے سائیکیٹرسٹ ڈاکٹر نجیب سے رجوع کیا اور اپنی دشواری بھی بتائی۔ ایک طرح سے وہ میرے دوست بھی ہیں۔ انہوں نے کہا فکر نہ کرو کوئی ایسی تدبیر کر لی جائے گی کہ میں مریضہ کو دورے کی حالت میں اس طرح دیکھ سکوں کہ ممی کو اس کا علم نہ ہونے پائے۔ یہ ٹیپ ریکارڈر ڈاکٹر نجیب ہی کا ہے۔ بہر حال اُن کے مشورہ سے میں نے ایک اسکیم بنائی۔ ممی اور شاہدہ کو کریم آباد لے گیا۔ اسکیم یہ تھی کہ واپسی کے سفر میں ریگم بالا کے ریسٹ ہاؤز کے قریب گاڑی میں کوئی نقص پیدا کر کے رات ریسٹ ہاؤز ہی میں گزارنے کی تجویز پیش کروں گا اور پھر وہیں ڈاکٹر نجیب چھپ کر بلی کی آواز کا ردعمل شاہدہ پر دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ موسم ہی خراب ہو گیا اور گاڑی میں نقص پیدا کئے بغیر ہی ریسٹ ہاؤز میں قیام کرنے کا موقع نصیب ہو گیا اور اُس وقت ریسٹ ہاؤز بالکل خالی تھا۔ چوکیدار بخار میں پڑا ہوا تھا۔ اُس نے کنجیاں میرے حوالے کر دی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد حمید صاحب اور اُن کے دوست بھی آ گئے تھے۔''

''اور اُن دونوں کے آ جانے کی بناء پر ڈاکٹر نجیب تجربہ نہ کر سکے ہوں گے۔''

''نہیں جناب......تجربہ ہوا تھا اور کیپٹن حمید بلی کو بھگا دینے کے لئے باہر گئے تھے اور انہوں نے غالباً ڈاکٹر نجیب کو بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ بہر حال وہ بات تو وہیں ختم ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نجیب اُن کے ہاتھ نہیں آ سکے تھے لیکن شائد ٹیپ ریکارڈر اُن کے ہاتھ سے چھوٹ کر کیچڑ میں گر گیا تھا۔''

''کیا اسی بھاگ دوڑ میں حمید زخمی ہوا تھا۔''

''جی ہاں......!'' ناصر نے کہا۔ لیکن فریدی نے فوراً ہی اُس کی آنکھوں میں ایسے تاثرات دیکھے جن کی بناء پر اُسے اُس کے جواب پر یقین نہ آ سکا۔

''کیا تم کچھ دیر کے لئے میرے ساتھ باہر چل سکو گے۔''

''ج......جی ہاں......کیوں نہیں۔'' ناصر نے کہا اور مڑ کر اُس دروازے کی طرف دیکھنے لگا جس سے اُس کی ماں اور بہن گزر کر اندر گئی تھیں۔

وہ دونوں باہر آئے تھے اور فریدی نے ناصر کے لئے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا تھا۔

''میں اپنی گاڑی سے نہ چلوں۔'' ناصر نے کہا۔

''نہیں......میں واپس پہنچا دوں گا......فکر نہ کرو۔''

گاڑی پھاٹک سے نکل کر سڑک پر آئی تھی اور فریدی بولا تھا۔ ''میرے باپ اور تمہارے نانا گہرے دوست تھے۔''

''جی ہاں......ممی نے بتایا تھا مجھے۔''

''اور خان عظمت سے میرے مراسم تھے۔''

''مجھے اس کا بھی علم ہے۔''

''حالانکہ وہ مجھ سے عمر میں بڑے تھے لیکن ہمارے درمیان کوئی تکلف نہیں تھا۔''

ناصر کچھ نہ بولا۔ تھوڑی دیر بعد فریدی نے کہا۔ ''تمہارے خاندان میں یہ دوسرا کیس ہے۔''

''کس کیس کی بات کر رہے ہیں......!'' ناصر بولا۔

''یہی بلی کی آواز سے خوفزدہ ہو جانا۔''

''لیکن مجھے کسی پہلے کیس کا علم نہیں ہے۔''

''وہ بات بھی پھیلنے نہیں دی گئی تھی۔ میرے بچپن کے زمانے کی بات ہے۔ تمہاری ایک پھوپھی روشن زمانی خانم تھیں۔''

''جی ہاں......میں نے اُن کا نام سنا ہے۔ جوانی ہی میں انتقال کر گئی تھیں۔''

''وہ بھی اچانک اسی مرض میں مبتلا ہو گئی تھیں اور پندرہ دن سے زیادہ زندہ نہیں رہی تھیں۔''

''یقین کیجئے......مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ ممی نے بھی کبھی نہیں بتایا۔''

''اُسی دوران میں ایک رات جب وہ سو رہی تھیں باہر بلیوں نے لڑنا شروع کر دیا اور وہ دہشت زدگی ہی کے عالم میں انتقال کر گئیں۔''

''خدا کی پناہ! تب تو شاہدہ بڑے خطرے میں ہے۔''

''خاص طور پر خیال رکھو کہ محل کے آس پاس کوئی بلی نہ پائی جائے۔''

''اب تو میں اس کے لئے الگ سے عملہ رکھوں گا۔''

فریدی نے گاڑی ہوٹل گلریز کے کمپاؤنڈ میں روکی تھی۔

''کافی کی خواہش ہو رہی تھی۔ کیا خیال ہے......؟'' فریدی نے کہا۔

''ضرور......ضرور...... چلئے۔''

وہ ڈائننگ ہال میں آئے تھے۔ فریدی نے ایک دور افتادہ میز منتخب کی۔

کافی کا آرڈر دینے کے بعد وہ ناصر کو بغور دیکھتا ہوا بولا۔ ''بسا اوقات آدمی کو وہ بھی کرنا پڑتا ہے جسے وہ قطعی پسند نہیں کرتا۔''

''جی ہاں......!'' ناصر یونہی رواروی میں بولا۔ پھر اُس نے غور سے فریدی کی طرف دیکھا تھا۔ لیکن فریدی اب اپنے جوتے کی ٹو پر نظر جمائے ہوا تھا۔

''مم......میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟''

''تمہیں اُس وقت ریسٹ ہاؤز میں اُن دونوں کی آمد ضرور ناگوار گزری ہوگی۔''

''کسی قدر......!'' ناصر مسکرایا۔

''کتنے نروس ہو گئے ہو گے اُس وقت جب حمید بلی کو بھگانے کے لئے دوڑا ہوگا۔''

''قدرتی بات ہے۔''

''باہر گہرا اندھیرا ہوگا۔''

''ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا تھا۔''

''کیا تم اسے پسند کرتے کہ حمید ڈاکٹر نجیب کو پکڑ لیتا۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

اتنے میں کافی آ گئی اور فریدی نے موضوع گفتگو بدل دیا۔ مختلف ممالک کی کافی پر بات ہونے لگی تھی۔ دونوں کافی کی چسکیاں لیتے رہے۔ دفعتاً فریدی نے پوچھا۔ ''حمید کے کہاں چوٹ آئی تھی۔''

''سر پر......!'' ناصر بولا۔

''ہوں......!'' فریدی طویل سانس لے کر ناصر کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

''اندھیرے میں جہاں ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا ہو کام بھی بن جاتا ہے اور بعد میں بات بھی بنائی جاسکتی ہے۔''

''میں نہیں سمجھا......آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''جب وہ بلی کو بھگانے برآمدے میں آیا تھا تو تم بھی اُس کے ساتھ رہے ہو گے۔''

''میں بعد میں پہنچا تھا۔''

''اور اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر اُس کے سر پر ضرب لگائی تھی کہ وہ ڈاکٹر نجیب کے پیچھے نہ جاسکے۔''

''یہ بہتان ہے۔'' ناصر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' فریدی آہستہ سے بولا۔

وہ بُرا سا منہ بنائے ہوئے بیٹھ گیا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''میں تمہیں الزام نہیں دیتا۔'' فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ بسا اوقات آدمی کو وہ کچھ کرنا پڑتا ہے جسے وہ قطعی پسند نہیں کرتا۔''

''قسم ہے خدائے لم یزل کی۔ میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔''

''مجھے یقین آ گیا۔'' فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا۔

''لیکن اب مجھے سچی بات بتانی ہی پڑے گی۔ خواہ ممی میری گردن ہی کیوں نہ اڑا دیں۔'' ناصر نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''میں بھی یہی چاہتا ہوں......اور ممی کے عتاب سے بچانے کا ذمہ بھی لے سکتا ہوں۔'' فریدی نے کہا۔

ناصر تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولا۔ ''وہ چاہتی ہیں کہ خاندانی جھگڑے باہر نہ جائیں۔ لیکن جب دوسرے بلاوجہ کمینگی پر آمادہ ہوں تو میں تو اسے بزدلی ہی سمجھوں گا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیا جائے۔''

"یقیناً ایسا ہی ہونا چاہیئے۔"

"ایک طرف میں نے شاہدہ کے سلسلے میں اسکیم بنائی تھی اور دوسری طرف کوئی ہمیں خوفزدہ کرنے کیلئے کریم آباد ہی سے ہمارے پیچھے لگ گیا۔ کھانے کی باسکٹ میں اُس نے بڑا سا کالا سانپ رکھ دیا تھا۔ لہٰذا جب ہم کھانے کیلئے بیٹھے اور جیسے ہی باسکٹ کھولی وہ پھن اٹھا کر کھڑا ہوگیا۔ اگر حمید صاحب نہ ہوتے تو پتا نہیں کیا ہوتا۔ انہوں نے اُسے قابو میں کر کے پھر باسکٹ میں بند کردیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ زہر کی تھیلی نکال لی گئی ہے۔ سانپ بے ضرر ہے۔"

فریدی بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ ناصر کہتا رہا۔ "اُس کے بعد میں حمید صاحب کے ساتھ گاڑی سے دوسری باسکٹ نکال لانے کے لئے باہر نکلا تھا۔ حمید صاحب کسی سے ٹکرائے تھے اور اُسے پکڑ لیا تھا۔ اندھیرے ہی میں ہاتھا پائی ہونے لگی تھی۔ پھر وہ اُن کی گرفت سے نکل گیا تھا اور وہ اُس کے پیچھے دوڑے گئے تھے۔ میں پسٹل لینے کے لئے پھر کمرے میں پلٹ آیا۔ واپسی میں قاسم صاحب بھی میرے ساتھ تھے۔ ہم نے حمید صاحب کو آوازیں بھی دیں لیکن اُن کا کہیں پتا نہ تھا۔ پھر ہم پھاٹک کی طرف بڑھے۔ پھاٹک کے باہر حمید صاحب بیہوش پڑے ملے۔ ان کے سر کے پچھلے حصے سے خون بہہ رہا تھا۔ لیکن دور دور تک اور کوئی نظر نہ آیا۔ حمید صاحب نے شائد ایک فائر بھی کیا تھا۔

"تو تم اسے جانتے ہو جو تم لوگوں کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"پہلے تو تاریکی ہی میں تھا لیکن جب وہ جوتا سامنے آیا...... دراصل جس آدمی سے حمید صاحب کا ٹکراؤ ہوا تھا وہ اُس جوتے ہی کو وہاں چھوڑ جانے کے لئے آیا تھا۔"

فریدی کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں اور پھر وہ چونک کر بولا۔ "اُوہ تو یہ بات ہے۔ اس لئے تمہاری ممی نے کہا تھا کہ وہ اپنے نجی معاملات میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کرتیں۔"

"اُوہ...... آپ جانتے ہیں۔"

"ہاں...... مجھے علم ہے۔ یہ روایت تمہارے پردادا کے دور سے چلی آ رہی ہے۔ وہ جس سے بھی ناراض ہوتے تھے اُسے اپنا جوتا بھجوا دیتے تھے۔ جس کا یہ مطلب ہوتا تھا کہ اب اس کی خیر نہیں۔ لیکن تمہارے دادا بہت نیک آدمی تھے...... اُن کا زمانہ امن اور آشتی کا زمانہ تھا۔ ویسے تمہارے پردادا نے بھی کبھی خاندان کے کسی فرد کے لئے جوتا نہیں بھجوایا تھا۔ کیا میں

یہ سمجھ لوں کہ خانِ اعظم اُن سے بھی آگے نکل جانے کی سوچ رہے ہیں۔"

"ممی مجھے یہ بھی نہیں بتاتیں کہ جھگڑا کیا ہے؟"

"وہ نہیں بتائیں گی...... خان شہباز جیسے غیور آدمی کی بیٹی ہیں۔"

"میں تو تصور بھی نہیں کرسکتا کہ خان بابا اس طرح ہمارے دشمن ہوجائیں گے۔ ابھی دو ماہ قبل کی بات ہے کہ شاہدہ اُنکے پاس اُن کے دیہی محل میں قریباً پندرہ دن مقیم رہی تھی۔"

"اچھا......!" فریدی کے لہجے میں حیرت تھی۔ "ذرا یہ تو بتاؤ کہ شاہدہ کے اس ذہنی مرض کی ابتداء وہاں جانے سے قبل ہوئی تھی یا واپسی پر۔"

"شائد واپسی پر...... شائد نہیں بلکہ یقینی طور پر...... آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔"

"یونہی...... بر سبیل تذکرہ...... اچھا ناصر میاں...... اب تم اپنی ممی سے کہہ سکتے ہو کہ تم نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔ اب یہ براہِ راست میرا اور خان اعظم کا معاملہ ہے۔ اُن کے علاقے میں وہ دونوں غائب ہوئے ہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ انہیں کیپٹن حمید کی دخل اندازی گراں گزری ہوگی۔"

"میں دیکھوں گا...... اچھا چلو اب میں تمہیں محل چھوڑ آؤں۔"

"مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ میں خود ہی چلا جاؤں گا۔ یہیں سے فون کر کے گاڑی منگوائے لیتا ہوں۔"

وہ عورت

اُس عمارت کے طول و عرض کا اندازہ انہیں کیونکر ہوسکتا تھا جبکہ ایک دالان سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتے تھے۔ بڑھ یوں نہیں سکے تھے کہ انہیں اُسی دالان کے دو ستونوں سے باندھ دیا گیا تھا اور ہوش میں آنے کے بعد انہوں نے خود کو اُسی حالت میں پایا تھا۔

دالان کے آگے صحن تھا جس کے فرش پر پتا نہیں کب سے کبوتروں کی بیٹ جمتی آئی

تھی۔ صحن کے دوسرے سرے پر جس چیز سے قاسم کو دلچسپی ہوسکتی تھی وہ باورچی خانہ تھا۔ بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو فضا میں چکرا رہی تھی اور اُسے چکر پر چکر آ رہے تھے۔

سورج غروب ہونے والا تھا اور عمارت کے کسی حصے میں بسیرا لینے والی ابابیلیں شور مچا رہی تھیں۔ دفعتاً باورچی خانے کے دروازے میں ایک خاصی لمبی تڑنگی اور جسیم عورت کھڑی دکھائی دی۔ رنگت سرخ و سپید تھی۔ لباس میلا کچیلا اور عمر تیس کے قریب رہی ہوگی۔

قاسم پہلے تو اُسے دیکھتا رہا پھر حمید کی طرف دیکھ کر منہ چلانے لگا۔

"تلی ہوئی کیسی رہے گی۔" حمید نے مسکرا کر پوچھا۔

"تمہاری تو اب آواز بھی زہر لگ رہی ہے کھاموش رہو۔" قاسم غرایا۔

عورت انہیں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر سامنے سے ہٹ گئی۔

"دیکھا سالے...... بول کر کباڑا کر دیا تم نے۔" قاسم نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"برادران لا سے پھر سالے پر آ گئے۔"

"ایق بات بتاؤ......!" قاسم سنی ان سنی کر کے بولا۔

"ضرور بتاؤں گا۔"

"تم پیدا قیوں ہوغئے تھے...... اور اگر ہوئے تھے تو قیا اسی شہر میں آ مرنا جروری تھا جس میں میں رہتا تھا۔"

"بیکار پریشان ہو رہے ہو اس بار تمہاری تقدیر کھل گئی ہے۔"

"قیا مطلب......؟"

"ادھر اسی طرح شادیاں ہوتی ہیں۔"

"اے جاؤ...... قسی اور کو اُلو بنانا۔"

"ابھی تم دیکھ ہی لو گے...... وہ لوگ قاضی سمیت آئیں گے اور لڑکی تم دیکھ ہی چکے ہو۔"

"قب دیخی...... کہاں دیخی......؟"

"وہ جو ابھی سامنے کھڑی تھی۔"

"اور تمہاری والی۔"

"مجھے تو شہ بالا بنائیں گے دم میں نمدہ دے کر۔"

"یار ٹھیک بتاؤ۔!" قاسم کی باچھیں کھلنے لگیں۔

"بس دیکھ لینا۔"

"تو پھر پٹائی کیوں کی تھی۔"

"رسم ہے ادھر کی تا کہ تم انکار ہی نہ کر سکو۔"

"والد صاحب کو معلوم ہو گیا تو۔"

"وہ بھی دوڑے آئیں گے...... رنڈوے ہی تو ہیں۔"

"ابے جبان سنبھال کے...... تم خود ہوگے رنڈوے۔"

"ابھی میری بیوی کہاں مری ہے۔"

"وہ تو سالی پیدا ہی نہیں ہو سکے گی۔" قاسم نے کہا اور پھر یک بیک سنبھل کر بولا۔

"کہاں کی فضول باتیں نکال لیں۔ یار کیا واقعی تم سچ کہہ رہے ہو۔ میں نے سنا ہے افریقہ میں بھی ایسی ایک قوم پائی جاتی ہے جو مار مار کر شادی کر دیتی ہے۔"

"تم نے ٹھیک سنا ہے۔"

"تو پھر اب مجھے قیا قرنا چاہیئے۔"

"ابھی لوگ آئیں گے اور ہمارے بارے میں پوچھ گچھ کریں گے تم مت پٹر پٹر بولنے لگنا۔ میں بات کروں گا۔"

"اچھی بات ہے۔" قاسم سر ہلا کر بولا۔

اور پھر سچ مچ تھوڑی دیر بعد قدموں کی چاپ سنائی دی تھی اور انہی میں سے تین آدمی سامنے آ کھڑے ہوئے تھے جنہوں نے اس حال کو پہنچایا تھا۔ اُن کے چہرے اب بھی ڈھکے ہوئے تھے۔ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔

"نذر گل سے کیا باتیں ہوئی تھیں......؟" اُن میں سے ایک غرایا...... جس کے ہاتھ میں چمڑے کا چابک تھا۔

"ارے پھر وہی نذر گل کا قصہ...... ہم تو سمجھے تھے بات ختم ہوگئی۔ تو اس طرح ہمیں گھیرا گیا۔" حمید بولا۔

قاسم نے قہر آلود نظروں سے اُسے دیکھا تھا اور سختی سے ہونٹ بھینچ لئے تھے۔

''اگر تم نے کھل کر گفتگو نہ کی تو مار ڈالے جاؤ گے۔'' چابک والے نے کہا۔

''یہ شادی ہو رہی ہے۔'' دفعتاً قاسم پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا اور حمید منہ بنا کر رہ گیا۔

''یہ کیا بک رہا ہے۔''

''ابے جبان سنبھال کر...... ٹھینگے پر گئی شادی وادی۔''

''دیکھو بھائی...... تم لوگ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہو۔ ہم سے سرائے میں کہا گیا تھا کہ ایک زخمی کو جو اپنے ہوش میں نہیں ہے ڈیرہ غزن میں حویلی تک پہنچا دیں۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ اس خدا ترسی کا یہ صلہ ملے گا۔''

''تو وہ راستے میں کہیں ہوش ہی میں نہیں آیا تھا۔''

''ہم نے توجہ نہیں دی تھی۔ اُسے آرام سے پچھلی سیٹ پر لٹا کر کمبل ڈال دیا تھا۔''

''ناممکن ہے کہ تم نے اُس سے اُس حادثے کے متعلق معلوم کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ جبکہ تمہاری جیب میں برآمد ہونے والا شناخت نامہ تمہیں پولیس آفیسر ظاہر کرتا ہے۔''

''ہمیں سرائے ہی میں بتا دیا گیا تھا کہ اُس پر رہزنوں نے حملہ کیا تھا۔ لیکن ٹھہرو۔ یہ معلوم ہو جانے کے باوجود کہ میں ایک پولیس آفیسر ہوں تمہیں اس کی جرأت کیسے ہوئی۔''

اس پر چابک والے نے حقارت آمیز سا قہقہہ لگایا تھا۔

''تم لوگ جوابدہی سے نہیں بچ سکو گے۔ ظاہر ہے کہ تمہارا تعلق خان اعظم کے منیجر ہی سے ہوسکتا ہے۔''

''اسی لئے ہم تم دونوں کو دفن کر دیں گے۔''

قاسم آپے سے باہر ہو جانے ہی والا تھا کہ حمید بول پڑا۔ ''تم خاموش رہو۔''

''نہیں کھاموش رہوں گا...... تم نے یہ قیوں قہا تھا کہ شادی کا انتظام ہو رہا ہے۔''

''یہ آخر کیا کہہ رہا ہے۔'' چابک والے نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''کچھ نہیں...... ہر وقت شادی کے خواب دیکھتا رہتا ہے۔ چاہے گردن پر بندوق کی نال ہی کیوں نہ رکھی ہوئی ہو۔''

''تم دغا باز ہو۔'' قاسم زور سے دہاڑا۔

وہ تینوں خاموشی سے اُسے دیکھتے رہے تھے پھر چابک والے نے دونوں آدمیوں کو کچھ

اشارہ کیا تھا اور وہ آگے بڑھ کر قاسم کو ستون سے کھولنے لگے تھے۔

اُس کے بعد دو رائفلوں کی نالیں اُس کے دونوں پہلوؤں سے لگا دی گئیں تھیں اور وہ قاسم کو دالان سے ہٹا کر ایک کمرے میں لائے تھے۔

''تم تو بہت اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو۔'' چابک والے نے اُس سے کہا۔

''اور نہیں تو کیا لوفر ہوں۔'' قاسم پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔

''سرائے میں سات آٹھ سیر تکے کھا گئے تھے۔''

''اور اب پھر بھوخ لگ رہی ہے۔''

''دس سیر بھنا ہوا گوشت تمہارے لئے تیار ہے۔''

''میں نہیں خاؤں غا۔''

''ایسی بھی کیا ناراضگی۔''

''اُسے بھی کھولو۔''

''اُس کی بات نہ کرو۔ اُسی کی وجہ سے شائد تمہاری بھی جان جائے۔ کیونکہ وہ سچ نہیں بول رہا۔''

''وہ سچ بول رہا ہے۔ ہماری اُس زخمی سے قوئی بات نہیں ہوئی تھی۔''

''یہ تو سنا ہی ہوگا کہ وہ کیا بڑبڑا رہا تھا بیہوشی میں۔''

''میں نے نہیں سنا تھا۔ یہ سالا راستہ ایسا ہے کہ کھایا پیا حلق مین چلا آ رہا تھا۔''

''وہ گاڑی کریم آباد کے کسی پولیس آفیسر کی تھی۔''

''ڈی ایس پی سٹی قی تھی۔''

''اپنے ساتھی کو سمجھاؤ...... اگر اُس نے اپنی زبان نہ کھولی تو ہم سچ مچ اُسے مار ڈالیں گے۔''

''خدائی فوجدار ہو تم۔'' قاسم آنکھیں نکال کر دھاڑا۔ ''اُس کا آج تک قوئی قچھ نہیں بگاڑ سکا۔ میں نے بھی بہت بڑے بڑے معاملے دیکھے ہیں۔ تم کیا چیز ہو۔''

''کیا کھانا نہیں کھاؤ گے۔''

''مر بھی جاؤں تب بھی نہیں خاؤں غا۔''

''صرف رات بھر کی مہلت دی جاتی ہے۔ اُسے سمجھاؤ۔'' کہہ کر اُس نے پھر اپنے

ساتھیوں کو اشارہ کیا تھا اور وہ پہلے ہی کی طرح اُس کے پہلوؤں سے رائفلیں لگا کر اُسے دالان میں لائے تھے اور دوبارہ ستون سے جکڑ دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں پھر تنہا رہ گئے۔ قاسم آہستہ آہستہ وہ سب کچھ دہرانے لگا جو کمرے میں اُس پر گزری تھی۔

"دیکھو بیٹا......!" حمید آہستہ سے بولا۔ "ریسٹ ہاؤز میں گزرنے والی رات کا ذکر زبان پر نہ آنے پائے ورنہ سچ مچ مارے ہی جائیں گے۔"

"میں نے نام ہی نہیں لیا تھا۔"

"اگر پوچھیں تو کہہ دینا براہِ راست کریم آباد سے آرہے تھے۔"

"اچھی بات ہے......لیکن یہ سالا خان اعظم کون ہے۔"

"انگریزوں کے دور میں سرخاب ویلی پر اُسی کی حکومت تھی۔ قومی حکومت نے بھی کچھ چھوٹ دے رکھی ہے۔ بہرحال ان کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ جیپ ڈی ایس پی کو مل گئی ہے۔ لہٰذا ہمیں مطمئن رہنا چاہئے۔"

"لیکن وہ سالا تو رات بھر کی مہلت دے گیا ہے۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔"

"سالے کھانے کو کہہ رہے تھے۔ میں نے انکار کردیا۔"

"کیوں؟ زبردست غلطی سرزد ہوئی ہے تم سے۔ اتنے فاصلے پر ہو کہ مجھے بھی نہیں کھا سکو گے۔"

"تمہیں مارنے کو قہہ رہے تھے اور مجھے کھانا کھلانے کو کہہ رہے تھے۔ قیسے مان لیتا۔ قہہ رہے تھے دس سیر بھنا ہوا گوشت۔"

"تو بیٹا اب رات کیسے کٹے گی۔"

"اللہ مالک ہے...... یہ تو نہیں ہوسکتا کہ تم بندھے کھڑے رہو اور میں بیٹھ کر کھانا کھاؤں۔"

"تمہارا بھوک سے بلکنا بھی تو مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔"

"دیکھا جائے غا...... کھاموش رہو...... مجھے سوچنے دو۔"

حمید نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا تھا۔ یعنی اب آپ بھی سوچنے لگے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد قاسم نے پوچھا۔ "کیا واقعی تم نے اُس زخمی کی کوئی بات نہیں سنی تھی۔"

"قطعی نہیں...... کہو تو قسم کھا جاؤں۔ وہ اس طرح بڑبڑا رہا تھا کہ الفاظ واضح نہیں تھے۔" حمید نے اونچی آواز میں کہا۔ مقصد غالباً یہ تھا کہ اگر کوئی چھپ کر سن رہا ہو تو الفاظ اُس کے کانوں میں پڑ جائیں۔

"مگر اُن سالوں کو یقین نہیں آرہا۔"

"مجبوری ہے۔"

"ابے مجھے تو اس پر حیرت ہے کہ اُن پر تمہارے عہدے قا بھی رُعب نہیں پڑا۔" قاسم بولا۔

"بدنصیب ہیں...... پچھتائیں گے۔"

"ہاں...... تمہیں مار کر تو جرور پچھتائیں گے۔ کیونکہ ابھی تو تمہاری شادی بھی نہیں ہوئی۔" وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر چونک کر بولا۔

"شادی...... اچھا بیٹا اب بتاؤ۔ وہ شادی کی بات......!" قاسم پھر سنک گیا۔

"وہ تو میں تمہارا جی بہلا رہا تھا......!" حمید ہنس کر بولا۔

"اور اب میں تمہارا جی بہلاؤں غا...... پہلے وہ تمہاری ناک کاٹیں گے پھر کان...... پھر ہاتھ پاؤں...... پھر گردن ریت ڈالیں غے۔"

"اور تم دیکھتے رہو گے۔"

"جرور دیکھوں گا...... کیونکہ میں نے آج تک کسی کو اس طرح مرتے نہیں دیکھا۔ ابے پھر قہتا ہوں کچھ نہ کچھ بتا دو اُن لوگوں کو۔"

"کیا بتا دوں......؟"

"کچھ بھی...... یونہی جھوٹ موٹ...... مثلاً وہ زخمی بڑبڑا رہا تھا حنیفہ ڈارلنگ خواہ تمہارے باپ بھائی مجھے مار ہی کیوں نہ ڈالیں میں تم سے محوبت کرتا رہوں غا۔"

"نہیں چلے گی...... یہ کوئی بہت گہرا معاملہ معلوم ہوتا ہے۔"

"تم جانو...... میں نے تو اپنا فرض ادا قر دیا۔"

حمید کچھ نہ بولا۔ گلوخلاصی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ پتا نہیں انہیں کہاں رکھا گیا تھا اور اُسے اچھی طرح علم تھا کہ خان اعظم کے علاقے میں کسی قسم کی تفتیش کرنے سے قبل

پولیس کو خان اعظم سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ لہٰذا کریم آباد کا ڈی ایس پی جیپ مل جانے کے باوجود بھی اس علاقے میں کھل کر تفتیش نہ کرسکا ہوگا اور پھر اُس نے فریدی کو اطلاع دی ہوگی۔

''قیا سوچنے لگے...... بولتے رہو...... میرا دم گھٹ رہا ہے۔'' دفعتاً قاسم بولا۔

''یہی سوچ رہا ہوں کہ میرے بعد تمہارا کیا بنے گا۔''

''قیمہ...... ٹھینگے سے...... دیخا جائے گا۔'' قاسم نے کہا پھر آہستہ سے بولا۔ ''رات ہونے دو...... دیخ لوں غا...... سالوں کو۔''

''کیا دیکھ لوگے۔''

''بس گول رہو...... سب ٹھیک ہے۔''

حمید نے اُسے آنکھ پھاڑ کر دیکھا تھا۔ پتا نہیں دل میں کیا ٹھانی تھی کہیں کوئی حماقت نہ کر بیٹھے۔

''دیکھو مری جان...... ذرا سوچ سمجھ کر...... اسے دھیان میں رکھنا کہ تم دوڑ نہیں سکتے اور گر پڑتے ہو تو پھر سے اٹھا نہیں جاتا۔'' حمید آہستہ آہستہ بولا تھا۔

''ابے ہاں...... یہ تو ہے۔'' قاسم نے مایوسی سے کہا۔

اندھیرا پھیل گیا تھا اور اب انہیں ایک دوسرے کی شکل صاف نظر نہیں آ رہی تھی۔ پورا صحن بھی تاریک پڑا تھا۔ صرف باورچی خانے کی کھڑکی میں مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔

اچانک وہی لحیم شحیم عورت ایک ہاتھ میں لالٹین لئے اور دوسرے پر ایک طشت سنبھالے ہوئے باورچی خانے سے نکلتی دکھائی دی۔ اُن کے قریب پہنچ کر اُس نے لالٹین فرش پر رکھ دی تھی۔ پھر داہنے ہاتھ سے طشت سے ایک بڑی سی چھری نکالی اور اُس کی نوک سے گوشت کا ایک ٹکڑا اٹھا کر قاسم کے منہ کی طرف بڑھا دیا۔

''نہیں......!'' قاسم سر ہلا کر بولا۔ ''میں کافر نہیں ہوں۔ پہلے میرا بھوکا بھائی کھائے غا...... پھر میں خاؤں غا۔''

عورت نے انکار میں سر ہلا کر گوشت کا ٹکڑا اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا لیکن قاسم نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے۔

''کھالو...... تم ہی کھالو...... میری فکر نہ کرو۔!'' حمید بولا۔ ''بعض عورتیں بھی بے رحم ہوتی ہیں۔ ویسے خدا نے تو انہیں ماں ہی بنایا ہے۔''

عورت نے طشت فرش پر رکھ دیا۔ بھنے ہوئے گوشت کے ڈھیر سے بھاپ اٹھ رہی تھی اور اُس کی خوشبو ہر چند کہ قاسم کو پاگل کئے دے رہی تھی لیکن وہ بدستور ہونٹ بھینچے کھڑا رہا۔

عورت کمر پر دونوں ہاتھ رکھے حمید کو گھورے جا رہی تھی۔

''اس طرح کیا دیکھ رہی ہو۔ تم شائد کسی کی ماں نہیں ہو۔'' حمید بولا۔ ''مرد تو کتے ہوتے ہی ہیں لیکن عورت صرف ماں ہے۔ ہر حال میں ماں رہتی ہے۔''

دفعتاً عورت اپنا بایاں پہلو دبائے ہوئے بیٹھ گئی۔ گھٹی گھٹی سی سسکیاں اُس کے بھنچے ہوئے ہونٹوں سے منتشر ہو رہی تھیں۔

''میری بات سے دکھ پہنچا ہو تو معافی چاہتا ہوں۔'' حمید نے نرم لہجے میں کہا۔

وہ کچھ نہ بولی۔ تھوڑی دیر تک اسی طرح سسکتی رہی پھر دوپٹے کے آنچل سے آنسو خشک کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ طشت اٹھایا اور حمید کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

''نہیں......!'' حمید بولا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ تم میری وجہ سے کسی دشواری میں پڑو...... ظاہر ہے کہ مجھے نظر انداز کر دینے میں تم کسی کے حکم کی تعمیل کر رہی تھیں۔''

عورت نے گوشت کا ٹکڑا حمید کے منہ کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ صحن کی بائیں جانب سے کسی کی گرج سنائی دی۔

''یہ کیا کر رہی ہے......؟''

طشت اُس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا اور وہ بوکھلا کر بائیں جانب دیکھنے لگی۔

للکارنے والا روشنی میں آ گیا تھا۔ رائفل اُس کے شانے سے لٹک رہی تھی اور کارتوس کی پیٹی سینے پر آویزاں تھی۔

قریب پہنچتے ہی اُس نے عورت پر ہاتھ چھوڑ دیا۔ بھرپور طمانچہ گال پر پڑا تھا۔

''ابے...... ابے...... یہ قیا......!'' قاسم دھاڑا...... لیکن اُس نے پھر عورت کو مارا۔

''سالے جان سے مار دوں غا...... اگر اب عورت پر ہاتھ اٹھایا۔'' قاسم پھر گرجا۔ پھر شائد اُسی کی دخل اندازی ہی سے مزید مشتعل ہو کر اُس نے عورت کو دونوں ہاتھوں سے پیٹنا

شروع کر دیا تھا۔

"یا اللہ مدد......!" کہہ کر قاسم نے جو زور لگایا تو رسی تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔

دوسرے ہی لمحے میں اُس کے بلوں سے آزاد ہوا تھا۔ اُس آدمی پر جھپٹ پڑا تھا۔ اُسے پکڑا اور سر سے اونچا اٹھا کر فرش پر پٹخ دیا اور پھر ایک ٹھوکر بھی رسید کی۔

وہ دوبارہ نہ اٹھ سکا۔ پتا نہیں مر ہی گیا تھا یا بیہوشی طاری ہوگئی تھی۔

"غضب ہوگیا......!" انہوں نے پہلی بار عورت کی آواز سنی۔

"مجھے کھولو......!" حمید نے قاسم سے کہا اور وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں اُس رسی کی گرہ کھولنے لگا جو حمید کے گرد لپٹی ہوئی تھی۔ عورت قریب ہی کھڑی تھر تھر کانپتی رہی۔ خوفزدہ انداز میں چاروں طرف دیکھے جا رہی تھی۔

حمید نے آزاد ہوتے ہی سب سے پہلے زمین پر پڑے ہوئے آدمی کی رائفل اور کارتوسوں کی پیٹی پر قبضہ کیا تھا۔

"اب تمہاری زندگی بھی شائد خطرے میں ہے۔" حمید نے عورت کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

اُس نے مضطربانہ انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔

"تو پھر یہاں سے نکل چلنے کی سوچو......اور کتنے آدمی ہوں گے آس پاس......!"

لیکن وہ کوئی جواب دیئے بغیر تیزی سے ایک طرف چلی گئی۔

حمید نے لالٹین بجھا دی اور قاسم سے بولا۔ "ادھر ہی ستونوں کی اوٹ میں آجاؤ۔"

"ابے مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔"

"اپنا ہاتھ ادھر لاؤ۔"

لیکن ابھی وہ پوری طرح سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ عورت کی سرگوشی سنائی دی۔

"کہاں ہو تم دونوں۔"

"کیا بات ہے۔" حمید نے پوچھا۔

"میں نے دروازہ بند کر دیا ہے۔"

"میں نے پوچھا تھا اور کتنے آدمی ہیں۔"

"بس یہی تھا......لیکن وہ کسی وقت بھی آسکتے ہیں۔"

"چلو گی ہمارے ساتھ۔"

"ہاں......چلوں گی۔" عورت کے لہجے میں عزم تھا۔

"بس تو پھر ہمیں راستہ دکھاؤ۔"

"لالٹین کہاں ہے۔"

"میں نے بجھا دی ہے۔"

"اچھا ٹھہرو......!" عورت نے کہا تھا اور باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ ذرا دیر بعد واپس آئی۔ ماچس جلا کر لالٹین روشن کی اور اُسے اٹھا کر ایک طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

"میرے پیچھے آؤ۔"

بائیں ہاتھ میں اُس نے ایک جھابی لٹکا رکھی تھی۔ قاسم نے بڑی مشکل سے جھک کر فرش پر گرے ہوئے گوشت کے ٹکڑوں پر جھپٹا مارا تھا اور انہیں منہ میں ٹھونستا ہوا اُس کے پیچھے چلنے لگا تھا۔

نیچے پہنچ کر عورت نے ایک دروازہ کھولا تھا۔ یہ کسی سرنگ کا دہانہ ثابت ہوا اور وہ آگے بڑھتے رہے۔ پھر ایک تنگ سا درہ انہیں کھلی فضا میں لے آیا تھا۔ شفاف آسمان پر تارے پہلے ہی کی طرح چمک رہے تھے۔

عورت نے لالٹین بجھا دی اور آہستہ سے بولی۔ "اللہ کا بھروسہ ہے۔ مگر ہم کہیں بھی چھپ نہ سکیں گے۔"

"یہاں سے جتنی دور لے چل سکتی ہو......لے چلو......سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ایک پولیس آفیسر ہوں۔ ان لوگوں کو دن میں تارے نظر آجائیں گے۔"

عورت کچھ نہ بولی۔ لیکن وہ ایک جانب چل پڑی تھی۔

کرنل فریدی تفتیش کا آغاز کارواں سرائے سے کرنا چاہتا تھا۔ فی الحال گلریز ہی کے ایک کمرے میں مقیم تھا اور ڈیرہ غزن خان کی جانب روانگی کی تیاری کر رہا تھا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ اُس نے ریسیور اٹھایا۔

''ہیڈ کوارٹر سے فاروقی۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''کہئے......کیا بات ہے۔''

''کریم آباد کے ڈی ایس پی ستی یہاں موجود ہیں اور آپ سے فوراً ملنا چاہتے ہیں۔''

''بھیج دیجئے۔'' فریدی نے کہا اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

ڈی ایس پی ستی دس منٹ کے اندر ہی اندر وہاں پہنچ گیا تھا۔

''بات کچھ بن رہی ہے جناب......!'' وہ دبے ہوئے جوش کے ساتھ بولا۔

''کوئی خاص خبر......!''

''کل شام کی ڈاک سے مجھے ایک گم نام خط ملا ہے۔'' اُس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک لفافہ نکال کر فریدی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

خط کسی معمولی پڑھے لکھے ہوئے آدمی کا تحریر کردہ معلوم ہوتا تھا۔ الفاظ شکستہ تھے اور شائد بہت جلدی میں تحریر کئے گئے تھے۔

''جناب عالی کپتان صاحب!

کل آپ سرائے میں پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ وہاں کسی نے بھی آپ کو پوری بات نہیں بتائی۔ کیونکہ میر سرائے نے سب کو منا (منع) کر دیا تھا۔ اب مجھ سے سنئے! وہ دونوں آئے تھے اور اُن سے کہا گیا تھا کہ وہ ایک زخمی کو جو خان کا سپاہی ہے ڈیرہ پہنچا دیں۔ سپاہی کی گاڑی میں کوئی خرابی ہوگئی تھی اور اُسے بہت تیز بخار تھا۔ اُس پر کہیں راستے میں ڈاکوؤں نے حملہ کیا تھا۔ سپاہی کا نام نذر گل ہے۔ وہ دونوں اُسے جیپ میں ڈال کر ڈیرے کی طرف لے گئے تھے۔ میں یہ آپ کو کیوں بتا رہا ہوں......یہ میں نہیں بتا سکتا۔''

فریدی خط پڑھ کر کچھ سوچنے لگا تھا۔

''خان اعظم کا منیجر......قلو خان ڈیرے میں رہتا ہے۔'' ڈی ایس پی نے کہا۔ ''ظاہر ہے کہ اگر وہ خان کے کسی زخمی سپاہی کو لے گئے تھے تو انہوں نے اُسے حویلی ہی میں پہنچایا ہوگا۔''

''تو سرائے والوں کی زبان بندی خان اعظم ہی کی طرف سے کی گئی ہوگی ورنہ وہ اتنی اہم بات کیوں چھپاتے۔'' فریدی بولا۔

''تو پھر اب سرائے میں پوچھ گچھ بیکار ہی ثابت ہوگی۔'' ڈی ایس پی نے کہا۔

''براہِ راست قلو خان سے بات کیجئے۔''

''وہ سرے سے ہی انکار کر دے گا۔ نہیں......میر سرائے کی زبان کھلوانی ضروری ہے۔''

''تفتیش کے لئے خان کی اجازت لینی ہوگی۔''

''ضروری نہیں ہے۔''

ڈی ایس پی کچھ نہ بولا۔

''میں سرائے ہی سے آغاز کروں گا۔'' فریدی نے کہا۔ اُسے پہلے ہی سے علم تھا کہ انگریزوں کے دور کے دستور کے مطابق اب بھی خان اعظم کے علاقہ میں کسی قسم کی تفتیش کرنے سے قبل اُس کی اجازت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے مقامی پولیس سے مدد کا طالب ہی نہیں ہوا تھا۔ البتہ جب اُس کی جیپ ڈیرہ غزن خان کی طرف روانہ ہوئی تھی تو اُس کے پیچھے ایک جیپ اور بھی نظر آئی تھی جس پر پانچ جوان مقامی لباس میں دکھائی دیئے تھے اور وہ پوری طرح مسلح بھی تھے۔

فریدی کی جیپ ڈیرہ غزن خان سے گزر گئی۔ اُس کی اصل منزل کارواں سرائے تھی۔

دوسری جیپ کے پانچوں سوار راستے بھر اپنے مسلح ہونے کا مظاہرہ کرتے آئے تھے۔ اُڑتے ہوئے پرندوں اور جنگلی جانوروں پر فائر کرتے رہے تھے۔ فریدی نے سرائے کے باہر جیپ روکی اور اُتر کر اندر آیا۔ پہلے ملنے والے آدمی سے اُس نے میر سرائے کے بارے میں پوچھا۔ اُس نے ادھیڑ عمر کے ایک توانا اور بلند و بالا آدمی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ فریدی اُس کی جانب بڑھ گیا۔

''فرمائیے! کیا خدمت کر سکتا ہوں۔'' میر سرائے اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا بولا۔

’’پچھلے اتوار کو میرے دو دوست یہاں آئے تھے۔ اُن میں سے ایک غیر معمولی طور پر جسیم تھا۔‘‘

’’جی ہاں......!‘‘ میر سرائے ہنس کر بولا۔ ’’دیوزاد کہئے جناب عالی...... ایک نشست میں سات آٹھ سیر تکے تنہا کھا گئے تھے۔‘‘

’’ہاں وہی لوگ...... وہ لاپتہ ہوگئے ہیں۔ میں اُن کی تلاش میں ہوں۔‘‘

’’وادی سرخاب میں تلاش کیجئے۔ انہوں نے یہاں لوگوں کو بتایا تھا کہ وہیں کا ارادہ رکھتے ہیں۔‘‘

’’اُن کے ساتھ اور کون تھا......؟‘‘

’’مجھے علم نہیں جناب! وہ تو اُس دیوزاد کی وجہ سے یادداشت میں محفوظ رہ گئے۔ ورنہ لوگ آیا ہی جایا کرتے ہیں۔‘‘

’’میں اُس زخمی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں جسے تم نے ان کے ساتھ ڈیرہ غزن بھجوایا تھا۔ کہو تو اُس کا نام بھی بتاؤں...... نذر گل۔‘‘

’’کسی نے آپ کو غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش کی ہے جناب۔‘‘

’’کیا ہم کہیں تنہائی میں گفتگو نہیں کرسکتے۔‘‘ فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔

’’جی نہیں۔ مجھے جو کچھ معلوم تھا میں نے بتا دیا۔ وہ آئے تھے اور کھاپی کر چلے گئے تھے۔‘‘

’’اگر تم یہیں کھیل چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔‘‘ فریدی نے کہا اور اس کا گریبان پکڑ کر جھٹکا دیا۔

ٹھیک اُسی وقت صدر دروازے کی طرف سے آواز آئی۔ ’’کوئی اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کرے۔‘‘

دوسرے لوگ دروازے کی جانب مڑے اور انہیں وہاں دو جوان نظر آئے جن کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔

’’یہ...... یہ زیادتی ہے جناب۔ خان اعظم کے علاقے میں۔‘‘ میر سرائے ہکلایا۔

’’میرے دونوں آدمی اس علاقے میں غائب ہوئے ہیں۔‘‘

’’لل...... لیکن...... میں کیا جانوں۔‘‘

’’مجھے تمہارا تحریری بیان چاہئے ورنہ بڑا خون خرابہ ہوگا۔ میں ایک پولیس آفیسر ہوں اور میرا تعلق مرکز سے ہے۔‘‘

’’ہم خان اعظم کے علاوہ اور کسی کو جوابدہ نہیں۔‘‘

’’وہم ہے تمہارا...... خان اعظم بھی حکومت کو جوابدہ ہے۔ اگر ابھی تک یہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آئی تو میں سمجھاؤں گا۔‘‘

’’تو آپ براہِ راست محل ہی سے کیوں نہیں معلوم کرتے۔‘‘

’’نذر گل کو تم نے ان کی گاڑی میں بھجوایا تھا۔ اس لئے ابتداء تمہی سے ہوگی۔‘‘ وہ کچھ نہ بولا۔ بدحواسی کے عالم میں فریدی کی شکل تکتا رہا۔ کبھی دروازے اور دوسروں کی طرف دیکھ لیتا تھا۔

بالآخر آہستہ سے بولا۔ ’’تنہائی میں چلئے۔‘‘

فریدی نے دروازے کے قریب کھڑے ہوئے جوانوں میں سے ایک کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا تھا۔ میر سرائے اُسے ایک کمرے میں لایا اور جوان دروازے پر کھڑا رہا۔

میر سرائے فوراً ہی کچھ نہ بولا۔ تذبذب کے عالم میں معلوم ہوتا تھا۔

’’میرے پاس وقت کم ہے۔‘‘ فریدی گھڑی دیکھتا ہوا بولا۔

’’مم...... مجھے منع کر دیا گیا ہے۔‘‘ میر سرائے ہکلایا۔

’’یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔ ورنہ تم جھوٹ کیوں بولتے۔‘‘

’’قلو خان بڑا جابر آدمی ہے۔ اب میری زندگی محال ہوجائے گی۔‘‘

’’میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔‘‘

’’اور پھر میں کبھی گھر کی صورت نہ دیکھ سکوں گا۔‘‘

’’غلط سوچ رہے ہو۔ اب خان حاکم نہیں ہے۔ پورے ملک میں قانون کی حکومت ہے۔‘‘

’’خان ہی یہاں کا قانون ہے۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ مقامی پولیس خان کی اجازت کے بغیر علاقے میں قدم نہیں رکھ سکتی۔‘‘

’’میں مقامی نہیں ہوں۔‘‘

’’نذر گل کی ران میں گولی لگی تھی اور وہ نیم بیہوشی کے عالم میں تھا۔ میں نے سوچا کہ

آپ کے دوستوں کے ساتھ اُسے ڈیرہ بھجوا دوں...... دوسرے دن حویلی سے حکم آیا کہ نذر گل کا نام بھی نہ لیا جائے۔''

''کیا قلتو خان من مانی کرتا ہے۔''

''کیوں نہ کرے جبکہ اُس کی بہن خان اعظم کو بیاہی ہوئی ہے؟ بہتیرے معاملات کا تو خان اعظم کو علم تک نہیں ہوتا۔ وہ اتنے جابر نہیں ہیں۔ انہیں کتوں اور شکارگاہوں سے فرصت نہیں۔ حکومت قلتو ہی کی ہے۔''

''چپ چاپ چل کر میری جیپ میں بیٹھ جاؤ۔''

''میرے متعلقین مارے جائیں گے۔''

''اُن کی ذمہ داری بھی لے سکتا ہوں۔ میرا نام سن کر قلتو محتاط ہو جائے گا۔ تم بے فکر رہو۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو نذر گل کے سلسلے میں تمہاری زبان بند کیوں ہو جاتی۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔''

''وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں ورنہ اس اسٹیج پر واقعی تمہاری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ متعدد آدمی میری اور تمہاری ملاقات کے شاہد بن گئے ہیں۔''

''میں کیا کروں۔''

''باہر نکلو اور میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔''

غار خراٹوں سے گونج رہا تھا۔ عورت پہلے جاگی تھی اور پھر اُس نے حمید کو جگا کر کہا تھا۔

''کسی طرح اس کا حلق بند کرو، ورنہ پکڑے جائیں گے۔''

''بہت مشکل ہے۔ حلق نہیں اسے توپ کا دہانہ سمجھو۔ جگانا ہی پڑے گا۔'' حمید بولا۔

''تو پھر جگا ہی دو۔''

''کوشش کرتا ہوں...... ویسے اگر تم جھابی میں کھانے پینے کا سامان نہ لائی ہوتیں تو شائد جاگ ہی رہا ہوتا۔''

حمید نے ریڈیم ڈائیل والی گھڑی دیکھی۔ تین بجے تھے اور غار میں اتنا اندھیرا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ وہ خراٹوں کی سمت آہستہ آہستہ کھسکنے لگا۔ اس طرح قاسم تک رسائی ہوئی تھی۔ وہ چت پڑا تھا۔

''قاسم...... قاسم......!'' حمید نے اُسے جھنجھوڑا۔

''غاؤں...... غاؤں......!'' اُس نے کروٹ لی تھی اور خراٹے بند ہوگئے تھے۔ حمید نے طویل سانس لی اور ذہن پر زور دینے لگا کہ غار کا دہانہ کس طرف ہوسکتا ہے۔ پچھلی رات خاصی دیر تک چٹانوں کے درمیان بھٹکنے کے بعد اُس عورت نے یہ غار تلاش کیا تھا۔ لیکن مطمئن نہیں تھی کہ رات سکون سے گذر جائے گی۔

کسی نہ کسی طرح وہ غار کے دہانے تک پہنچ گیا۔ باہر گہرا سناٹا تھا۔ جھینگروں نے بھی اب چپ سادھ لی تھی۔ البتہ کبھی کبھی کسی دور افتادہ لومڑی کی آواز سنائی دیتی اور تاروں بھرا آسمان پھر سکوت میں گم ہو جاتا۔

وہ پھر پلٹا اور اُس جگہ پہنچنے کی کوشش کرنے لگا جہاں عورت کو چھوڑا تھا۔ وہ جاگ رہی تھی۔ حمید کی آہٹ پر بولی۔

''کیا بات ہے...... کیا تم نے اُسکا گلا گھونٹ دیا۔ اب خراٹے نہیں سنائی دے رہے۔''

''کروٹ لے لی ہے۔''

وہ چپ ہو رہی۔ حمید تھوڑی دیر بعد بولا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آخر وہ لوگ چاہتے کیا ہیں۔''

''نذر گل مر گیا...... اُسے ہوش نہیں آیا تھا۔''

''مر گیا......!'' حمید چونک کر بولا۔ ''کیسے مر گیا...... گولی ران میں لگی تھی۔''

''یہ میں نہیں جانتی۔ بس وہ یہی جاننا چاہتے ہیں کہ اُس نے تمہیں کیا بتایا تھا اور شائد تمہیں اس کے بعد بھی زندہ نہ چھوڑتے۔''

''آخر وہ ہمیں کیا بتاتا۔ سرائے والوں نے بتایا تھا کہ اُس پر رہزنوں نے حملہ کیا تھا۔''

’’غلط ہے۔اُس کو کسی مہم پر بھیجا گیا تھا۔‘‘

’’کس مہم پر۔‘‘

’’یہ میں نہیں جانتی۔تم پولیس والے بھی ہو۔اس لئے اُن کی تشویش بڑھ گئی ہے اور اب اُن کی کوشش ہوگی کہ تمہیں علاقے سے باہر نہ نکلنے دیں۔‘‘

’’تمہارے ساتھ اُس آدمی کا رویہ......!‘‘

’’اس کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں۔‘‘

’’کیا تم دنیا میں بالکل تنہا ہو۔‘‘

’’پہلے نہیں تھی۔انہوں نے میرے باپ اور بھائی کو ختم کرادیا اور مجھے لونڈیوں کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور کردیا۔شوہر پہلے ہی مر چکا تھا۔‘‘

’’مجھے افسوس ہے۔لیکن تمہارے باپ اور بھائی کا کیا قصور تھا۔‘‘

’’قتلو خان کے ایک سپاہی سے الجھ گئے تھے۔وہ ہمارے مویشی ہانک لے گیا تھا۔اُن کے کئی آدمیوں نے یلغار کی اور کلہاڑیوں سے کاٹ کر رکھ دیا۔‘‘

’’اور کسی نے پولیس کو اطلاع دینے کی زحمت نہیں گوارا کی۔‘‘

’’خان اعظم کی رعایا بہت سعادت مند ہے۔‘‘ عورت نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

’’اب کوئی کسی کی رعایا نہیں ہے......سب آزاد ہیں۔‘‘

’’یہاں سب خان اعظم اور قتلو خان کے غلام ہیں۔‘‘

’’غالباً یہ قتلو خان منیجر ہے خان اعظم کا۔‘‘

’’خان اعظم کی بیوی کا بھائی بھی ہے۔‘‘

’’کچھ بھی ہو۔ان لوگوں کو پچھتانا پڑے گا۔‘‘

’’وہ کس طرح۔‘‘

’’ہمارے غائب ہوجانے کی وجہ سے ہمارا محکمہ پوری طرح متوجہ ہوجائے گا۔‘‘

’’لیکن کوئی خان کے علاقے میں قدم بھی نہیں رکھ سکے گا۔‘‘

’’وہم ہے تمہارا۔‘‘

’’اگر یہاں پولیس کو کسی قسم کی چھان بین کرنی ہوتی ہے تو خان کی اجازت حاصل کئے

نیر علاقے میں قدم بھی نہیں رکھ سکتی۔‘‘

’’ہوسکتا ہے۔مقامی پولیس خان کے دباؤ میں ہو۔لیکن ہمارا معاملہ دوسرا ہے۔ویسے تم
بے پڑھی لکھی معلوم ہوتی ہو۔‘‘

’’اسی لئے تو مجھے یہاں اس ویرانے میں لا ڈالا گیا تھا۔انہیں خدشہ تھا کہ کہیں میں
ت کو آگے نہ بڑھادوں۔اچھا مجھے بتاؤ......اگر میں وزیر اعظم سے اس ظلم کے خلاف فریاد
رتی تو کیا مجھے مایوسی ہوتی۔‘‘

’’ہرگز نہیں......سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔دراصل ابھی تک خان کے علاقے سے کوئی
یی شکایت مرکز تک نہیں پہنچی ورنہ نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔‘‘

’’کچھ بھی نہ ہوتا۔آخر انہیں خان کے علاقے سے بھی تو ووٹ لینے ہی ہوتے ہیں۔‘‘

’’جمہوریت سے بیزار بھی معلوم ہوتی ہو۔‘‘

’’کیا میں اس معاملے میں حق پر نہیں ہوں۔‘‘

’’بہت پرانی بات کررہی ہو......اب حالات بدل رہے ہیں۔‘‘

’’خدا جانے......میں تو دنیا میں تنہا رہ گئی۔‘‘

حمید نے جماہی لی اور منہ چلا کر رہ گیا۔پتا نہیں کب سے تمبا کو نصیب نہیں ہوئی تھی اور
ب تو وہ بالکل کنگال بھی تھا۔انہوں نے جیبوں سے بھی ساری رقم نکال لی تھی۔

’’تم نے کہاں تک تعلیم حاصل کی تھی۔‘‘ اُس نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

’’جان بچانے کی سوچو......ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔‘‘

’’بچنی ہوگی تو بچ ہی جائے گی۔ہم جب اپنے گھروں سے نکلتے ہیں تو یہ سوچ کر نکلتے
ہیں کہ اب واپسی نہیں ہوگی۔لیکن......تم دیکھ ہی رہی ہو......کیا تمہیں توقع تھی کہ ہم اس
طرح رہا ہوجائیں گے۔‘‘

’’یہ تو معجزہ ہی ہوا ہے۔تمہارا ساتھی بہت طاقتور ہے۔‘‘

’’غصے میں وہ اتنا ہی بھیانک ہوجاتا ہے۔اگر تمہارے ساتھ اُس کی بدسلوکی نہ دیکھتا تو
اس کی کھوپڑی پر برف ہی جمی رہتی اور وہ اُسی طرح بندھا کھڑا رہتا۔‘‘

’’تم لوگ جو کوئی بھی ہو بہت اچھے ہو۔‘‘

"اب اتنے اچھے بھی نہیں ہیں۔"

"آدمی آدمی ہی رہتا ہے فرشتہ نہیں ہوجاتا۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"خان اعظم کے بھائی خان عظمت کے گھرانے سے بھی واقف ہو۔"

"شاہدہ خانم سے واقف ہوں...... کیونکہ وہ کئی بار میرے اسکول میں آچکی ہیں۔ بہت اچھی ہیں۔ ویسے بھی یہ عام طور پر مشہور ہے کہ وہ لوگ بے حد شرف اور مہذب ہیں۔"

"تمہارا اسکول......!"

"ہاں...... میں ڈیرہ غزن کے مدرسہ نسواں میں پڑھاتی تھی۔"

"خدا غارت کرے۔ ایک معلّمہ کا یہ حشر کیا ہے ان وحشیوں نے۔"

"بس خان اعظم کا جھنڈا اونچا ہے۔ اُسکے آگے کسی کی کوئی حیثیت نہیں سب غلام ہیں۔"

"دیکھ لیا جائے گا۔ اس خان اعظم کو بھی۔"

"سنا ہے کہ انگریزوں کے دور ہی سے لوگ اُسے دیکھتے آئے ہیں۔ لیکن ابھی تک تو کوئی اثر نہیں پڑا اُسکی صحت پر۔ ایک بار اُسنے ایک انگریز ڈپٹی کمشنر کو اپنے ہاتھوں سے پیٹا تھا۔"

"خدا نے چاہا تو اُس کی گردن ہم ہی توڑ دیں گے۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ حمید پر پھر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔

پھر دوسری بار بھی اُسے عورت ہی نے جگایا تھا اور وہ بوکھلا کر اٹھ بیٹھا تھا۔

"صبح ہوگئی ہے...... اور اب ہم پہلے سے بھی زیادہ خطرے میں ہیں۔" عورت بولی۔

"اُسے بھی جگا دو۔ پتا نہیں کب یہاں سے نکل بھاگنا پڑے۔"

"کیوں؟ میں نہیں سمجھا۔"

"اُن کے پاس بہت ہی خطرناک قسم کے شکاری کتے ہیں۔ اس وقت وہ انہیں ساتھ لے کر نکلیں گے۔"

"اگر اس غار میں کوئی اور بھی دہانہ ہے تو اُسے تلاش کر لینا چاہئے۔"

"اس سے کیا ہوگا۔"

"کہیں اور منتقل ہوجائیں گے۔ کیونکہ رائفل ایک ہی ہے۔ دونوں دہانے نہیں سنبھالے جاسکیں گے اور ایک دہانے سے آدھا کتا بھی اندر داخل نہیں ہو سکے گا۔"

"تو پھر تلاش کرو...... دیر نہ کرو۔"

حمید نے پہلے قاسم کو اٹھایا تھا۔ کتوں والی بات اُس کی کھوپڑی میں اُتارنی پڑی تھی اور اُس نے ہنس کر کہا تھا۔ "یار یہ کتے بھی حلال ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔"

"کہیں کتوں پر تم ہی نہ حلال ہوجاؤ۔ اٹھو جلدی سے۔"

"قیا قرنا ہے۔"

"غار کا دوسرا دہانہ تلاش کریں گے۔"

"ارے اسی سے نکل چلو۔ دوسرے کی کیا ضرورت ہے۔"

تھوڑا وقت دہانوں کی اہمیت سمجھانے میں صرف ہوا تھا۔ لیکن قاسم سب کچھ سن لینے کے بعد بولا۔ "مگر بیٹا ناشتے کا کیا ہوگا؟"

"تمہاری کھوپڑی پر سجا دیا جائے گا۔ اگر کچھ دیر کے لئے تم اُسے بھول نہ گئے۔"

"اچھا...... چلو...... دوسرا دہانہ ہی تلاش قرو۔" قاسم نے کہا اور عورت کو دیکھ کر اس طرح چونک پڑا جیسے پہلی بار دیکھا ہو۔ پھر اُس نے بہت پھرتی سے کھڑے ہوجانے کی کوشش کی تھی اور اوندھے منہ نیچے جا پڑا تھا۔

"ہی...ہی...ہی...!" وہ جھینپی ہوئی ہنسی کیساتھ بولا تھا۔ "شائد ابھی سو ہی رہا ہوں۔"

"خدا کے لئے جاگو بھی کسی طرح۔" حمید بولا۔

"جاگ غیا...... بالکل جاگ غیا۔"

وہ دوسرا دہانہ تلاش کرتے پھرے تھے۔ لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

حمید غار سے باہر نکلا اور گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ صبح کی نارنجی دھوپ چٹانوں پر بکھرنے لگی تھی۔ وہ اُس راستے کی جستجو میں تھا جس سے غار تک رسائی ہوئی تھی۔ خاصی تگ و دو کے باوجود بھی وہ اُس کا اندازہ نہ کرسکا۔ آخر عورت ہی سے رجوع کرنا پڑا تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے باہر نکلی اور چٹانوں کی اوٹ لیتی ہوئی ایک جانب بڑھنے لگی۔ حمید اُس کے پیچھے تھا۔

ایک جگہ رک کر اُس نے نشیب میں اشارہ کیا۔ عجیب چکر دار سا راستہ تھا۔ بالکل ایسا ہی لگتا تھا جیسے کسی اونچی عمارت کے ساتھ چکر دار زینے کھڑے کر دیئے گئے ہوں۔ حمید نے ایک چٹان کی اوٹ میں پوزیشن لے کر دیکھی۔ پورا راستہ اُس کے نشانوں کی زد پر تھا۔

"کتوں کو وہ تمہاری ہی بو پر لگا کر لائیں گے۔" حمید نے عورت سے کہا۔ "اب تم جاؤ اور غار سے نہ خود باہر نکلنا اور نہ اُسے نکلنے دینا۔ خواہ کچھ ہو جائے۔"

"اور تم......!"

"میں یہاں سے بہتر طور پر رکھوالی کر سکوں گا۔ غار کا دہانہ بھی صاف نظر آرہا ہے اور یہ راستہ بھی۔"

"وہ اول درجے کے مکار بھی ہیں۔" عورت نے اطلاع دی۔

"بے فکر رہو...... میں نے بھی صرف آغوشِ مادر ہی میں شرافت کی زندگی بسر کی تھی۔"

"تمہارے جملے بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ اُوہ...... وہ تو بھول ہی گئی ٹوکری میں ابھی کچھ چیزیں بچی پڑی ہیں۔ چل کر تھوڑا بہت کھالو۔"

"اب نہ بچی پڑی ہوں گی۔ ٹوکری بھی ساتھ ہی لائی ہوتیں۔"

"میں نہیں سمجھی۔"

"ٹوکری تک چبا گیا ہوگا۔"

"وہ ہنس پڑی اور بولی۔ "خیر! میں دیکھتی ہوں کچھ ہوا تو یہیں پہنچا دوں گی۔"

وہ چلی گئی تھی اور حمید امکانی جنگ کا نقشہ ذہن میں ترتیب دیتا رہا تھا۔

پھر اچانک اُسے محسوس ہوا جیسے سوتے سے جاگ پڑا ہو۔ ماحول جانا پہچانا سا لگنے لگا تھا۔ یہ جگہ تو اُس کی دیکھی ہوئی تھی۔ یہاں کے چپے چپے سے واقف تھا۔ ڈاکٹر ٹسڈل والے کیس کے سلسلے میں ان اطراف میں پہلے بھی کبھی سرگرداں رہ چکا تھا۔

اُس کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ یہاں اپنا تحفظ کر سکتا تھا۔ کم از کم کسی گم کردہ راہ کی حیثیت سے انجانے میں تو نہیں مارا جا سکتا تھا۔ لیکن پھر قاسم کا خیال آیا۔ اُس کا کیا ہوگا۔ اُس پہاڑ کو کس طرح متحرک رکھا جا سکے گا۔

یک بیک پھر دل گرفتگی کا حملہ ہوا اور ٹھیک اسی وقت قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ چونک کر مڑا۔ زلیخا پانی کی چھاگل اور کھانے کی چھابی اٹھائے آتی نظر آئی۔ حمید نے طویل سانس لی تھی۔ اُس نے سوچا۔ کیا چیز ہے عورت۔ قاسم جیسا پیٹ کا کتا بھی آدمی بن گیا ہے کہ اُس کی عدم موجودگی میں کھانے میں ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ غالباً اس لئے وہ اُسی کے قبیلے کی

معلوم ہوتی تھی اور اُسے پوری طرح اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

"میں اُسے صرف ایک روٹی اور دو بوٹیاں دے آئی ہوں اور وہ خوش ہے۔" زلیخا نے قریب پہنچ کر کہا۔ اُس نے انہیں اپنا نام یہی بتایا تھا۔

"اور اُس نے فریاد نہیں کی۔"

"بالکل نہیں! بڑی سعادت مندی سے میرا شکریہ ادا کیا تھا۔"

حمید کچھ نہ بولا۔ اُس نے آدھی روٹی اور صرف ایک بوٹی سے کام چلانے کی کوشش کی۔

"تم بھی تو کھاؤ۔" اُس نے زلیخا سے کہا۔

"ابھی مجھے بھوک نہیں ہے۔ اتنے سویرے نہیں کھاتی۔"

"رات مجھے اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ میں تو اس علاقے سے واقف ہوں۔ بائیں جانب والی اُترائی راکیل ہی کی طرف گئی ہے نا۔"

"ہاں...... تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"لہٰذا بے فکر رہو...... وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔"

"مجھے صرف تم دونوں کی فکر ہے۔ ورنہ میں تو کبھی کی مر چکی ہوں۔"

"مایوسی اچھی چیز نہیں ہے۔ تمہیں زندہ رہنا ہے۔ اپنے باپ بھائی کے قاتلوں کا انجام دیکھنے کے لئے۔"

"تم دو آدمی کیا کر لو گے۔"

"تمہیں یقین کیوں نہیں آتا کہ ہمارے لئے پوری مشینری حرکت میں آ چکی ہوگی۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو......!" وہ مزید کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے دور کی کوئی آواز سننے کی کوشش کر رہی ہو۔

"وہ آرہے ہیں شائد۔" تھوڑی دیر بعد وہ بڑبڑائی اور پھر حمید نے بھی کسی کتے کو بھونکتے سنا تھا۔

"وہ دیکھو......!" زلیخا مشرق کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولی۔

ایک کتا اُسی دراڑ سے نکلتا ہوا دکھائی دیا تھا جس سے گزر کر وہ اس طرف آئے تھے۔

پھر وہ زمین سونگھتا ہوا آگے بڑھنے لگا تھا۔

''حیرت......!'' زلیخا بڑبڑائی۔ ''صرف ایک کتا۔ جبکہ وہاں پورے دس عدد کتے تھے۔''

''اور اُس کے پیچھے کوئی آدمی بھی نہیں ہے۔'' حمید نے کہا۔ پھر چونک کر بولا۔

''اُوہ......ٹھہرو......بے حد چالاک لوگ معلوم ہوتے ہیں۔''

''میں نہیں سمجھی۔''

''ایک رائفل بھی میرے ہاتھ لگ گئی ہے اسلئے وہ کھل کر سامنے نہیں آئے۔ یہ کتا صرف اسلئے چھوڑا گیا ہے کہ سامنے آئے بغیر ہی وہ ہماری پوزیشن معلوم کرسکیں۔ اگر میں اس کتے پر فائر کروں تو وہ فائر کی سمت کا اندازہ کرلیں گے۔ اس طرح ایک ہی کتا تو ضائع ہوگا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ وہ بزدل اور مکار ہیں۔'' زلیخا بولی۔

''اچھا بس......اب تم غار میں جاؤ۔ میں فائر کئے بغیر ہی اس کا خاتمہ کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گی...... ہرگز نہیں۔''

''بچوں کی سی باتیں مت کرو...... جو کہہ رہا ہوں وہی کرو۔ ورنہ بڑے خسارے میں رہیں گے۔''

وہ بادل ناخواستہ غار کی طرف چلی گئی تھی۔ کتا زمین سونگھتا ہوا چکر دار راستے کی طرف بڑھتا رہا۔

حمید نے بھی اب اپنی پوزیشن میں تبدیلی کرلی تھی۔ چکر دار راستے کے اختتام کے قریب کھسک آیا تھا اور رائفل کی نال لٹھ کی طرح پکڑ رکھی تھی۔ خود چٹان کی اوٹ میں تھا۔ پھر جیسے ہی کتے کا سر نظر آیا۔ اُس نے پوری قوت سے رائفل کے کندے سے ضرب لگائی۔ کتے نے کئی قلابازیاں کھائی تھیں اور رائفل کا کندہ پے درپے اُس پر پڑتا رہا تھا۔ حمید کے ہاتھ اُسی وقت رکے تھے جب وہ ٹھنڈا ہوگیا تھا۔

''شاباش......!'' غار کے دہانے کی طرف سے قاسم کی آواز آئی۔ ''ایک وقت کی ہانڈی ہوغئی۔''

حمید کھڑا ہانپتا رہا۔ خود اپنے سر کی چوٹ پر ہتھوڑے سے پڑتے محسوس ہو رہے تھے۔ قاسم اور زلیخا بھی قریب ہی آ کھڑے ہوئے۔

''کتا کھاؤ گے۔'' زلیخا بُرا سا منہ بنا کر بولی۔

''ایک روٹی اور دو بوٹیوں کی وجہ سے گدھا بھی کھانا پڑے گا۔'' قاسم بُرا سا منہ بنا کر بولا۔

ٹھیک اُسی وقت کسی جانب سے ایک فائر ہوا تھا۔ گولی چٹان کے کنارے کو چھیلتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔

''لیٹ جاؤ'' حمید پھرتی سے نیچے گرتا ہوا بولا۔ قاسم بوکھلاہٹ میں سجدے میں چلا گیا تھا اور زلیخا اوندھی پڑی تھی۔

''ابے لیٹ جا......!'' حمید دانت پیس کر بولا۔ ''تم دونوں سے کس نے کہا تھا کہ غار سے نکل آؤ۔''

''قق......قق......قیسے لیٹوں۔'' قاسم کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔

پھر اُس نے دونوں ٹانگیں پھیلانے کی کوشش کی تھی اور لڑھکتا ہوا نشیب میں جانے لگا تھا۔ زلیخا نے لیٹے ہی لیٹے جھپٹ کر اُس کی ٹانگ پکڑ لی تھی۔ ایک فائر پھر ہوا اور اس بار سمت کا بھی اندازہ ہوگیا۔ لیکن حمید نے جوابی فائر نہیں کیا تھا۔ رائفل وہیں رکھ کر تیزی سے بائیں جانب کھسک گیا تاکہ قاسم کو سنبھالنے میں زلیخا کی مدد کرسکے۔ دوسری ٹانگ خود اُس نے پکڑی تھی۔

بڑی دشواری سے قاسم کو کھینچ کر سیدھا کیا۔ وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

''مر ہی جانے دیا ہوتا...... مجھ قو......!'' قاسم بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ ''غضب خدا قا......ایک روٹی اور دو بوٹیاں۔''

زلیخا کو ہنسی آ گئی اور حمید نے کہا۔ ''اس چٹان کی اوٹ سے باہر نکلے اور سچ مچ مارے گئے۔''

''قون زندہ رہنا چاہتا ہے۔'' قاسم آنکھیں نکال کر بولا۔

''بس بکواس بند۔ تم دونوں یہیں ٹھہرو۔ میں راستے کی نگرانی کروں گا۔''

وہ پھر اُسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے کتے پر حملہ آور ہوا تھا۔

اب وہ گھیرنے والوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرنا چاہتا تھا کہ رائفل اُس کے قبضے میں نہیں رہی۔ پچھلی رات فرار ہوتے وقت بدحواسی میں کہیں ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

ایک فائر پھر ہوا اور گولی ٹھیک اسی جگہ پڑی جہاں پہلے لگی تھی۔ لیکن حمید نے لاپرواہی

سے شانوں کو جنبش دی۔ خواہ مخواہ کارتوس نہیں ضائع کرنا چاہتا تھا اور پھر انہیں یہ بھی تو باور کرانا تھا کہ وہ خالی ہاتھ ہے۔ زلیخا لیٹے ہی لیٹے اس کے قریب کھسک آئی تھی۔

''تم بھی کیوں نہیں فائر کرتے۔'' اُس نے آہستہ سے پوچھا۔

''بس دیکھتی رہو......کارتوس ضائع کرنے کا قائل نہیں ہوں۔''

''وہ ہمیں یہاں سے نکلنے نہیں دیں گے۔'' زلیخا مایوسی سے بولی۔

''دیکھا جائے گا۔''

''اب تو غار میں بھی واپس نہیں جاسکتے۔''

''چٹان کی اوٹ سے نکلے اور مارے گئے۔'' حمید نے کہا۔

''اگر وہ کوشش کریں تو اُدھر سے بھی اوپر آسکتے ہیں۔'' زلیخا بائیں جانب والی ڈھلان کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولی۔

''بس تو پھر تم اُدھر نظر رکھو۔ اگر اُن میں سے کوئی دکھائی دے تو مجھے مطلع کر دینا۔''

''اُدھر وہ دماغ چاٹنا شروع کردے گا۔ بس تین روٹیاں اور باقی ہیں باسکٹ میں۔''

''اُس کی باتیں ایک کان سے سنو اور دوسرے سے اڑا دو۔''

''سب سن رہا ہوں بیٹا۔'' قاسم کی آواز آئی تھی اور زلیخا ہنس پڑی تھی۔

''سن بھی رہا ہوں اور دیخ بھی رہا ہوں۔''

''چپ چاپ پڑا رہ۔''

''ابے جرا تمیز سے......ورنہ کوئی چٹان اکھاڑ کر سر پر دے ماروں غا۔''

''میں یہ کہہ رہا تھا کہ ذرا اُدھر کا خیال رکھنا کہیں اُدھر سے نہ کوئی کتا چڑھ آئے۔''

''میں سب سمجھتا ہوں بیٹا۔ دیخ لوں گا تمہیں۔''

حمید نے مزید چھیڑ چھاڑ مناسب نہ سمجھی۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ قاسم کے دل میں کیا ہے۔ زلیخا زیادہ تر اُسی سے گفتگو کرتی رہتی تھی اور قاسم دیکھ دیکھ کر بل کھاتا رہتا تھا۔ خود اُس کی اپنی منطق کے مطابق اپنے ڈیل ڈول کو دیکھتے ہوئے زلیخا کو اُس کی طرف جھکنا چاہئے تھا۔ آخر زیادہ تر حمید ہی کے ساتھ کیوں رہتی تھی۔

''یہ آدمی میری سمجھ میں نہیں آرہا۔'' زلیخا آہستہ سے بولی۔

''کوئی خاص بات نہیں۔ بس تھوڑا سا کریک ہے۔'' حمید نے کہا لیکن اپنی آواز اونچی نہ ہونے دی۔ قاسم اُسی کو گھورے جارہا تھا۔ دفعتاً سر ہلا کر بولا۔ ''ہاں...... ہاں......اب دھیرے دھیرے قرو میری بُرائی۔''

''ہوشیار......!'' حمید اُسے گھونسہ دکھا کر بولا۔ ''ہم گھیر لئے گئے ہیں......وہ آرہے ہیں۔''

پھر اُس نے زلیخا سے قاسم ہی کی طرف جانے کو کہا تھا۔ دو مسلح آدمی چکر دار راستے کی طرف بڑھے آرہے تھے۔ شائد انہیں سچ مچ یقین ہوگیا تھا کہ فرار ہوجانے والوں کے قبضے میں رائفل نہیں ہے۔

وہ اوپر آنے والے راستے کے قریب پہنچ کر رک گئے تھے۔ حمید نے ایک کی ٹانگ کا نشانہ لے کر فائر کردیا۔ وہ جھٹکے کے ساتھ گرا تھا اور دوسرے نے اوٹ لینے کے لئے دوسری طرف دوڑ لگائی تھی۔ حمید نے پھر فائر کیا اور دوسرا بھی لڑکھڑا کر گر پڑا۔

دونوں کے ہاتھوں سے رائفلیں نکل کر دور جا پڑی تھیں اور وہ پیٹ کے بل رینگتے ہوئے ان تک پہنچنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ شائد دوسرے کی بھی ٹانگ ہی زخمی ہوئی تھی۔

حمید نے اٹھ کر دوڑ لگائی تھی اور چکر دار راستے سے نیچے اترنے لگا تھا۔ دوڑنے سے قبل زلیخا اور قاسم سے وہیں ٹھہرنے کا کہا تھا۔

پھر قبل اس کے کہ وہ اپنی رائفلوں تک پہنچتے حمید اُن کے سروں پر جا پہنچا تھا۔

''ختم ہی کردوں گا......اگر اب جنبش بھی کی۔'' وہ اُن کی طرف رائفل اٹھاتا ہوا بولا۔

انہوں نے گردنیں ڈال دیں۔ ایک کے بائیں کولہے میں گولی لگی تھی اور دوسرے کی ران زخمی تھی۔

وہ خوفزدہ نظروں سے حمید کی طرف دیکھتے رہے۔ حمید جلد سے جلد اُن کی رائفلوں اور کارتوسوں پر قبضہ کرکے اوپر واپس جانا چاہتا تھا۔

''میرا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھنا کہ تمہیں صرف زخمی کیا ہے۔ ورنہ اتنی دور سے کھوپڑی یا دل کا نشانہ لینا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ اپنی کارتوسوں کی پٹیاں اُتار کر میری طرف پھینک دو۔''

انہوں نے خاموشی سے تعمیل کی تھی اور حمید دونوں رائفلیں لے کر اوپر پہنچا تھا۔

''کیا ہوا......کک......کیا......!'' زلیخا کی نظریں مالِ غنیمت پر جم گئیں۔

''بے فکر رہو۔ وہ صرف زخمی ہوئے ہیں اور شائد ان اطراف میں دو ہی تھے ورنہ میری واپسی ناممکن ہو جاتی۔''

''واہ.....واہ......!'' قاسم خوش ہو کر بولا۔ ''اب مزا آئے گا ٹھائیں ٹھوئیں کا۔ میں بھی چلاؤں غا رائفل۔''

''کیا تم بھی چلا سکتی ہو۔'' حمید نے زلیخا سے پوچھا۔

''کیوں نہیں! میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔''

''اور میں تو.... میں تو.... بس اللہ کے بھروسے پر فائر کر دیتا ہوں۔'' قاسم چہک کر بولا۔

✪

میر سرائے کی گرفتاری کی خبر سن کر قلتو خان پاگل ہو گیا تھا۔ اُس کی یادداشت میں پہلی بار خان کے علاقے میں ایسی کوئی سرکاری کارروائی ہوئی تھی جس کا علم پہلے سے اُسے نہ رہا ہو۔ قلتو خان خطرناک آدمی تھا۔ لوگ اُس سے اس طرح خائف رہتے تھے جیسے وہ کارخانہ قدرت میں بھی دخیل رہا ہو۔ مضبوط جسم والا لمبا چوڑا آدمی تھا۔ آنکھیں خونخوار تھیں اور عام آدمی کی جرأت تک نہیں ہوتی تھی کہ اُس کے سامنے نظر بھی اٹھا سکے۔ بہتیروں نے آج تک اُس کی شکل ہی نہیں دیکھی تھی حالانکہ دن رات اُس کے سامنے سے گزرتے رہتے تھے۔

''کرنل فریدی۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔ ''ہمارے علاقے میں قدم رکھنے کی جرأت کیسے ہوئی تھی اُسے۔''

خبر لانے والوں پر بُری طرح گرجا برسا تھا۔ لیکن ہونے والی بات ہو ہی چکی تھی۔

ابھی یہی زخم تازہ تھا کہ دوسری اطلاع آ گئی۔ حمید اور قاسم کے فرار کی کہانی تھی۔ پوری روداد سن لینے کے بعد وہ دم بخود رہ گیا تھا۔

خبر لانے والے کو خونخوار نظروں سے گھورتے رہنے کے بعد آہستہ سے پوچھا۔ ''انہیں

وہاں لے جا کر رکھنے کی تجویز کس کی تھی۔''

''شیر باز کی حضور۔'' خبر لانے والے نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

''کہاں ہے شیر باز......؟'' قلتو خان دہاڑا۔

اور پھر ذرا ہی سی دیر میں شیر باز حاضر کر دیا گیا تھا۔

''تم سب باہر جاؤ......!'' قلتو خان نے دوسروں سے کہا وہ چلے گئے اور صرف شیر باز کھڑا کانپتا رہا۔

''تجھے کب اور کہاں معلوم ہوا تھا کہ اُن میں سے ایک آدمی پولیس سے تعلق رکھتا ہے۔'' قلتو خان نے شیر باز سے سوال کیا۔

''وہیں خان! جہاں ہم نے انہیں گھیرا تھا۔ وہ بیہوش ہو گئے تھے اور ہم نے اُن کی جامہ تلاشی لی تھی۔ اُس کا شناخت نامہ جیب سے برآمد ہوا تھا۔''

''اور اس کے باوجود بھی تو انہیں وہاں لے گیا تھا جہاں زلیخا کو رکھا گیا تھا۔''

''پپ...... پہلے بھی تو......!''

''پہلے کے بچے...... پہلے وہاں جو لوگ رکھے گئے تھے اُن میں کوئی پولیس والا نہیں تھا۔ وہ وہاں سے فرار ہو گئے اور زلیخا کو بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔''

شیر باز دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

''کھڑا ہو جا...... خبیث......!'' قلتو خان دھاڑا۔

''معاف کر دیجئے خان......!'' وہ اٹھتا ہوا بولا۔ لیکن اتنی دیر میں قلتو خان نے قریب پڑی ہوئی وزنی کرسی اٹھائی تھی اور اُس کے سر پر دے ماری تھی۔

وہ ایک کریہہ سی چیخ کے ساتھ ڈھیر ہو گیا۔ اُسے وہیں زخمی اور بیہوش چھوڑ کر وہ باہر آیا۔

یہاں دوسرا ہرکارہ باریابی کا منتظر تھا۔ اُس کی شکل دیکھتے ہی قلتو سمجھ گیا تھا کہ وہ کہاں سے آیا ہوگا۔

''اب تو کیا خبر لایا ہے......!'' وہ اُسے گھورتا ہوا غرایا۔

''اچھی خبر نہیں ہے خان......!''

''تیری شکل ہی سے ظاہر ہو رہا ہے۔ بتا کیا بات ہے۔''

''ٹیڑھی چٹان والے غار کے قریب وہ گھیرے گئے تھے۔ لیکن ایک کتے کو مار کر اور سپاہیوں کو زخمی کر کے وہ نکل گئے۔ اب اُنکے قبضے میں تین رائفلیں اور وافر راؤنڈ موجود ہیں۔''

''لعنت ہو تم سبھوں پر......!'' قلو خان پیر پٹخ کر چیخا اور ہرکارے کی گھگھی بندھ گئی۔ ''وہ کتیا کی بچی انہیں شہر تک پہنچا دے گی۔''

ہرکارہ ہاتھ باندھے ہوئے زمین بوس ہوتا چلا گیا۔

''دفع ہو جاؤ نظروں کے سامنے سے......!'' قلو خان واپسی کے لئے مڑتا ہوا بولا۔ اس نئی خبر نے شائد اُس کی تشویش میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

اُس کے پیچھے اُس کا نائب صمد خان بھی چلا تھا۔ ایک جگہ رک کر قلو خان نے اُس سے کہا۔ ''شیر باز اندر زخمی پڑا ہے۔ اُس کی مرہم پٹی کرا دے۔''

''ب......بہت......بہتر خان۔'' صمد بوکھلا کر بولا اور وہیں سے پلٹ گیا۔

قلو خان نے خواب گاہ کا رخ کیا تھا۔ تشویش اور غصے کے عالم سے گزرنے کے بعد اُسے نیند آنے لگتی تھی۔ بستر پر بیٹھا ہی تھا کہ پھر اچھل پڑا۔

''کرنل فریدی......اُس کا بھی کچھ انتظام ہونا چاہئے۔'' بڑبڑاتا ہوا اٹھا اور پھر اُسی طرف چل پڑا جہاں دوسروں کو چھوڑ آیا تھا۔ اپنے نائب صمد خان کو طلب کیا۔

''ہوش آیا اُس کتے کو......!'' اُس نے پوچھا۔

''نہیں خان۔'' صمد خان نے کہا۔ ''اُسی حالت میں مرہم پٹی ہو رہی ہے۔''

''کرنل فریدی کے لئے تو نے کیا سوچا۔''

''مم......میں کیا سوچوں خان۔ حکم دیجئے......بجا لائیں گے۔''

قلو خان نے گردن اڑا دینے کا اشارہ کیا اور صمد خان سر کو تفہیمی جنبش دے کر رہ گیا۔ لیکن اُس کی آنکھیں بدستور سراپا سوال بنی ہوئی تھیں۔

''مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ گلریز میں ٹھہرا ہوا ہے۔'' قلو خان بولا۔

''اچھی بات ہے خان۔ ہم کوشش کریں گے۔''

''اُس طرح نہیں۔ جیسے وہ حرام خور کرتے رہے ہیں۔''

''زلیخا نے انہیں رہائی دلائی ہوگی۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ اُس کا بھی قصہ پاک

کیا جائے۔''

''کیوں بکواس کر رہا ہے۔ آج تک میرے ہاتھ کسی عورت کے خون سے رنگین نہیں ہوئے۔ وہ کتے یہ معلوم ہو جانے کے بعد بھی کہ اُن میں سے ایک پولیس آفیسر ہے انہیں وہاں کیوں لے گئے تھے۔''

''وہ تو بہت بڑی حماقت تھی خان۔''

''اگر وہ زلیخا سمیت ہمارے علاقے سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو میں بہتیروں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ انہیں گھیرے رکھنے کے لئے اور آدمی بھیجو۔''

''وہ تو کبھی کے بھیج دیئے گئے۔ نکاسی کے راستوں کی ناکہ بندی کر دی گئی ہے۔''

''نذر گل کا بھائی نیاز گل کہاں ہے۔''

''وہ کارواں سرائے کے قریب کہیں رہتا ہے۔''

''اُسے یہاں سے ہٹا دو۔''

''بہت بہتر خان۔''

اتنے میں ایک آدمی کسی کا ملاقاتی کارڈ لے کر اندر آیا اور اُسے قلو خان کے سامنے پیش کر کے کھڑا ہو گیا۔ قلو خان نے کارڈ پر نظر ڈالی اور بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ ''وہ خود ہی پہنچ گیا۔''

پھر اُس نے ہاتھ ہلا کر اُس آدمی کو جانے کا اشارہ کیا تھا۔ اُسکے چلے جانے کے بعد صمد خان سے بولا۔ ''کرنل فریدی......تم جاؤ اور اُسے کہہ دو کہ میں آرام کر رہا ہوں۔ پھر کسی وقت آئے اور اُس کے کسی سوال کا جواب ہرگز نہ دینا۔ کیونکہ ہر قسم کی جوابدہی کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور دوسری بات اپنے علاقے کے باہر ہی اُس پر حملہ کرنا۔''

''بہت بہتر خان۔''

صمد خان باہر آیا۔ برآمدے کے سامنے تین جیپیں کھڑی تھیں جن پر باوردی مسلح آدمی بیٹھے نظر آئے۔ کرنل فریدی اگلی جیپ کے قریب کھڑا نظر آیا۔ صمد خان نے آگے بڑھ کر اُسے اطلاع دی کہ قلو خان آرام کر رہا ہے اور کوئی اُس کے آرام میں مخل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ پھر کبھی آئے۔

''دراصل مجھے نذر گل سے تھوڑی سی پوچھ گچھ کرنی ہے۔ میں نے کہا پہلے قلو خان سے

اجازت حاصل کرلوں کہ یہاں کا یہی دستور ہے۔'' فریدی مسکرا کر بولا۔

''مجھے افسوس ہے۔'' صمد خان نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''آپ اُس سے پوچھ گچھ نہیں کرسکیں گے کیونکہ تین دن ہوئے اُس کا انتقال ہوگیا۔''

''لیکن زخم تو مہلک نہیں تھا۔ غالباً ران میں گولی لگی تھی۔''

''پتا نہیں۔ آپ کس زخم کی بات کررہے ہیں۔ اُس کا تو حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے انتقال ہوا تھا۔''

''تب تو لاش نکلوانی پڑے گی قبر سے۔''

''کون نکلوائے گا......؟'' صمد خان نے کسی قدر گرم ہوکر کہا۔

''میں نکلواؤں گا۔''

''ہم اپنے علاقے میں ایسی کسی غیر مذہبی حرکت کی اجازت نہیں دیں گے۔''

''اجازت تم نہیں دوگے۔ سیشن جج دے گا۔''

''خان اعظم کے علاقے میں اُن کا حکم چلتا ہے۔''

''انگریز عرصہ ہوا چلے گئے۔ اب ایسی مراعات باقی نہیں رہیں تم لوگ وہم میں مبتلا ہو۔''

''کچھ کرکے دیکھئے۔ پھر قدر وعافیت معلوم ہوجائے گی۔'' صمد خان کا غصہ بڑھتا جارہا تھا۔

''میر سرائے کو میں نے تمہارے ہی علاقے سے گرفتار کیا ہے۔''

''صوبے کے گورنر سے شکایت کردی گئی۔''

''اس کے باوجود بھی میں پھر یہیں موجود ہوں۔'' فریدی بجھا ہوا سگار سلگا کر بولا۔

''اور اُس وقت تک رکوں گا جب تک قتلو خان سے ملاقات نہ ہوجائے۔''

''ملاقات نہیں ہوگی۔ وہ نہیں ملیں گے۔'' صمد خان آپے سے باہر ہوا جارہا تھا۔

''مجھے تو اپنا فرض پورا کرنا ہے، خواہ دس دن گزر جائیں۔''

''ہم زبردستی اپنے علاقے سے نکال دیں گے۔''

''کوشش کرکے دیکھو۔''

''ٹھہرو......ابھی بتاتا ہوں۔'' صمد خان نے کہا اور تنتناتا ہوا اندر چلا آیا۔ قتلو خان ابھی خواب گاہ میں نہیں گیا تھا۔ شائد وہاں اُسی کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔

صمد خان نے غضب ناکی کے عالم میں اپنے اور فریدی کے مکالمے دہرائے اور قتلو خان وحشیانہ انداز میں دہاڑا۔ ''اُو حرامزادے۔ یہ کیا کیا تو نے۔ آدھا بیان دے آیا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اُس کے کسی سوال کا جواب نہ دیجیو۔''

''لل......لیکن......خان......!'' صمد خان سہم کر ہکلایا۔ ''اُس نے چھوٹتے ہی نذر گل کی بات شروع کردی تھی۔ اپنے آدمیوں کا نام تک نہیں لیا۔''

''بس چلا جا سامنے سے ورنہ ٹانگیں چیر کر پھینک دوں گا۔''

صمد خان چپ چاپ کھسک گیا۔ قتلو خان کا سینہ لوہار کی دھونکنی کی طرح پھول پچک رہا تھا۔ غصے کا یہ عالم تھا کہ اگر صمد خان تھوڑی دیر اور ٹھہرتا تو ضرور اپنی جان سے جاتا۔

معمول پر آنے میں کچھ دیر لگی تھی اور پھر قتلو خان اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا تھا۔ باہر آیا۔ فریدی جیپ کے بونٹ پر بائیں کہنی ٹکائے کھڑا سگار کے ہلکے ہلکے کش لیتا ہوا نظر آیا۔ قتلو خود اُس کے قریب ہی پہنچ کر رکا تھا۔

''یہ ناممکن ہے۔'' وہ آہستہ سے غرایا۔ فریدی سگار ہونٹوں کی طرف لیجاتے لیجاتے رک کر بہ آہستگی اُس کی طرف مڑا اور سوالیہ نظروں سے اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

''تم قبر نہیں کھدوا سکتے۔''

''ضرورتاً ایسا ممکن ہے قتلو خان......!'' فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔

''ضرورت کیوں پیش آئے گی۔''

''اس لئے کہ اُسے ڈاکوؤں نے زخمی کیا تھا۔ لیکن پولیس کو اس سے مطلع نہیں کیا گیا۔ پھر وہ مر بھی گیا۔''

''کسی نے غلط اطلاعات پہنچائی ہیں۔'' قتلو خان بولا۔ ''وہ چھ ماہ سے بیمار تھا۔ تین دن ہوئے اچانک حرکت قلب بند ہوگئی۔''

''میر سرائے نے باقاعدہ طور پر تحریری بیان دیا ہے۔''

''وہ سازشی ہے......اگر کوئی اور بھی اُس کے بیان کی تائید کرسکے تو لاؤ۔ صرف اُسی کا بیان ناکافی ہوگا۔''

''ہاں یہ بات تو ہے لیکن پھر میرے آدمیوں کی جیپ تمہارے علاقے میں کیوں ملی تھی؟''

"میں نہیں جانتا......دن رات ادھر سے درجنوں گاڑیاں گزرتی رہتی ہیں۔"

"دوسری بات۔ نہ تم خود رہزنوں کا کوئی انتظام کرسکتے ہو اور نہ پولیس کو کسی واردات کی اطلاع دیتے ہو۔"

"ہمارا اپنا معاملہ ہے۔"

"نہیں قلو خان۔ یہ پوری قوم کا معاملہ ہے۔ تم جو کچھ بھی کررہے ہو وہ ملکی قوانین کے منافی ہے اور اس کے لئے تمہیں جوابدہ ہونا پڑے گا۔ میں اس سلسلے میں براہِ راست خان اعظم سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

"خان کسی سے بھی نہیں ملتے......میں مختار عام ہوں۔"

"مجھ سے ملیں گے......بس اتنا معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کہاں ہیں۔ محل میں تو نہیں ہیں۔"

"کئی ماہ سے وہ شکارگاہوں میں ہیں۔ کسی سے بھی نہیں ملے۔"

"خیر......کوئی اور صورت نکالی جائے گی۔"

"ایک بار پھر سن لو کہ اگر قبر کھودنے کی کوشش کی گئی تو بڑا خون خرابہ ہوگا۔ اس علاقے کے لوگ جانیں دے دیں گے لیکن لاش کی بے حرمتی گوارہ نہیں کریں گے۔"

"اور میں بھی تمہیں آگاہ کردوں کہ اگر آج آٹھ بجے رات تک میرے دونوں آدمی گلریز تک نہ پہنچ گئے تو واقعی اس علاقے میں بڑا خون خرابہ ہوگا۔"

پھر اُس کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ جیپ میں بیٹھ گیا تھا۔ اُس نے جیپوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں دیکھ لی تھیں۔

اُس نے صمد خان کو گیراج کی طرف دوڑتے دیکھا اور اُسے آواز دے کر روکتے ہوئے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

کمرے میں پہنچ کر بولا تھا۔ "اس وقت نہ چھیڑ......جانے دے۔"

"جیسا حکم خان! میں تو سردھڑ کی بازی لگانے جارہا تھا۔" صمد خان نے کہا۔

"آج رات گلریز میں اس کا خاتمہ ہوجانا چاہئے۔ آٹھ بجے سے پہلے پہلے۔"

"یہ زیادہ آسان ہوگا۔" صمد خان سر ہلا کر بولا۔

"اور وہ تینوں علاقے سے نہ نکلنے پائیں۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ راستوں کی ناکہ بندی کردی گئی ہے۔"

"بس جاؤ۔" قلو خان نے کہا اور خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

بازیابی

وہ شمال کی طرف بڑھتے رہے حتیٰ کہ پھر سورج غروب ہونے لگا۔ دن بھر میں بمشکل ایک میل کی مسافت طے کی ہوگی۔ اول تو محتاط ہو کر چل رہے تھے اور پھر انہوں نے وہ راستے ترک کردیئے تھے جن پر تعاقب کرنے والوں سے مڈبھیڑ ہوجانے کا خدشہ ہوسکتا تھا۔

قاسم کی بُری حالت تھی۔ کبھی کبھی حمید اور زلیخا کو مل کر اُس کی مدد کرنی پڑتی تھی۔ سست روی کی وجہ بھی وہی تھا۔ قدم قدم پر بیوہ عورتوں کے سے انداز میں مقدر کی خرابی کی شکایت کرتا اور حمید کے ساتھ تو ایسا ہی رویہ تھا جیسے اُسی کی وجہ سے "بیوہ" ہوا ہو۔ زلیخا کبھی ہنستی اور کبھی جھنجھلاتی۔

سہ پہر کو ایک جگہ خوبانیوں کے چند خودرو درخت مل گئے تھے اور انہوں نے کچی پکی خوبانیوں سے کھانے کی جھاپی بھرلی تھی۔ ایک چشمے سے پانی کی چھاگل بھی سیراب ہوئی تھی۔ بہرحال بھوک کو بہلائے رکھنے کا سامان ہوگیا تھا۔

سورج غروب ہونے سے پہلے ہی شب بسری کے لئے کوئی مناسب سی جگہ تلاش کرلینا چاہتے تھے۔ حمید اپنی یادداشت کے سہارے انہیں ایسی راہ پر لایا تھا جس کا علم زلیخا کو بھی نہیں تھا اور وہ یہی سمجھتی تھی کہ وہ گم کردہ راہ ہوچکے ہیں۔ شائد ہی سرخاب ویلی تک پہنچ سکیں۔ ایک آدھ بار اُس نے اپنے اس خیال کا اظہار بھی کیا تھا۔

"مرجانے سے بہتر ہے کہ ہم راہ بھٹک جائیں۔" حمید کا جواب تھا۔ اس پر قاسم نے خاصا غباڑا مچاتے ہوئے کہا تھا۔ "اور تمہارا قیا ہے بیٹا......نہ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے۔ مرو چاہے زندہ رہو۔"

''تمہارے مرنے پر کون ہے رونے والا۔'' حمید نے کہا۔ ''باپ کو بھی خوشی ہوگی اور بیوی کو بھی۔''

''بیوی! بیوی قہاں ہے......ہی ہی ہی......قیوں مزاخ کرتے ہو۔''

''ابھی تک آپ کی شادی نہیں ہوئی۔'' زلیخا نے حیرت سے کہا۔

جی نہیں......مجھ ایسے تو کون اپنی بیٹی دے گا۔''

حمید سختی سے ہونٹ بھینچے چلتا رہا۔ اس مشکل وقت میں بھی قاسم اپنی اس دماغی ٹیڑھ سے پیچھا نہیں چھڑا سکا تھا۔ ہوسکتا ہے زلیخا ہی کی وجہ سے اُس نے سفر جاری رکھا ہو ورنہ کہاں قاسم اور کہاں دشوار گزار پہاڑی راستہ۔

جائے پناہ کی تلاش خاصی صبر آزما ثابت ہوئی۔ بھٹکتے پھر رہے تھے۔ ادھر اُدھر۔ آخر کار قاسم بولا۔ ''میں تو بیٹھا ہوں......اور زلیخا بی بی تم بھی بیٹھ جاؤ۔''

''کیا مطلب......؟'' حمید نے آنکھیں نکالیں۔

''تم جا کر تلاش کرو......پھر ہمیں بھی بتا دینا۔''

''نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔'' زلیخا بولی۔

''قیوں نہیں ہوسکتا۔''

''تنہا کوئی کہیں نہیں جائے گا۔''

''ارے واہ......بڑے ننھے بچے ہیں نا کہ کھو جائیں گے۔''

''کچھ بھی ہو......!'' زلیخا جھنجھلا کر بولی۔

حمید سمجھ رہا تھا کہ اب اُسکی خیر نہیں۔ ویسے قاسم اس کو اس بُری طرح گھور رہا تھا جیسے کچا ہی چبا جائے گا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر زبان کھل سکی تو وہ چھوٹتے ہی کیا کہے گا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ رات کھلے ہی میں بسر کرنی پڑے گی۔'' حمید بولا۔ ''اتنی اونچائی پر کوئی غار نہیں مل سکے گا۔''

''اور یہ جو اتنی سردی ہو رہی ہے۔'' قاسم آنکھیں نکال کر بولا۔

''میری وجہ سے نہیں ہو رہی۔''

''ارے تو کیا اب تم دونوں آپس میں لڑو گے۔'' زلیخا بولی۔

کوئی کچھ نہ بولا۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اواخر ماہ کا چاند بھی دیر سے طلوع ہوتا۔ اس لئے وہ جلد از جلد کہیں ڈیرہ ڈال دینا چاہتے تھے۔

اور پھر زلیخا نے ایک مناسب سی جگہ ڈھونڈھ ہی لی۔ تنگ سا درہ تھا جس کا اختتام ایک چٹان پر ہوا تھا۔ یعنی آگے راستہ نہیں تھا۔

''یہاں ہم آگ بھی جلا سکیں گے۔'' زلیخا بولی۔

''اور خوبانیاں پکائیں گے۔'' قاسم نے جل کر کہا۔

حمید کچھ نہ بولا۔ بُری طرح تھک گیا تھا اور سر کے زخم کی تکلیف پہلے سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''کیوں......کیا بات ہے؟'' زلیخا نے اُس کے قریب ہی بیٹھتے ہوئے پوچھا اور حمید سر کی بینڈیج پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

''یہ چوٹ کیسے لگی تھی۔''

''کیا تم سمجھتی ہو کہ میں آسانی سے اُن کے قابو میں آیا ہوں گا۔''

''ہرگز نہیں......یہ تو دیکھ ہی چکی ہوں۔''

''اگر عقب سے حملہ نہ کرتے تو ہم پر قابو پانا مشکل ہوتا۔''

''پھر بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کروں۔''

''ایق بڑا سا پتھر اٹھاؤ اور مارو برادران لا کے سر پر۔'' قاسم بھنا کر بولا۔ جو پیچھے کھڑا اُن کی باتیں سن رہا تھا۔

''تم آخر اتنے وحشی کیوں ہو۔'' زلیخا غرائی۔

''چپ رہو......کچھ نہ کہو۔ بیوی کی طرف سے بالکل یتیم ہے۔'' حمید بولا۔

''پھر وہی بیوی......ابے کیوں عاقبت خراب کرتے ہو جھوٹ بول قر......!'' قاسم نے بوکھلا کر کہا۔

''بس تو پھر زبان کو لگام دو۔''

زلیخا درے میں چلی گئی تھی اور لکڑیاں چن کر آگ جلانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ اُس نے راستے بھر خشک لکڑیاں اکٹھا کی تھیں۔

ادھر قاسم حمید سے شکوہ کررہا تھا۔ ''تم سالے پہلے دل بڑھاتے ہو اور پھر دل توڑ دیتے ہو۔''

''اس بکواس کا مطلب......؟''

''وہ زیادہ تر تمہارے ساتھ رہتی ہے اور تم ہی سے باتیں بھی قرتی ہے۔''

''تو پھر میں قیا قروں......!'' حمید نے جل کر اُس کے لہجے کی نقل اُتاری۔

''تمہارے لائق نہیں ہے۔''

''خاموش رہو...... وہ ایک مظلوم عورت ہے۔ مجھے اُس سے ہمدردی ہے۔ تمہیں بھی ہونی چاہئے۔''

''ابے تو قیا میں اُسے گالیاں دے رہا ہوں۔''

''جو کچھ تم اُس کے بارے میں سوچ رہے ہو وہ گالی ہی دینے کے مترادف ہے۔''

''تم خود مترادف...... تمہارے باپ دادا مترادف......!''

''مترادف کے معنی ہیں برابر......!''

''ٹھینگے کے معنی ہیں مترادف...... جہنم میں جاؤ...... لیقن اب اگر میری بیوی کا نام لیا تو جان سے ماردوں غا۔''

حمید کچھ نہ بولا۔ بولنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ سر میں شدید درد کے باوجود بھی پلکیں نیند سے بوجھل ہوئی جارہی تھیں۔ اگر وہ سونا چاہتا تو اس میں سر کی تکلیف قطعی حارج نہ ہوتی۔ گویا نیند نہیں غشی طاری ہو رہی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ بے خبر سو گیا تھا۔ قاسم اس سے بے خبر بیٹھا بڑبڑاتا رہا۔ بڑے دوست بنتے ہیں سالے...... ابے سب اپنے اپنے مطلب کے ہیں۔ قوئی کسی کا نہیں ہے۔ پہلے خود تو شادی کی بات قی تھی اور اب یہ...... میں بھی بتادوں غا کہ یہ فراڈ ہے۔ لونڈیوں سے پھلرٹ کرتا ہے...... کسی کو اپنا نہیں سکتا۔''

اتنے میں زلیخا قریب پہنچ کر بولی۔ ''چلو آگ کے پاس بیٹھو...... سردی بڑھ گئی ہے۔''

قاسم تو اٹھ کھڑا ہوا تھا لیکن حمید نے جنبش تک نہیں کی تھی۔

''چلو اُٹھو...... کیوں یہاں سردی میں بیٹھے ہوئے ہو۔'' زلیخا نے پھر کہا۔

''نخرے کررہا ہے برادران لا......!'' قاسم بولا۔

''یہ تمہارے برادران لا ہیں۔''

''نن...... نہیں...... وہ تو...... وہ تو......!''

زلیخا اُسکی طرف توجہ دیئے بغیر آگے بڑھی تھی اور حمید کا شانہ ہلا کر اٹھنے کو کہا تھا۔ لیکن کوئی جواب نہ پا کر اُسکے قریب دوزانو بیٹھتی ہوئی بولی۔ ''شائد ان پر غشی طاری ہوگئی ہے۔''

''ہونہہ غشی......!'' قاسم بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ ''ان پر غشی طاری ہوگی۔''

''کیوں؟ کیا یہ آدمی نہیں ہیں۔''

''ہوں گے...... لیکن ان دونوں پر کچھ بھی طاری واری نہیں ہوتا۔''

''دوسرا کون......؟''

''قرنل فریدی......!''

''پتا نہیں کیا کہہ رہے ہو۔''

''کچھ بھی نہیں...... بن رہا ہے برادران......!'' قاسم نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے۔

''اگر یہ بیہوش ہوگئے ہیں تو اٹھا کر آگ کے قریب لے چلنا پڑے گا۔''

''تو پھر اٹھاؤ۔'' قاسم نے کہا۔

''میں اٹھاؤں۔'' اُس نے حیرت سے کہا۔

''میں تو جھک نہیں سکتا۔ تم اٹھا کر میرے ہاتھوں پر رکھ دو...... جہاں کہو گی پھینک آؤں غا۔''

''آخر تم اتنی بے دردی سے باتیں کیوں کرتے ہو۔''

''یہ خود ہی کون سا بڑا دردا ہے میرے لئے۔''

''انہوں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا۔''

''تم طرف داری قیوں کررہی ہو۔''

''زخمی ہیں...... اور ہمدرد آدمی ہیں۔''

''خدا قرے میں بھی زخمی ہو جاؤں''

''سچ کہتی ہوں...... تمہاری ایک بات بھی میری سمجھ میں نہیں آتی۔''

''اس کی سب سمجھ میں آجاتی ہیں۔ میں قہتا ہوں پچھتاؤ گی۔''

وہ جھلا کر آگے بڑھی اور خود ہی اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ ادھر قاسم بے چین ہو کر بولا۔ ''ارے ارے...... جرورت ہی قیا ہے۔ یہیں آگ جلا دو۔''

"کھلے میں آگ جلائی تو گولیوں سے چھلنی ہو کر رہ جائیں گے۔"

"بڑی مشکل ہے۔" قاسم نے کہا اور اُس کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے جب اُس نے دیکھا کہ وہ اُس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے۔

"اب تو اٹھ جاؤ سالے۔" وہ دانت پر دانت جما کر آہستہ سے بولا۔ "اب تو ارمان پورا ہوغیا۔"

"کیا ئیں...... ہائیں۔" حمید منمنایا تھا لیکن زلیخا نے اُسے سیدھا کھڑا کیا اور اُس کا ایک ہاتھ اپنے شانوں پر رکھ کر اور کمر میں اپنا ہاتھ دے کر درے کی طرف لے چلی۔ وہ پوری طرح ہوشیار نہیں تھا۔ چال میں لڑکھڑاہٹ تھی اور جسم جھولا جا رہا تھا۔

قاسم دھپ سے بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ پیٹنے لگا۔ زلیخا ایسی پوزیشن میں تھی کہ مڑ کر اسے دیکھ نہیں سکتی تھی۔ بس سینہ کوبی کی آوازیں سنتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی تھی۔ ویسے وہ قطعی نہیں سمجھ سکی تھی کہ آوازیں کیسی ہیں اور قاسم کیا کر رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ پلٹ آئی۔ قاسم اُسی طرح بیٹھا اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ رہا تھا۔

"تم بھی اُٹھو...... ورنہ نمونیہ ہو جائے گا۔" اُس نے کہا۔

"آں......!" قاسم چونک پڑا۔ "قیا ہے؟"

"میں نے کہا...... یہاں سے اُٹھو ورنہ بیمار پڑ جاؤ گے۔ سردی بڑھ گئی ہے۔"

"نہیں...... مجھے مر جانے دو۔" قاسم گلوگیر آواز میں بولا۔

"ارے سنو...... میں نے تمہارے لئے ایک روٹی بچالی تھی۔"

"روٹی کی بات نہیں ہے۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"قچھ نہیں...... میں یہیں مر جاؤں غا......!"

"تنہا نہیں مرو گے۔" زلیخا جھنجھلا کر بولی۔ "ہماری زندگیاں بھی خطرے میں ڈالو گے۔"

"جاؤ آگ کے پاس بیٹھو، تم نہیں مرو گی۔"

"تم کیوں نہیں بیٹھو گے۔"

"وہ سالا ڈرامہ کر رہا ہے...... میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو...... وہ سچ مچ غشی کی حالت میں ہیں۔"

"غشی......!" قاسم زہریلی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ "نہ وہ دونوں مر سکتے ہیں اور نہ بیہوش ہو سکتے ہیں۔"

"کون دونوں......؟"

"کرنل فریدی اور کیپٹن حمید......!"

"کیا کہہ رہے ہو۔" وہ اُس کے قریب بیٹھتی ہوئی بولی۔ "یہ دونوں کون ہیں۔"

"تم نہیں جانتیں۔"

"میں نے یہ نام اُن لوگوں کے بارے میں سنے ہیں جنہوں نے سرخاب ویلی میں ڈاکٹر ٹسڈل کے زیر زمین کارخانے کا پتا لگایا تھا۔"

"میں انہی کی بات قر رہا ہوں...... وہ جو ڈرامہ کر رہا ہے...... کیپٹن حمید ہے لونڈیوں کی جان قا دشمن۔"

"خدا کی پناہ...... تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔"

"تم قیا کرتیں۔"

"اتنی بے تکلفی سے تو نہ پیش آتی۔ اُن کی عزت کرتی۔"

"میں واقعی بالکل چغد ہوں۔"

"کیا مطلب......؟"

"میں نے تمہیں قیوں بتا دیا۔ ڈاکٹر ٹسڈل نے مجھے بھی پکڑ کر ڈپٹی کمشنر بنا دیا تھا اور میں نے اُس کے ایک دیوزاد کو اٹھا کر پٹخ دیا تھا۔"

"ضرور پٹخ دیا ہوگا۔ ہاں میں نے سنا تھا کہ اُنکے ساتھ بھی ایک دیوزاد تھا۔ تو وہ تم ہی تھے۔"

"الاقسم میں ہی تھا۔" قاسم بے حد خوش ہو کر بولا۔

"اچھا تو اب اُٹھ چلو ورنہ سردی تمہیں اٹھا کر پٹخ دے گی۔"

"تم قہتی ہو تو چلا چلتا ہوں......!" قاسم کراہتا ہوا اٹھا اور اُس کے ساتھ درے کی طرف روانہ ہو گیا۔

حمید بے سدھ پڑا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ قاسم نے روشنی میں اُس کا چہرہ

دیکھا تو سچ مچ تشویش میں مبتلا ہوگیا۔

''بیہوش ہی معلوم ہوتا ہے۔ مکاری نہیں قر رہا۔'' اُس نے کہا۔

''مکاری کیوں کرنے لگے۔''

''تم نہیں سمجھ سکتیں۔''

''بس ختم کرو...... ذرا دیکھو بخار تو نہیں ہے۔''

قاسم نے حمید کے گالوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھا اور سر ہلا کر بولا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو...... یہ تو بھنا جا رہا ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے لئے کیا کروں...... اگر ایسی حالت میں انہوں نے ہمیں آلیا تو کیا ہوگا۔''

''ہم دونوں مقابلہ کریں گے۔'' قاسم چھاتی ٹھونک کر بولا۔

''لیکن ہم دونوں اتنے عقلمند نہیں ہیں جتنے یہ ہیں۔''

''رائفل عقل سے نہیں کارتوس سے چلتی ہے۔''

''اگر اُن کے ساتھ کتے بھی ہوئے تو۔''

''ٹانگیں چیر کر پھینک دوں گا سالوں کی۔''

''خاموش رہو۔'' وہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر آہستہ سے بولی اور قاسم اُلوؤں کی طرح دیدے نچا کر رہ گیا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کچھ سننے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر رائفل اٹھائی تھی اور قاسم کو وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کرکے درے سے نکل گئی تھی۔ قاسم احمقانہ انداز میں نکاسی کے راستے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر یک بیک چونک کر اُس نے بھی رائفل کاندھے سے اُتاری تھی لیکن ٹھیک اسی وقت زلیخا درے میں داخل ہوئی۔

''قیا بات ہے۔'' قاسم اُس کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

''کچھ بھی نہیں...... شائد سماعت کا دھوکا تھا۔''

''کا ہے کا دھوکا۔''

''مطلب یہ کہ مجھے وہم ہوا تھا۔ میں سمجھی شائد کوئی ادھر آ رہا ہے۔''

کرنل فریدی ناصر کا منتظر تھا۔ اُس نے اُسے وکٹوریہ گارڈن میں بلایا تھا۔ خود عظمت محل نہیں جانا چاہتا تھا اور نہ گلریز میں اُس سے ملنا چاہتا تھا۔ فون پر بات ہوئی تھی اور ناصر نے وعدہ کیا تھا کہ ٹھیک پانچ بجے شام کو وکٹوریہ گارڈن میں پہنچ جائے گا۔ غالباً اس میں ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں ہوئی تھی۔ دونوں بڑی خوش دلی سے ملے تھے اور ناصر نے چھوٹتے ہی حمید اور قاسم کے بارے میں پوچھا تھا۔

''ابھی تک اُن کا سراغ نہیں مل سکا۔'' فریدی نے پُرتفکر لہجے میں کہا۔

''دشواری یہ ہے کہ ابھی تک خان اعظم سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہیں۔ میں نے ساری شکارگاہیں بھی دیکھ ڈالیں۔''

''قتلو خان کے علاوہ اور کوئی بھی اُن کی مصروفیات سے واقف نہیں ہوتا۔'' ناصر نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

''اُس نے کہا تھا کہ کسی شکارگاہ میں ہوں گے۔''

''خدا ہی جانے......!'' ناصر بولا۔ ''ویسے کبھی کبھی وہ سرخاب ویلی سے باہر بھی جاتے رہتے ہیں لیکن اُس کا بھی قتلو خان کے علاوہ اور کسی کو علم نہیں ہوتا۔''

''دو ماہ قبل جب شاہدہ وہاں گئی تھی تو کیا خان اعظم محل میں موجود تھے۔''

''موجود تھے۔ لیکن شائد تین دن بعد وہاں سے چلے گئے تھے۔ تیاری شکار ہی کی ہوئی تھی اور جب تک وہ وہاں مقیم رہی تھی اُن کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔''

''تو گویا اُسی وقت سے وہ کسی شکارگاہ میں ہیں۔''

''اگر وہاں نہیں ہیں تو کہیں باہر چلے گئے ہوں گے۔'' ناصر نے پُرتفکر لہجے میں کہا۔

''آج اگر آپ کی کال نہ آتی تو میں خود ہی ملنے کی کوشش کرتا۔''

''کوئی خاص بات۔''

''ممی آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔''

''اُوہ......ضرور......ابھی چلو۔''

''وہ بہت زیادہ پریشان نظر آتی رہی ہیں ان دنوں۔''

فریدی کچھ نہ بولا۔

''شائد انہوں نے آپ سے کچھ کہنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' ناصر کچھ دیر بعد بولا۔

''اگر یہ خان اعظم سے متعلق کوئی بات ہے تو یہ سب کے حق میں بہتر ہوگا۔''

''لیکن آپ نے مجھے کیوں طلب کیا تھا۔''

''یہی معلوم کرنے کیلئے کہ دو ماہ قبل شاہدہ اور خان اعظم کی ملاقات ہوئی تھی یا نہیں۔''

''آپ خود اُسی سے پوچھ لیجئے گا؟ میری یادداشت کے مطابق تو وہ اُس دوران میں وہاں موجود تھے۔''

''تم نے اُس ٹیپ ریکارڈر کے بارے میں خانم کو کیا بتایا تھا۔''

''سچی بات بتا دی تھی۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ ورنہ وہ یہی سمجھتیں کہ میں دیدہ دانستہ شاہدہ کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ میں سمجھا تھا کہ وہ اس پر بھی بے حد خفا ہوں گی لیکن انہوں نے خلاف توقع سکوت اختیار کیا تھا اور پھر کل میں نے اُن پھوپھی کا ذکر چھیڑ دیا جن کے بارے میں آپ نے مجھے بتایا تھا۔ اس پر وہ متحیر رہ گئیں۔ اُن کی دانست میں پھوپھی کی اسی عجیب وغریب بیماری کا علم خاندان کے چند افراد کے علاوہ اور کسی کو نہیں تھا۔ بچوں تک تو یہ بات پہنچی ہی نہیں تھی۔ تب پھر میں نے انہیں بتا دیا کہ اُس کا علم مجھے آپ سے ہوا تھا۔''

''خوب......!'' فریدی مسکرا کر بولا۔ ''اور اس کے بعد ہی انہوں نے مجھ سے ملنے پر اصرار کیا ہوگا۔''

''جی ہاں! یہی بات ہے۔''

''اچھا تو پھر چلو۔''

کچھ دیر بعد اُن کی گاڑیاں عظمت محل کی طرف روانہ ہوگئی تھیں۔ خانم نے اس بار فریدی کا استقبال خندہ پیشانی سے کیا تھا۔

''میں تم سے بہت شرمندہ ہوں کمال میاں۔'' انہوں نے کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو بڑی بہن سمجھتا ہوں۔''

''تمہارے باپ میرے مائیکے میں خاندان ہی کے ایک فرد سمجھے جاتے تھے۔''

''مجھے علم ہے۔''

''تم اب جاسکتے ہو۔'' خانم نے ناصر کی طرف مڑ کر کہا۔ وہ چپ چاپ اٹھا اور دیوان خانے سے چلا گیا۔

''سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ حمید اور قاسم ملے یا نہیں۔''

''ابھی تک تو نہیں ملے۔ تلاش جاری ہے۔''

''مجھے ڈر ہے کہ کہیں ہماری پشت پناہی کرنے کے سلسلے میں مارے نہ گئے ہوں۔''

''تو آپ کا بھی یہی خیال ہے کہ خان اعظم......!''

''تمہیں واقعات کا علم نہیں ہے۔'' خانم اُس کی بات کاٹ کر بولیں۔

''میں نے ناصر اور شاہدہ دونوں سے چھپائے رکھا تھا۔ لیکن اب اُس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ مجھے بھی اپنے ہمدردوں کی تلاش ہو۔''

''میں کسی معاملے میں پیچھے نہیں رہوں گا۔ آپ مجھ پر اعتماد کرسکتی ہیں۔''

''آج سے ڈیڑھ ماہ پہلے کی بات ہے کہ خان نے شاہدہ کا رشتہ قتلو خان کیلئے مانگا تھا۔''

''قتلو خان کے لئے......!'' فریدی چونک پڑا۔

''ہاں......تم خود سوچو......میرے ذہن کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ قتلو خان کی دو بیویاں پہلے سے موجود ہیں اور وہ قطعی اس قابل نہیں ہے کہ اسے منہ بھی لگایا جائے۔ چہ جائیکہ رشتہ دینا۔ اگر ناصر کو یہ بات معلوم ہوجائے تو چچا پر رائفل تان کر کھڑا ہوجائے گا۔''

''قدرتی بات ہے۔ لیکن کیا خان نے اس سلسلے میں براہِ راست گفتگو کی تھی۔''

''نہیں قاصد اُن کا خط لایا تھا۔''

''پھر آپ نے کیا جواب دیا۔''

''میں نے اُسی قاصد کے ہاتھ انکار کا خط بھجوایا تھا۔ اُس کے بعد ہی سے ہمیں خوفزدہ کرنے کی کوشش کی جانے لگی تھی۔''

اور پھر خانم نے ریسٹ ہاؤز والے واقعات اپنے طور پر دہراتے ہوئے کہا۔ ''اس

طرح واضح طور پر اعلان جنگ کردیا ناصر کے چچا نے۔ بہرحال کیپٹن حمید نے ہمارا ساتھ دینے کی کوشش کی تھی۔''

''میں تصور بھی نہیں کرسکتا کہ خان اعظم اس حد تک گر جائیں گے۔''

''قلو کے لئے وہ سب کچھ کرسکتے ہیں۔''

''تو شاہدہ کی بیماری کا سلسلہ پیغام آنے سے پہلے شروع ہوا تھا یا بعد میں۔''

''پہلے ہی۔ وہ چند دنوں کے لئے خان کے دیہی محل میں گئی تھی۔ وہاں سے واپسی پر ایک رات دورہ پڑا تھا بلی کی آواز سن کر اور پھر اُس کے کچھ دنوں بعد خان کا قاصد رشتہ لے کر آیا تھا۔''

فریدی خاموش ہوکر کچھ سوچنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر بعد خانم بولیں۔ ''روشن زمانی بیگم کے اس پُراسرار مرض کے بارے میں تم اور کیا جانتے ہو۔''

''بس اتنا ہی جتنا ناصر میاں کو بتا چکا ہوں۔''

خانم طویل سانس لے کر رہ گئیں۔

''کیا آپ اس سلسلے میں کچھ اور بھی جانتی ہیں۔'' فریدی انہیں غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

''میں......نہیں تو......ناصر کے باپ نے مجھے اس سے زیادہ نہیں بتایا تھا۔ لیکن...... لیکن میں نے ہمیشہ یہی محسوس کیا تھا جیسے انہوں نے مجھے پوری بات نہ بتائی ہو۔''

''خیر......اب یہ بتایئے کہ میں کیا خدمت کرسکتا ہوں۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تم کیا کرسکو گے۔ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے۔''

''شائد کچھ کرہی سکوں! اگر روشن زمانی خانم سے متعلق تفصیل سے معلوم ہوسکے تو ممکن ہے آپ کی دشواریوں کا حل بھی نکل آئے۔''

''افسوس کہ میں اس سے زیادہ نہیں جانتی۔ شاہدہ کے بارے میں ڈاکٹر نجیب کا کہنا ہے وہ کسی واقعے سے دہشت زدہ ہوکر اُسی واقعے کو بھول گئی ہے۔ بلی کی آواز سن کر ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوتی ہے اور بیہوش ہوجاتی ہے۔'' خانم نے کہا۔

''بالکل نہیں بھولیں۔ ورنہ صرف بلی کی آواز ہی کیوں۔''

''میں نہیں سمجھی۔''

''بلی کی آواز اُسی واقعے کا ایک جزو ہوسکتی ہے۔ بلی کی آواز سن کر وہ اُس واقعے کو یاد کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور ذہنی ہیجان میں مبتلا ہوکر بیہوش ہوجاتی ہیں۔''

''اللہ ہی بہتر جانے......ڈاکٹر نجیب نے بھی ناصر سے کچھ ایسی ہی باتیں کہی تھیں۔''

''کیا آپ مجھے شاہدہ سے تنہائی میں گفتگو کرنے کی اجازت دیں گے۔''

''وہ اس وقت موجود نہیں ہے۔''

''پھر کسی وقت سہی۔ یہ بہت ضروری ہے۔ ویسے آپ مطمئن رہئے۔ آپ کا راز میری ذات سے آگے نہیں بڑھے گا۔''

''میں مطمئن ہوں کمال میاں اور پھر یہ راز راز نہیں رہا۔ پتہ نہیں کس طرح یہ بات بہتیرے اعزہ تک پہنچ گئی ہے۔''

''غالباً اُسی کے توسط سے پہنچی ہوگی جو اس کا ذمہ دار ہے۔ وہ یہی تو چاہے گا کہ شاہدہ کی شادی کی بات کہیں اور نہ ہوسکے۔ ورنہ اُسکا پیغام اس مرض کی ابتداء سے پہلے آنا چاہئے تھا۔''

''خدا جانے۔''

''بہرحال میں دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا کرسکتا ہوں۔''

''شاہدہ سے کیا پوچھو گے۔''

''صرف خان اعظم کے متعلق باتیں ہوں گی۔ اُن کے مرض کا حوالہ تک نہیں ہوگا۔ آپ مطمئن رہئے۔''

فریدی وہاں سے روانہ ہوکر ہوٹل گلریز پہنچا تھا اور گاڑی پارک کرکے بالائی منزل پر جانے کے لئے زینے طے کرنے لگا تھا۔ اچانک پورے ہوٹل کی روشنی غائب ہوگئی۔ وہ اس وقت پانچویں زینے پر تھا۔ ریلنگ پر ہاتھ ٹیک کر بائیں جانب کود گیا۔ ساتھ ہی بغلی ہولسٹر سے ریوالور بھی نکال لیا تھا۔

ڈائننگ ہال میں افراتفری مچ گئی۔ بھانت بھانت کی آوازیں اندھیرے میں گونجنے لگی تھیں۔ پھر ایک منٹ کے اندر ہی اندر دوبارہ روشنی بھی ہوگئی تھی۔ فریدی نے بڑی پھرتی سے ریوالور کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

اُس نے خطرے کی بو سونگھی تھی اور قبل اس کے کہ وہ دوبارہ زینوں کی طرف بڑھتا یہ

معلوم ہوگیا کہ روشنی کیوں غائب ہوئی تھی۔ کسی نے مین سوئچ آف کیا تھا اور ہوٹل کے عملے نے اُسے پکڑ بھی لیا تھا۔ سپروائزر لپکتا ہوا صدر دروازے کی طرف بڑھا۔ فریدی اُس کے پیچھے تھا۔ پہلے وہ سمجھا تھا شائد زینوں پر کسی حملہ آور سے مڈبھیڑ ہوگی۔ لیکن تاریکی کے وقفے میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہوا تھا۔

برآمدے میں کچھ لوگ نظر آئے۔ جنہوں نے کسی کو گھیر رکھا تھا اور پھر جب فریدی نے اُس کی شکل دیکھی تو ذہن کے کسی گوشے میں شناسائی کی لہریں متحرک ہوگئیں۔ اُس نے اُسے آج ہی ڈیرہ غزن خان میں دیکھا تھا۔ قلو خان کی حویلی میں نظر آنے والی بھیڑ میں وہ بھی شامل تھا جیسے ہی اُس کی نظر فریدی پر پڑی اُس نے گھیرا توڑ کر نکل جانے کی کوشش کی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں فریدی کا ہاتھ اُس کے گریبان تک پہنچ چکا تھا۔ بھیڑ کائی کی طرف پھٹ گئی اور سپروائزر حیرت سے پلکیں جھپکانے لگا۔ وہ اُس کی شخصیت سے واقف تھا۔

''اسے کہیں الگ لے چلو'' فریدی نے سپروائزر سے کہا۔ ''اور یہاں سے بھیڑ ہٹاؤ۔''

اُس نے نکل بھاگنے کے لئے جدوجہد تیز کردی تھی۔ لیکن فریدی کی گرفت سے نکل جانا آسان نہیں تھا۔ اُسے سپروائزر کے کمرے میں لایا گیا۔ فریدی نے اُس کا ہاتھ مروڑ کر اُسے دیوار سے لگ کر کھڑے ہوجانے پر مجبور کردیا اور سپروائزر کو جامہ تلاشی لینے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جلدی کرو۔''

اُس کے پاس سے ایک خنجر برآمد ہوا تھا۔

''میرے کمرے میں کتنے آدمی داخل ہوئے ہیں۔'' فریدی نے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے جانے دو۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔''

''اگر میں تمہیں پہچانتا نہ ہوتا تو ضرور باور کرلیتا۔''

اُس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے۔

''جلدی...... ورنہ یہاں سے سیدھے ہسپتال پہنچو گے۔''

وہ پھر بھی خاموش رہا۔ اس بار فریدی کا الٹا ہاتھ اُسکے منہ پر پڑا تھا۔ لڑکھڑا کر سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ گھونسہ پیٹ پر پڑا اور وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبائے ہوئے دوہرا ہوگیا۔

فریدی نے اُس کے بال مٹھی میں جکڑے اور ایک جھٹکے کے ساتھ سیدھا کردیا۔

''ب...... بتاتا ہوں......!'' وہ ہانپتا ہوا بولا۔

''جلدی! میرے پاس وقت نہیں ہے۔''

''دو...... دو آدمی۔''

''اُن کے پاس ریوالور ہیں یا خنجر۔''

''خنجر......!''

''اس کے ہاتھ پیر باندھ کر یہیں ڈال دو'' فریدی نے سپروائزر سے کہا۔

''میں نے بتا تو دیا اب مجھے جانے دو۔'' وہ آدمی ہانپتا ہوا بولا۔

''واپس گئے تو نذر گل ہی کی طرح دفن کردیئے جاؤ گے۔ اس معاملے میں زیادہ سے زیادہ چھ ماہ کی سزا ہوگی۔''

وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

سپروائزر نے دروازہ کھول کر اپنے آدمیوں کو آوازیں دی تھیں اور وہ ذرا ہی سی دیر میں باندھ کر ڈال دیا گیا تھا۔

''کیا قصہ ہے جناب......!'' سپروائزر نے فریدی سے پوچھا۔

''میرے قتل کی سازش۔''

''خدا کی پناہ۔''

پھر فریدی نے وہیں سے پولیس فورس کے مقامی ہیڈ کوارٹر کو فون کیا تھا۔ پندرہ منٹ کے اندر اندر ہی ہومی سائیڈ اسکواڈ وہاں پہنچ گیا تھا۔ جو سات مسلح افراد پر مشتمل تھا اور جس کی قیادت خود ایس پی ہومی سائیڈ نے کی تھی۔

وہ دونوں فریدی کے کمرے سے برآمد کرلئے گئے۔ اُن کے پاس سے خنجر بھی برآمد ہوئے تھے اور ریوالور بھی۔

''صمد خان...... میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔'' ایس پی ہومی سائیڈ نے اُن میں سے ایک کو مخاطب کیا۔

صمد خان کچھ نہ بولا۔ سر جھکائے کھڑا رہا۔

''اسے یہیں میرے پاس چھوڑ دیجئے۔'' فریدی نے ایس پی سے کہا۔ ''اور دوسرے کو

لے جائیے۔ یہ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ خان اعظم حکومت سے بھی ٹکر لے سکتے
اور ہاں ......ایک آدمی سپروائزر کے کمرے میں بھی ہے۔"

ایس پی نے دو مسلح آدمی فریدی کے کمرے کے باہر چھوڑے تھے اور قیدی کو لے کر گیا تھا۔

"تو تمہارا نام صمد خان ہے۔ غالباً قتلو خان کے معتمد ہو۔" فریدی نے صمد خا گھورتے ہوئے کہا۔ لیکن وہ کچھ نہ بولا۔

"بہر حال تم نے دیکھ لیا کہ خان اعظم اور قتلو خان کتنے بااثر ہیں۔" فریدی نے کہا۔

"آپ نے مجھے یہاں کیوں روکا ہے۔" صمد خان نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"مجھے یقین ہے کہ تم میرے دونوں آدمیوں کے بارے میں صحیح اطلاع دے سکو گے۔

"میں کچھ نہیں جانتا۔"

"کیا تم سڑک پر ذلیل ہونا چاہتے ہو...... میرا خیال ہے کہ ایس پی ہی کی طرح تم اور لوگ بھی پہچانتے ہوں گے۔"

صمد خان نے جھرجھری سی لی اور بولا۔ "اب وہ ہمارے قبضے میں نہیں ہیں۔ ج رکھے گئے تھے وہاں سے فرار ہوگئے۔ پھر ایک جگہ گھیرے گئے لیکن ہمارے دو آدمیوں کو کر کے وہاں سے بھی نکل گئے۔"

"دونوں جگہوں کی نشاندہی کرو۔"

اُس نے تب بتانا شروع ہی کیا تھا کہ فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "یوں نہیں۔"

وہ اٹھا تھا اور ایک کپ بورڈ سے ایک نقشہ نکال کر میز پر پھیلا دیا تھا۔

"عمارت اور اُس جگہ کا تعین کرو۔"

صمد خان نے دو جگہ پنسل سے نشانات لگائے تھے اور بولا تھا۔ "اب میرا کیا ہوگا۔"

"میں تمہیں اپنی فتح کی علامت کے طور پر واپس بھی بھیج سکتا ہوں لیکن تمہارا انجام نذر گل ہی کا سا ہوگا۔"

"اس میں کوئی شک نہیں۔"

"بس تو پھر فی الحال جیل چلے جاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ وعدہ معاف گواہ کی حیثیت

سے تمہیں رہائی دلا دوں گا۔"

"شش......شکریہ۔" صمد خان طویل سانس لے کر بولا۔ "ایک بات اور ہے۔ علاقے سے نکاسی کے راستے کی سخت ترین ناکہ بندی کر دی گئی ہے۔ اس لئے آپ کے آدمی راکیل کے آس پاس ہی بھٹک رہے ہوں گے۔"

"میں دیکھوں گا...... ہاں! خان اعظم سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے۔"

"اگر محل میں نہیں ہیں تو قتلو خان کے علاوہ اور کوئی بھی اُن کی نشاندہی نہ کر سکے گا۔" صمد خان نے کہا۔

"اُس نے کہا تھا کہ وہ کسی شکار گاہ میں ہوں گے۔ لیکن ساری شکار گاہیں چھان ڈالی گئیں۔"

"بس تو پھر وہ بتانا ہی نہیں چاہتا۔"

"خیر دیکھا جائے گا۔"

"آپ کے آدمیوں کے ساتھ ایک عورت بھی ہے۔ اچھی گواہ ثابت ہوگی۔" صمد خان نے کہا اور اُسے زلیخا کے بارے میں بتانے لگا۔

"درندگی کی انتہا ہے۔" فریدی ناخوشگوار لہجے میں بولا تھا۔ "خیر اب وقت آ گیا ہے کہ اس فتنے کا سر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کچل دیا جائے۔"

صبح ہوتے ہوتے انہوں نے فائروں کی آوازیں سنی تھیں اور سنبھل کر بیٹھ گئے تھے۔ حمید اب پوری طرح ہوش میں تھا۔ زلیخا نے درے سے باہر نکلنا چاہا لیکن اُس نے اُسے روکتے ہوئے کہا۔ "آوازیں دور کی ہیں۔ چین سے بیٹھی رہو۔"

"کیا وہ آپس ہی میں لڑ گئے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے ہمارے آدمی ہوں۔" حمید بولا۔

''ان قے آدمی۔'' قاسم طنزیہ انداز میں ہنس کر رہ گیا۔ حمید نے اُسے گھور کر دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔

''کیا وہ آپس میں بھی لڑ جاتے ہیں۔'' حمید نے کچھ دیر بعد زلیخا سے پوچھا۔ فائرنگ کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔

''کبھی سنا نہیں۔''

''اے یہ ٹھائیں ٹھوئیں ہوتی رہی تو آگے قیسے بڑھیں گے۔'' قاسم بولا۔

''نہیں بڑھیں گے۔ یہیں پڑے رہیں گے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم نے اتنی بلندی پر پناہ لی ہوگی۔''

''بس سب قچھ تم ہی سوچ سکتے ہو۔'' قاسم ہاتھ نچا کر بولا۔

''کیا تمہارا بولنا ضروری ہے۔'' زلیخا نے کہا۔

''تم قہتی ہو تو نہیں بولوں غا...... چاہے جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔''

کچھ دیر خاموشی رہی پھر زلیخا نے حمید سے کہا۔ ''میں آپ سے معافی چاہتی ہوں جناب۔ نادانستگی میں بعض گستاخیاں بھی کر چکی ہوں۔''

''ارے ارے...... ہائیں...... یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔''

''آپ کی شخصیت سے واقف نہیں تھی۔''

حمید نے قہر آلود نظروں سے قاسم کی طرف دیکھا۔ جو سر جھکائے شرارت آمیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔

''اُن پر ناراض نہ ہوں۔ آخر چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہمارے دشمن تو جانتے ہی ہوں گے کہ آپ کون ہیں۔''

''نہ جانتے ہوتے تو اتنی تگ و دو کیوں کرتے۔''

''پتا نہیں...... نذر گل کو کس مہم پر روانہ کیا گیا تھا کہ افشائے راز کے ڈر سے انہیں اس حد تک جانا پڑا۔ ورنہ یہ لوگ تو پولیس والوں سے میلوں دور رہتے ہیں۔''

''میں بھی یہی سوچتا رہا ہوں۔''

''اجاجت ہے قچھ بولنے قی۔''

''فرمائیے...... فرمائیے......!'' حمید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تم سے نہیں پوچھا تھا۔'' قاسم بھنا کر بولا۔

''مجھ سے پوچھا تھا؟'' زلیخا نے ہنس کر سوال کیا۔

''جی غاں......!''

''کہو...... کیا کہہ رہے تھے۔''

''بھول غیا......!'' قاسم نے کہہ کر رائفل اٹھائی تھی اور خود بھی اٹھنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔

''کہاں چلے۔'' حمید کے لہجے میں حیرت تھی۔

''میں بھی فائر کروں گا۔''

''دماغ تو نہیں چل گیا...... بیٹھو۔''

''ارے واہ...... قیا تمہارا حکم چلتا ہے مجھ پر......!'' اُس نے دھانے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''تم روکو...... میری نہیں سنے گا۔'' حمید نے آہستہ آہستہ سے زلیخا کو مخاطب کیا۔

''قاسم صاحب! واپس آئیے۔'' زلیخا نے کہا اور قاسم کے قدم رک گئے۔

''آپ قہتی ہیں تو نہیں جاؤں غا......!'' وہ بڑی سعادت مندی سے بولا اور پھر اُن ہی کی طرف پلٹ آیا۔

''مجھے تو اب یہ کئی طرف کی آوازیں معلوم ہو رہی ہیں......!'' حمید نے کہا اور اٹھ کر دہانے کی طرف بڑھا۔

''آپ کہاں چلے۔'' زلیخا بولی۔

''اپنے اندازے کی تصدیق کروں گا۔''

''قرنے دو...... قرنے دو۔'' قاسم سر ہلا کر بولا۔ ''میں بیچارہ تو قچھ بھی نہیں کر سکتا۔''

''آپ ہی نے تو سب کچھ کیا ہے۔'' زلیخا نے کہا۔ ''نہ آپ کو غصہ آتا اور نہ ہمیں رہائی نصیب ہوتی۔''

''بہت بُرا کیا تھا میں نے۔ آرام سے بندھے کھڑے ہوئے تھے۔ اب دھکے کھاتے پھر رہے ہیں۔''

"کمال ہے۔ یہ آپ کہہ رہے ہیں۔"

"ہاں میں کہہ رہا ہوں...... پہلے میں تھا اور اب وہ ہیں۔"

"میں نہیں سمجھی۔"

"کچھ نہیں...... کچھ بھی نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔ میرا مقدر ہی خراب ہے۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

قاسم کچھ نہ بولا۔ شائد اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے کس طرح کہے۔

اتنے میں حمید پلٹ آیا اور بولا۔ "میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ فائروں کی آوازیں کئی اطراف سے آ رہی ہیں۔ شائد نکاسی کے راستوں کی ناکہ بندی توڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔"

"اے جاؤ...... بس بیٹھے ہوائی قلعے بنایا قرو......!" قاسم نے ہاتھ نچا کر کہا۔

"تم پھر بولے۔"

"جرور بولوں غا...... میں بھی منہ میں جبان رکھتا ہوں۔"

"بیٹے بھوکوں مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ...... پھر کھولنا زبان۔"

"مر جاؤں غا...... تم کاندھا نہ دینا جنازے کو۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ورنہ کاندھا بھی تمہارے ہی ساتھ جائے گا۔"

"بھئی...... ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ سرخاب ویلی پہنچنے کی سوچئے۔" زلیخا نے کہا۔

حمید جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ عجیب طرح کی آواز سنائی دی۔

"یہ کیسی آواز تھی......!" وہ چاروں طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"تمہاری ایسی کی تیسی کی آواز تھی۔" قاسم نے بھنا کر کہا اور زلیخا ہنسنے لگی۔ قاسم کے پیٹ کی قراقر خاصے فاصلے سے بھی سنی جا سکتی تھی۔

"شائد کچی پکی خوبانیاں بول رہی ہیں۔" حمید نے کہا۔

"بس...... جبان بند...... ورنہ اٹھا کر پٹخ دوں غا۔" قاسم آپے سے باہر ہو گیا۔

"بھئی خدا کے لئے آپ لوگ لڑائی جھگڑا ختم کر کے کوئی ڈھنگ کی بات سوچئے۔ کب [illegible]ح بھٹکتے پھریں گے۔" زلیخا نے کہا۔

"فی الحال آگے بڑھنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ پتا نہیں کس طرف کی گولیاں [illegible]

جائیں۔" حمید بولا۔

"تم بیٹھے رہو۔ ہم تو جائیں غے۔" قاسم نے کہا۔

"ہم سے کیا مراد ہے۔"

"ہم دونوں...... کیوں آپ چلیں گی نا میرے ساتھ۔"

"آپ سے چلا بھی جاتا ہے۔" حمید بولا۔

"تم مت بولو...... تم سے بات نہیں قر رہا۔"

"چچ...... چچ...... چپاتی۔"

"ارے ہی ہی ہی......!" قاسم زور سے ہنس پڑا اور بولا۔ "میں تو مذاق قر رہا تھا۔"

"کیا بات ہوئی...... چچ...... چچ...... چپاتی......!" زلیخا نے حیرت سے کہا۔

"کچھ نہیں۔" قاسم شور مچانے والے انداز میں بولا۔ "بھوک لگ رہی ہے نا حمید بھائی کو۔"

"بھائی بھی ہو گئے۔"

"بہت پرانا بھائی ہے...... قیوں حمید بھائی۔"

"اور کیا...... جب یہ بہت بولنے لگتا ہے تو میں اسکے منہ پر چپاتی باندھ دیتا ہوں۔"

"اب بس ختم قرو۔" قاسم ہاتھ اٹھا کر بولا۔

"بات بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔" زلیخا نے سر ہلا کر کہا۔

"چپاتی سمجھی نہیں کھائی جاتی ہے۔ اگر کسی خاتون کا نام چپاتی بیگم ہو تو کیسی رہے گی۔" حمید بولا۔

"تمہاری دم رہے گی۔ الاقسم رائفل ہے میرے ہاتھ میں۔"

"آپ لوگ مجھے کیوں الجھن میں ڈال رہے ہیں۔" زلیخا آہستہ سے بولی تھی۔

"قوئی الجھن کی بات نہیں ہے۔ بھلا چپاتی کی کیا الجھن......! حمید بھائی سالا کبھی کبھی سنک جاتا ہے۔"

"نہیں بتانا چاہتے تو میں مجبور بھی نہیں کروں گی۔"

"میں بتاتا ہوں۔" حمید جلدی سے بولا۔ "چپاتی کے نام پر اسے اپنی ایک خالہ یاد آ جاتی ہیں جن سے یہ بہت ڈرتا ہے۔"

"دیکھو......دیکھو......!" قاسم ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "جبان سنبھالو ورنہ پچھتاؤ گے...... خالہ ہوگی تمہاری۔"

"اچھا میں سمجھ گئی۔ کسی عورت کی بات ہے جسے آپ لوگ چپاتی بیگم کہتے ہیں۔"

"سمجھ جاؤ......میرے ٹھینگے سے۔" قاسم کو پھر غصہ آ گیا۔

"اُوہ......!" حمید ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "یہ آوازیں تو بہت قریب کی معلوم ہوتی ہیں۔ ہوشیار رہنا۔ ٹھہرو۔ مجھے دہانے کے قریب جانے دو۔"

"باہر مت نکلئے گا۔" زلیخا بولی۔

"فکر نہ کرو۔"

"فکر کرنے کے لئے تو یہ خود پیدا ہوئے ہیں۔" قاسم نے جل کر کہا۔

"خاموش رہو۔ کیا مرنے ہی کا ارادہ ہے۔" حمید کہتا ہوا دہانے کی طرف بڑھ گیا۔ زلیخا اور قاسم نے بھی اپنی رائفلیں سنبھال لی تھیں۔

"ارے۔" دفعتاً زلیخا چونک کر۔ "یہ تو کوئی لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے کچھ کہہ رہا ہے۔"

پھر وہ بھی تیزی سے دہانے کی طرف بڑھی تھی۔ قاسم بھی اٹھا۔ حمید کے قریب پہنچ کر دونوں رک گئے تھے۔

آواز آہستہ آہستہ قریب ہوتی جارہی تھی۔ حتیٰ کہ صاف سمجھ میں آنے لگی۔ کوئی لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے کہہ رہا تھا۔ "کیپٹن حمید پلیز...... پناہ گاہ سے باہر آجایئے......گھیرا توڑ دیا گیا ہے۔"

"یہ فریب بھی ہوسکتا ہے۔" حمید آہستہ سے بولا۔ "اور حقیقت بھی ہوسکتی ہے۔ اس لئے ہمیں مزید انتظار کرنا پڑے گا۔"

"سوال یہ ہے کہ انہیں ہمارے فرار کا حال کیسے معلوم ہوسکتا ہے۔" زلیخا بولی۔

"ممکن ہے قلو خان کا کوئی خاص آدمی پولیس کے ہاتھ لگ گیا ہو۔"

"امکان تو ہے لیکن فوری طور پر یقین کر لینے کو دل نہیں چاہتا۔" زلیخا نے کہا۔

"ذرا دیر صبر کرو......حقیقت ظاہر ہوجائے گی۔"

"کیپٹن حمید پلیز......سرچ پارٹی کالنگ......!" آواز پھر آئی۔

"کچھ کیجئے۔" زلیخا مضطربانہ انداز میں بولی۔ "اگر وہ یہاں سے گزر گئے تو پھر بڑی

دشواری ہوگی۔"

"اچھی بات ہے۔" حمید بولا۔ "میں جارہا ہوں۔ لیکن تم دونوں باہر قدم نہ نکالنا۔ بات بگڑنے کی صورت میں شائد تنہا میں خود کو بچالوں لیکن اگر تم دونوں بھی ساتھ ہوئے تو دشواری ہوگی۔"

وہ درے سے نکل گیا اور یہ دونوں حسب ہدایت وہیں ٹھہرے رہے۔ زلیخا کی آنکھوں سے گہری تشویش ظاہر ہورہی تھی۔ دفعتاً قاسم بولا۔ "اگر پولیس ہی ہوئی تو آپ قیا قریں گی۔"

"سوال کا مطلب ہی نہیں سمجھی۔"

"آپ اتنی ناسمجھ قیوں ہیں......کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا۔"

"قاسم صاحب......پلیز......کچھ دیر خاموش بھی رہئے۔"

"کھاموش ہی کھاموش ہیں......میری زندگی برباد ہوگئی۔"

"اچھی بات ہے۔ تو پھر کہتے رہئے۔ میں سمجھوں گی کہ ستار بج رہا ہے۔"

"نہیں کتا بھونک رہا ہے۔ مروت قیوں کرتی ہیں۔"

"قاسم بھائی رحم کیجئے۔"

"بلکہ اب تو جہنم ہی میں جایئے۔ قق قاسم بھائی......ی ی ی ی۔" قاسم نے کہا اور پتھر سے ٹیک لگا کر ہانپنے لگا۔

اتنے میں حمید نے واپس آکر اطلاع دی تھی کہ وہ فریب نہیں تھا۔ حقیقتاً پولیس پارٹی ہی تھی۔

"کرنل صاحب بھی ساتھ ہیں۔" اُس نے قاسم سے کہا۔

"ایک نہ شد دو شد......!" قاسم کا جواب تھا۔ وہ کسی تھکے ہوئے بیل کی طرح ڈکراتا ہوا اٹھ گیا۔

ناصر کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور چہرہ غصہ سے

سرخ ہو رہا تھا۔ پہلے سے اطلاع دیئے بغیر گلریز تک پہنچا تھا اور فریدی کے کمرے کے دروازے پر دستک دی تھی۔ محض اتفاق ہی تھا کہ فریدی سے ملاقات ہوگئی ورنہ اگر دو منٹ کی تاخیر سے بھی پہنچا ہوتا تو اُسے مایوسی ہی ہوتی۔ کیونکہ فریدی کہیں جانے کے لئے تیار تھا۔ اُس نے ناصر کا حلیہ دیکھا اور ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانے کے بعد نرم لہجے میں بولا۔ ''بیٹھ جاؤ......اپنے حواس مجتمع کرلو۔ پھر بات کرنا۔''

''انتہا ہوگئی۔'' وہ جھٹکے دار آواز میں کہتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔

فریدی باتھ روم سے گلاس میں پانی لایا تھا اور اُس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

ناصر نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کردیا اور کرسی کی پشت گاہ سے ٹک کر آنکھیں بند کرلیں۔

فریدی خاموش کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ ''کچھ سکون محسوس کررہے ہو۔''

''سکون کہاں۔'' ناصر آنکھیں کھولے بغیر بولا۔ ''ممی کے درس اخلاقیات نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔''

وہ ایک بار پھر طیش میں آ کر سیدھا ہو بیٹھا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ ''انہوں نے ڈرائیور کو مار ڈالا۔ شاہدہ غائب ہوگئی اور وہ اب بھی یہی کہے جارہی ہیں کہ رپورٹ درج کراتے وقت خان بابا سے جھگڑے کا حوالہ مت دینا۔''

''پوری بات بتاؤ......!'' فریدی دوسری کرسی کھینچ کر بیٹھتا ہوا بولا۔

''شاہدہ ایک سوشل گیدرنگ اٹینڈ کرنے جارہی تھی۔ راستے میں کسی نے ڈرائیور کو گولی ماردی اور شاہدہ غائب ہے۔''

''کیا گاڑی الٹ گئی تھی۔''

''نہیں......میرا خیال ہے گاڑی رکوائی گئی تھی۔ ڈرائیور نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی ہوگی۔''

''یہ واقعہ کہاں پیش آیا......؟''

جگہ کے بارے میں سن کر فریدی نے طویل سانس لی تھی۔

''سڑک کا وہ حصہ تو دور دور تک سنسان پڑا رہتا ہے۔'' اُس نے کہا۔

''میں نے تو رپورٹ درج کرائی ہے لیکن کسی کے خلاف شبہ نہیں ظاہر کرسکا۔ ورنہ خاندانی وقار خطرے میں پڑ جاتا......ہونہہ۔''

''فکر نہ کرو......میں نے خان کے محلات کی تلاشی کا وارنٹ حاصل کرلیا ہے۔''

ناصر نے اُس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا تھا جیسے کسی انہونی کی اطلاع ملی ہو۔

''ہاں......!'' فریدی سر ہلا کر بولا۔ ''حمید اور قاسم مل گئے ہیں اور قلتو خان کے خلاف اب میرے پاس اتنا مواد ہے کہ اُسے روپوش ہوجانا پڑا ہے۔''

''اور آپ نے تلاشی کا وارنٹ حاصل کرلیا ہے۔''

''ہاں......ہاں......تمہیں اس پر حیرت کیوں ہے۔ اس وقت میں فورس لے کر محلات کی تلاشی ہی کے لئے جارہا ہوں۔''

''یہ کیسے ہوگیا۔''

''قانون سے بالاتر نہیں ہیں خان اعظم......اس سے پہلے کسی نے انہیں یہ باور کرانے کی کوشش ہی نہیں کی۔''

''میرا خیال ہے کہ وہاں مزاحمت ہوگی۔''

''حمید اور قاسم کے سلسلے میں بھی بارہ آدمی پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنے ہیں۔ جہاں انہیں رکھا گیا تھا وہاں سے فرار ہوکر راکیل کے علاقے میں بھٹکتے پھر رہے تھے اور قلتو کے سپاہیوں نے نکاسی کے راستوں پر ناکہ بندی کررکھی تھی۔ لہٰذا اُسی ناکہ بندی کو توڑنے کے لئے پولیس کو طاقت استعمال کرنی پڑی۔''

''خدا کی پناہ......اتنا کچھ ہوچکا ہے۔'' ناصر نے کہا پھر چونک کر بولا۔ ''کیا میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں۔''

''اصولاً مناسب نہ ہوگا۔'' فریدی نے کہا۔ ''لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ خان اعظم کی آڑ میں کسی دوسرے نے یہ حرکت کی ہو۔''

''ہماری کسی سے بھی دشمنی نہیں ہے۔''

''رہزنی بھی بعید از امکان نہیں ہے۔''

''لیکن شاہدہ......!''

''ہوسکتا ہے وہ خوفزدہ ہوکر کسی طرف نکل گئی ہو۔''

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

''بے فکر رہو...... میں خیال رکھوں گا۔ خانم کو بھی میری طرف سے اطمینان دلا دینا۔''

''کیا اطمینان دلا دوں گا۔ آپ تو یہی فیصلہ نہیں کر سکے کہ معاملے کی نوعیت کیا ہے۔''

''فیصلے کسی ٹھوس بنیاد پر ہی کئے جاتے ہیں۔ کیا تم جانتے ہو کہ خان نے اعلان جنگ کی علامت تم لوگوں تک کس لئے پہنچائی تھی۔''

''نہیں...... ممی نے مجھے وجہ نہیں بتائی۔''

''بس تو پھر کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ تم پولیس کو شاہدہ کی گمشدگی کی اطلاع دے چکے ہو۔ اب میں دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا کرسکتا ہوں۔''

''یقین کیجئے! میری ذہنی حالت اس قابل نہیں ہے کہ ڈھنگ سے کسی موضوع پر گفتگو کرسکوں۔''

''مجھے احساس ہے۔''

ناصر کے چلے جانے کے بعد ہیڈ کوارٹر پہنچ کر ایک بار پھر صمد خان کو طلب کیا تھا۔

''میں نے محلات کی تلاشی کا وارنٹ حاصل کرلیا ہے۔ کیونکہ قلتو خان روپوش ہوگیا ہے۔'' اُس نے اُسے اطلاع دی۔

''اگر وہ روپوش ہوئے ہیں تو انہوں نے محلات کا رخ بھی نہ کیا ہوگا۔'' صمد خان کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ''اس لئے خون خرابے سے کیا فائدہ۔''

''میں نہیں سمجھا۔''

''محلات کے آس پاس بسے ہوئے لوگ پولیس سے باقاعدہ جنگ کریں گے۔ اگر انہیں علم ہوگیا کہ پولیس کس لئے آئی ہے۔''

''ضابطے کی کارروائی تو ہوکر رہے گی۔ خواہ ہم میں سے ایک بھی زندہ نہ بچے۔ راستوں کی ناکہ بندی توڑنے کے لئے بھی بارہ عدد لاشیں گرانی پڑی تھیں۔''

''دونوں معاملات میں فرق ہے جناب۔''

''کیا فرق ہے؟''

''ناکہ بندی کرنے والے قلتو خون کے سپاہی تھے اور اُس کے احکامات کی تعمیل کر رہے تھے لیکن محل کے پاس بسے ہوئے لوگ محض اپنی عقیدت کی بنا پر جو وہ خان اعظم سے رکھتے ہیں آپ کے مقابل آئیں گے۔''

''ہاں...... فرق تو ہے۔'' فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔

لہٰذا اُن کی سادہ لوحی قابل معافی ہونی چاہئے۔

''اگر تم قلتو خان کی نشاندہی کرسکو تو پھر اس کی ضرورت ہی پیش نہ آئے گی۔''

''اس کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا کہ جب وہ کسی سے ملنا نہیں چاہتے تو پرانے محل کے کھنڈر کی طرف نکل جاتے ہیں اور کئی کئی دن تک اُن کی واپسی نہیں ہوتی۔''

''یہ کھنڈر کہاں ہے؟''

''رہائشی محلات سے دس میل کے فاصلے پر اُس عارضی ہوائی اڈے کے قریب جو انگریزوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران میں قائم کیا تھا۔''

''اچھا...... اچھا...... میں سمجھ گیا۔ اُن کا رن وے ابھی قابل استعمال ہے۔''

فریدی تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ''خان اعظم سے ابھی تک ملاقات نہیں ہوسکی۔''

''اُن کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔''

''تم بھی اتنی ہی گہری عقیدت رکھتے ہو اُن سے۔''

''مجھے غلط نہ سمجھئے۔ علم ہی نہیں ہے۔ بتاؤں گا کیا! لیکن قلتو خان ضرور جانتا ہوگا۔ اس پر تو میں شرط بھی لگا سکتا ہوں۔''

''کیا قلتو تیسری شادی کرنا چاہتا تھا۔''

اس سوال پر صمد خان کا منہ حیرت سے کھل گیا اور اُس نے سنبھالا لے کر پوچھا۔ ''اس سوال کی نوعیت میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''اچھا تو اس کی بجائے دوسرا سوال ہے۔ نذر گل کو اُس نے کس مہم پر بھیجا تھا۔''

''مجھے اس کا بھی علم نہیں ہے؟''

''لیکن تم نے اُس کی موت کے بارے میں مجھ سے غلط بیانی ضرور کی تھی۔''

''ہاں...... مجھ سے یہ قصور ضرور سرزد ہوا تھا۔ لیکن دوسروں کی طرح میں بھی مجبور تھا۔

مجھ سے جو کچھ کہا گیا تھا وہی میں نے آپ کے سامنے دہرایا تھا۔ لیکن اب جبکہ آپ کے دونوں آدمی بازیاب ہوگئے ہیں یہی کہنا پڑے گا کہ وہ کسی کی گولی سے زخمی ہوا تھا۔''

''لیکن وہ زخم موت کا سبب نہیں بنا تھا...... اُسے زہر دیا گیا تھا۔ لاش کو قبر سے نکلوا کر اُس کا پوسٹ مارٹم کیا گیا ہے۔''

''کب......؟'' وہ متحیرانہ انداز میں اچھل پڑا۔

''پرسوں رات کی بات ہے...... اور یہ کام اتنی راز داری سے ہوا تھا کہ تمہارے علاقے کے کسی فرد کو بھی اس کا علم نہیں ہوسکا۔ تم نے مذہبی نوعیت کے ہنگامے کی دھمکی دی تھی نا۔''

وہ کچھ نہ بولا۔ فریدی بھی خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد صمد خان نے کہا۔

''بہر حال...... قلو خان کی وجہ سے خان اعظم کا وقار بھی خاک میں مل گیا۔ مجھے ہمیشہ اس کا افسوس رہے گا۔''

''ظالموں کا انجام یہی ہوتا آیا ہے۔ کوئی نئی بات نہیں۔'' فریدی نے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''اچھی بات ہے۔ پرانے محل کے کھنڈر بھی دیکھے لیتے ہیں۔ اگر وہاں نہ ملا تو رہائشی محلات کی تلاشی ضروری ہوجائے گی۔ اوہ...... لیکن ٹھہرو۔'' وہ ہاتھ اٹھا کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر صمد خان کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ ''تمہاری گرفتاری کے بعد ہی قلو خان روپوش ہوا ہے۔ اور تم جانتے ہو کہ وہ نامساعد حالت میں کدھر کا رخ کرتا ہے۔ تو پھر کیا وہ اس بار بھی وہیں گیا ہوگا۔''

''قلو خان کو علم نہیں ہے کہ میں جانتا ہوں...... میں بھی ایک بار اتفاقاً ہی واقف ہوگیا تھا۔ لیکن میں نے اُس سے اس کا ذکر کبھی نہیں کیا اور صرف میں ہی جانتا ہوں۔ دوسروں کو علم نہیں۔ دوسرے یہی سمجھتے ہیں کہ وہ کسی شکار گاہ میں ہوگا۔ پھر میں نے کئی بار چھپ کر دیکھا ہے۔''

''ہوں...... زیادہ تر یہی کہا گیا ہے کہ وہ کسی شکار گاہ میں ہوگا۔'' فریدی نے کہا۔ پھر صمد خان کو دوبارہ حوالات کیطرف روانہ کرکے وہ ایس پی ہومی سائیڈ کے دفتر میں داخل ہوا تھا۔

''عظمت محل والوں کا کیا قصہ ہے۔'' اُس نے ایس پی سے سوال کیا۔

''خان زادی شاہدہ اپنی گاڑی میں چندرینا کے لئے روانہ ہوئی تھیں۔ وہاں انہیں ایک

انڈسٹریل ہوم کا افتتاح کرنا تھا۔ لیکن وہاں نہیں پہنچیں۔ ڈرائیور کی لاش ملی ہے اور گاڑی چندرینا سے ڈھائی میل ادھر سڑک کے کنارے ملی تھی۔ لاش گاڑی کے قریب ہی پڑی پائی گئی ہے۔''

''ذرا نقشے پر بتایئے گا۔'' فریدی نے دیوار پر لٹکے ہوئے نقشے کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

ایس پی نے اٹھ کر جگہ کی نشاندہی کی تھی۔

فریدی نے اسکیل سے نقشے پر کسی قسم کی پیمائش شروع کردی اور پھر کچھ دیر بعد بولا۔

''میرا خیال ہے کہ زمانہ جنگ کا عارضی ایئر پورٹ بھی یہیں کہیں ہے۔''

''جی ہاں...... اسی نواح میں ہے۔''

''شائد ایئر فورس والے اُسے اب بھی استعمال کررہے ہیں۔''

''صرف باربردار طیاروں کے لئے۔'' ایس پی نے کہا۔ ''ہم نے خانزادی کو اُس نواح میں تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ کیا خیال ہے اس واقعے کا آپ کے معاملات سے تو کوئی تعلق نہیں۔''

''بظاہر تو ایسا نہیں معلوم ہوتا۔'' فریدی نے پُرتفکر لہجے میں جواب دیا۔

فی الحال اُس نے خان کے محلات کی تلاشی لینے کا ارادہ ملتوی کردیا تھا۔ صمد خان سے ملی ہوئی اطلاع قابل غور معلوم ہوئی تھی۔

ہیڈ کوارٹر سے اُس ہسپتال میں پہنچا جہاں حمید قاسم اور زلیخا کو رکھا گیا تھا۔ زلیخا باضابطہ طور پر اپنا بیان دے چکی تھی۔

فریدی حمید کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ آرام کرسی پر نیم دراز کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ فریدی کو دیکھ کر اٹھتا ہوا بولا۔ ''آرام کرنے کے لئے اسپتال ہی کیوں؟''

''اُوہ...... تو کیا یہاں تمہاری دلچسپی کا کوئی سامان نہیں۔''

''میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔''

''اور وہ دونوں۔''

''انہیں کیا ہوا تھا۔ بس تھکن تھی۔ اُتر گئی ہوگی۔ ہاں اُن لوگوں کا سراغ ملا یا نہیں۔''

''نہیں...... لیکن شائد جلد ہی قلو خان ہاتھ آجائے اور پھر خان اعظم کا پتا بھی وہی

بتائے گا۔"

"آخر......اُس بیچارے نذر گل کو زہر کیوں دیا گیا۔"

"ممکن ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں زخمی ہوا ہو اور وہ سمجھے ہوں کہ اُنہی لوگوں سے پٹ کر آیا ہو جن کے لئے بھیجا گیا تھا۔ ورنہ اُس کی طویل علالت کی کہانی کیوں سناتے۔"

"پتا نہیں...... وہ کون تھا جس نے کریم آباد کے ایس پی کو خط لکھ کر ہمارے بارے میں مطلع کیا تھا۔ ورنہ آپ اتنی جلدی کامیاب نہ ہوسکتے۔"

"وہ بھی مل گیا ہے۔ قلو کے آدمیوں نے اُسے مار ڈالنے کی کوشش کی تھی کیونکہ وہ اُس کے اس بیان کی تائید نہ کرسکتا کہ نذر گل چھ ماہ سے بیمار تھا۔"

"وہ تائید کیوں نہ کرتا۔"

"اس لئے کہ نذر گل اس کا بھائی تھا۔ قلو کے آدمی اُس کی تلاش میں تھے۔ اگر اُن کے ہاتھ لگتا تو اُسے بھی ٹھکانے لگا دیتے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی پھر حمید نے پوچھا۔ "قلو کو آپ کہاں تلاش کریں گے جبکہ ابھی تک خان اعظم ہی تک رسائی نہیں ہوسکی۔"

"خان اعظم......!" فریدی طویل سانس لے کر رہ گیا۔

ٹھیک اُسی وقت کسی نے دروازے پر دستک دی تھی۔ حمید نے اونچی آواز میں اندر آنے کی اجازت دی۔

دروازہ کھول کر اندر آنے والا قاسم تھا۔ لیکن فریدی کو دیکھ کر وہ بُری طرح بوکھلا گیا۔

"آؤ......آؤ......!" فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔ "کیا حال ہے۔"

"اللہ کا شکر ہے۔" وہ مسمسی صورت بنا کر بولا اور اس طرح بیٹھ گیا جیسے فوراً ہی کراہنا شروع کردے گا۔

حمید محسوس کر رہا تھا کہ وہ کچھ کہنے آیا تھا لیکن فریدی کو دیکھ کر خاموش رہ گیا اور اس غیر متوقع ملاقات نے اُسے گھٹن میں مبتلا کردیا ہے اور اُس گھٹن ہی کے نتیجے میں اُس کے چہرے پر دردِ زِہ کی سی کیفیت طاری ہوگئی ہے۔

"قاسم......!" دفعتاً اُس نے بڑے پیار سے کہا۔ "دل کو ہلکا کر ڈالو...... ہوسکتا ہے

کرنل صاحب تمہاری کچھ مدد کرسکیں۔"

"قیا مطلب......؟"

"کہہ ڈالو......جو کچھ کہنا ہے۔"

"وہ یہاں نہیں رہنا چاہتی۔"

حمید نے طویل سانس لی اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔

"کون یہاں نہیں رہنا چاہتی۔" فریدی نے پوچھا۔

"زلے......خا......!" قاسم نے بدقت کہا۔

"تو تم......اس سلسلے میں کیا کرسکو گے۔"

"آپ بتایئے میں قیا قروں......!"

"کیا وہ تمہاری ذمہ داری ہے۔"

"ہوجائے غی۔"

"کس طرح۔"

"آپ بتایئے......قس طرح۔"

حمید کو ہنسی آگئی اور قاسم اُسے گھونسہ دکھا کر بولا۔ "تم جرور گھپلا قرو غے۔"

"کھل کر بات کرو۔ تم کیا چاہتے ہو۔؟" فریدی نے اُس سے پوچھا۔

"اسے ٹائپ قرنا آتا ہے۔ اپنی سیکریٹری بناؤں غا۔"

"کیا وہ اس پر تیار ہے۔"

"جی غاں۔"

"اور اُس کا کیا ہوگا؟" حمید نے پوچھا۔

"کس کا قیا ہوغا......؟"

"وہ جو تم اُس سے جھوٹ بولتے رہے ہو۔"

"ارے وہ......اُسکی قوئی بات نہیں۔ جب وہ قاسم بھائی کہنے لگی تو میں نے خود ہی بتا دیا۔"

فریدی نے حیرت سے حمید کی طرف دیکھا جو پیٹ دبائے بے آواز ہنس رہا تھا۔

"اللہ نے چاہا تو پیٹ میں درد ہوگا تمہارے۔" قاسم بھنا کر اٹھتا ہوا بولا۔ "تم خود بیوہ

ہوتے تو پتہ چلتا۔"

"ارے......ارے بیٹھو۔" حمید ہاتھ اٹھا کر بولا۔لیکن قاسم کسی غضبناک سانڈ کے سے انداز میں فوں فوں کرتا نکلا چلا گیا تھا۔

"کیا بات ہے؟" فریدی حمید کو گھورتا ہوا بولا۔

"وہی جو عموماً اپنے قبیل کی کسی عورت کو دیکھ کر ہوتی ہے۔اُسے باور کراتا رہا تھا کہ ابھی تک غیر شادی شدہ ہے۔لیکن پھر اُس نے اُسے قاسم بھائی کہنا شروع کر دیا۔"

"عاصم صاحب نے اس کی مٹی پلید کر دی۔" فریدی بُرا سا منہ بنا کر بولا۔

"بہرحال۔وہ اُسے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔"

"دونوں آزاد ہیں اپنے معاملات میں۔"

"لیکن اب وہ اُس کی مٹی پلید کرائے گا۔اُس کی بیوی طوفان اٹھا دے گی۔"

"ختم کرو۔" فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا۔"میں اُس جگہ ریڈ کرنا چاہتا ہوں جہاں قتلو کے ملنے کا امکان ہے۔"

"میں بالکل فٹ ہوں......!" حمید نے کہا اور ناصر کے گھرانے کی بات چھیڑ دی۔

"میں اُن لوگوں سے مل چکا ہوں۔کھل کر بات نہیں کرتے۔" فریدی نے کہا۔

"آپس کا کوئی بڑا جھگڑا۔"

"ہوسکتا ہے۔"

"لیکن وہ لڑکی شاہدہ حیرت انگیز ہے۔"

فریدی کچھ نہ بولا۔کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

"اُس کے گھر والوں کا خیال ہے کہ وہ کسی ذہنی مرض میں مبتلا ہے۔" حمید نے تھوڑی دیر بعد کہا۔فریدی نے سر کو خفیف سی جنبش دی تھی۔کچھ بولا نہیں۔

"آپ کہاں ریڈ کریں گے؟"

"ایک کھنڈر ہے۔خان کے اجداد جن محلات میں رہتے تھے اُن کے کھنڈر۔"

"وہاں کیا ہے۔"

"دیکھیں گے۔اطلاع ملی ہے کہ قتلو بسا اوقات اُن کھنڈروں میں غائب ہو جاتا ہے؟"

"تب تو اُس نے اُدھر کا رخ بھی نہ کیا ہوگا۔"

"عام طور پر لوگوں کو اُس پناہ گاہ کا علم نہیں ہے۔صرف ایک آدمی جانتا ہے اور اُسے یقین ہے کہ قتلو کو اس کا علم نہیں ہے کہ وہ جانتا ہے۔"

"تب تو ہوسکتا ہے کہ بات بن ہی جائے۔بہرحال میں یہاں پڑا رہنا پسند نہیں کروں گا۔"

"اگر تم خود کو اتنا توانا محسوس کر رہے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"آپ مطمئن رہئے۔سر کی چوٹ بھی اتنی تشویش ناک نہیں ہے۔" حمید نے کہا۔پھر اُس نے اٹھ کر لباس تبدیل کیا تھا اور فریدی کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔

فریدی کی پارٹی سب سے پہلے اُس جگہ پہنچی جہاں شاہدہ کی گاڑی اور ڈرائیور کی لاش پائی گئی تھی۔

"لیکن یہاں تو وہ کھنڈر کہیں نظر نہیں آتے۔" حمید فوراً ہی بولا تھا۔

"کھنڈر دوسری طرف ہیں۔" فریدی بائیں جانب والی چٹانوں کے سلسلے کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولا۔

"پھر آپ یہاں کیا دیکھ رہے ہیں۔"

"آج ہی اسی جگہ ایک واقعہ اور بھی ہوا ہے۔" فریدی نے کہا اور اُسے شاہدہ کے گاڑی سے غائب ہو جانے والا واقعہ سنانے لگا۔

"آپ نے ہسپتال میں اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔"

"وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔" فریدی نے کہا اور سڑک پر لگائے ہوئے چاک کے نشانات کا بغور جائزہ لیتا رہا۔اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ڈرائیور کی موت کے بعد کیا ہوا ہوگا۔

"کیا اس واقعے کا تعلق بھی قتلو خان ہی سے ہوسکتا ہے۔" حمید نے پوچھا۔

"ہوسکتا ہے۔اگر نذر گل تمہارے ہی ہاتھوں سے زخمی ہوا تھا۔"

"تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ نذر گل اُن لوگوں کو خوفزدہ کرنے ہی کی مہم پر بھیجا گیا تھا۔"

"قرین قیاس ہے۔"

حمید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک ٹیکسی قریب ہی آرکی اور قاسم اُس پر سے اُترتا ہوا

بولا۔ ''میں بھی تعاقب قر سکتا ہوں۔ ہی ہی ہی۔''

فریدی حمید کو قہر آلود نظروں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

''ان تو قیا ہوگیا۔'' قاسم آہستہ سے بولا۔

''تم کیوں چلے آئے۔'' حمید نے بھنا کر کہا۔

''واہ بیٹا..... میں دھکے کھاؤں اور تم مجے کرو۔''

''میں مزہ کر رہا ہوں......!'' حمید نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔

''تم دونوں ہی میری طرف سے جہنم میں جاؤ۔''

''تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں غا...... ورنہ وہاں جی قیسے بہلے گا۔''

''قاسم! کیوں شامت آئی ہے۔ واپس جاؤ۔ ہمارے ساتھ رہے تو آج ضرور تمہارا پنکچر ہوجائے گا۔''

''یہاں آئے قیوں ہو۔''

''پولیس کو قتلو خان کی تلاش ہے۔ وہ روپوش ہوگیا ہے۔''

''میں بھی اُسکی شکل دیکھنا چاہتا ہوں۔ سالے نے بہت پریشان کیا ہے۔ زلیخا کہہ رہی تھی۔''

''بس......!'' حمید ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''یہاں زلیخا نہیں چلے گی۔''

''ضرور چلے گی...... سالے تم نے ہی اُس سے قہا ہوغا کہ قاسم بھائی قہو......!''

''تم نے شائد کبھی غور نہیں کیا تمہاری شکل ہی بھائیوں جیسی ہے۔''

''ٹھینگا جیسی ہے۔'' قاسم بھنا کر بولا۔

''یہ بھی ہوسکتا ہے۔''

''بہت جیادہ جی نہ جلاؤ...... ورنہ اللہ کی مار پڑے گی تم پر۔''

''شائد اُسی کے ساتھ تم بھی بیوہ ہوگئے ہو۔''

''اُس کے ساتھ تو میں گتی بھی ہوسکتا ہوں۔''

''یہ گتی ہونا کیا چیز ہوئی۔''

''اُس کے ساتھ جل کر مر بھی سکتا ہوں۔''

''اچھا اچھا..... ستی کی حجامت بنائی ہے۔ ابے مردے کے ساتھ جل مرنے کو ستی ہونا

کہتے ہیں۔''

''گتی ہونا قہتے ہیں...... تم سالے جھوٹ بولتے ہو۔''

اتنے میں فریدی نے جیپ میں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا تھا۔ شائد اب یہاں سے آگے روانگی کی ٹھہری تھی۔

''میں تعاقب قروں غا...... پورے دن کے لئے ٹیکسی کی ہے۔'' قاسم نے کہا۔

''مارے جاؤ تو شکوہ نہ کرنا۔''

''ابے قیا میں ڈرتا ہوں۔ تم لوگ جرور اُسی کی تلاش میں نکلے ہو جس نے زلیخا کو دکھ پہنچایا تھا۔''

''اچھا تو پھر......!''

''میں اُس کی ہڈیاں توڑ دوں غا۔ زلیخا سے وعدہ قرچکا ہوں۔''

''میں تمہیں اُس کی ہڈیاں بھجوا دوں گا۔ تم کہاں دھکے کھاتے پھرو گے۔''

''تم...... تم ہڈیاں بھجوا دو غے...... جرا شکل دیکھو اپنی۔''

''کیا بہت اچھی لگ رہی ہے۔'' حمید نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

قاسم نے محض دھمکی نہیں دی تھی۔ اُس کی ٹیکسی پولیس کی گاڑیوں کے پیچھے چلتی رہی۔

فریدی اس بار حمید کے ساتھ نہیں بیٹھا تھا۔ ایس پی والی جیپ میں تھا۔

کچھ دور چلنے کے بعد سڑک چھوڑ کر اگلی گاڑیاں بائیں جانب اُترتی چلی گئی تھیں اور قاسم کی ٹیکسی کا ڈرائیور بولا تھا۔ ''صاحب! ہم تو اُدھر نہیں جائے گا۔''

''کیوں؟...... اُدھر قیا ہے۔''

''ہماری گاڑی جیپ نہیں ہے۔''

''اس سے قیا ہوتا ہے۔''

''ارے جناب...... کار اُدھر نہیں چل سکتا۔ ایکسل ٹوٹے گا...... ادھر آپ بیٹھا ہے اُدھر نیچے کنکر پتھر...... کھڈہ...... ٹڈہ......!''

''پھر آئے قیوں تھے۔''

''سڑک سڑک جانے کو آیا تھا۔ آسمان پر چڑھنے کو نہیں آیا۔ یا تو آپ ادھر ہی اُتر

جائے نہیں تو سڑک سڑک چلے۔"

"میں تعاقب کر رہا ہوں۔"

"کس کا......؟"

"پولیس والوں کا......!"

"اُن سے کیا قصور ہوا ہے صاحب۔"

"سب تو نہیں بتائی جاتی ایسی باتیں۔"

"اچھا تو بس اب آپ اُتر جائیے۔"

"پورے دن کی بات طے ہوئی ہے۔"

"پوری رات بھی مفت......لیکن آپ سڑک سڑک چلے۔"

"ارے تو میں یہاں ویرانے میں اُتر قر قیا قروں غا۔"

"پیدل تعاقب......؟"

"میرا باپ بھی نہیں قر سکتا۔ وہ سالے جیپوں پر اور میں پیدل۔"

"کام کرنے کے لئے دل چاہئے صاحب! اور یہ پولیس کا لوگ تو پیدل ہوائی جہاز کا تعاقب کرتا ہے۔"

"اگر ایسی بات ہے تو......دیکھا جائے غا۔ تمہیں کتنا دوں۔"

"جتنا طے ہوا تھا اُس کا آدھا۔"

"یہ لو۔" قاسم نے چند نوٹ پرس سے کھینچے اور اُس کے ہاتھ پر رکھتا ہوا بولا۔ "دینا تو نہیں چاہئے تھا کیونکہ تم اپنے وعدے پر قائم نہیں رہے۔"

وہ ٹیکسی سے اُترا تھا اور پیدل ہی چل پڑا۔ جدھر پولیس کی گاڑیاں گئی تھیں۔

مڈبھیڑ

انہوں نے پہلے گاڑیوں ہی پر بیٹھے بیٹھے کھنڈر کے گرد چکر لگائے تھے اور پھر ایک جگہ گاڑیاں روک کر سب کے سب نیچے اُتر آئے تھے۔ کھنڈروں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ عمارت پوری طرح ملبے کے ڈھیر میں تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ جگہ جگہ ایسے کمرے بھی دکھائی دے رہے تھے جن کا کچھ بھی نہیں بگڑا تھا۔ البتہ ساری دیواریں کائی سے ڈھکی ہوئی تھیں۔

"کیا وہ انہی کمروں میں سے کسی میں ہوگا۔" ایس پی ہومی سائیڈ نے فریدی سے سوال کیا۔

"دیکھے لیتے ہیں۔ اب تو مجھے یقین سا ہوچلا ہے کہ یہ کھنڈر بہترین پناہ گاہ ثابت ہوسکتے ہیں۔"

ایس پی نے مسلح سپاہیوں کو ہدایت دی کہ تلاشی کے وقت وہ اُس حصے کو گھیرے میں لئے رہیں جن کی تلاشی لی جائے۔ وہ دونوں ایک طرف چل پڑے تھے اور حمید نے بھی اُن تک پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

"ان کو تو آرام ہی کرنے دیا ہوتا۔" ایس پی حمید کی طرف دیکھ کر بولا۔

"میں اب ٹھیک ہوں۔ سر کا زخم بھی معمولی ہے۔ میرے کاموں میں حارج نہیں ہوسکتا۔"

"کیا اُسے واپس کردیا۔" فریدی نے حمید سے پوچھا۔

"خدا جانے کیا ہوا۔ ویسے تو اُس نے تعاقب جاری رکھنے کی دھمکی دی تھی۔"

فریدی کچھ نہ بولا۔ بُرا سامنہ بنائے آگے بڑھتا رہا۔

"کئی دن لگ جائیں گے......!" حمید نے چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

"آخر طریق کار کیا ہوگا...... یہ کھنڈر تو بہت وسیع ہیں۔ ایک کمپنی بھی ناکافی ہوگی۔"

"کچھ نہ کچھ تو ہوگا ہی......!" فریدی نے کہا۔

تلاش جاری رہی حتیٰ کہ سورج مغرب میں جھکنے لگا اور ہوا میں خنکی بڑھ گئی۔

"میرا خیال ہے کہ یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔" ایس پی نے تھکے ہارے انداز میں کہا۔

فریدی جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اچانک کسی کی چیخ سنائی دی۔ وہ تیزی سے آواز کی سمت مڑے تھے۔ پارٹی کے ایک سپاہی پر کسی جانور نے چھلانگ لگائی تھی اور اُسے دبوچ بیٹھا تھا۔ دوسروں نے شور مچانا شروع کردیا۔ جانور کی گرفت میں آیا ہوا سپاہی گلوخلاصی کے لئے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرنا چاہئے۔ دفعتاً فریدی اُس کی طرف جھپٹا تھا۔ درندے کی کھال مٹھی میں جکڑ کر اُسے دور اچھال پھینکا۔ زمین پر گر کر اُس جانور نے پلٹ کر دوبارہ اپنے شکار کی طرف چھلانگ لگائی تھی۔ لیکن آدھا فاصلہ بھی نہیں طے کرپایا تھا کہ فریدی کے ریوالور سے شعلہ نکلا اور اُسے چاٹ گیا۔ اُس کے زمین تک پہنچتے پہنچتے اُس نے دوبارہ فائر کیا تھا اور وہ گولی بھی نشانے ہی پر بیٹھی تھی۔

دوسری طرف سپاہی بے حس وحرکت پڑا تھا۔ جانور نے اُس کا نرخرہ اُدھیڑ دیا تھا۔

اُس کی گردن سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا۔ چار سپاہی اُسے اٹھا کر جیپ کی طرف دوڑے......ابھی اس میں جان باقی تھی۔

فریدی اپنے شکار کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھے جارہا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی طور پر جسیم بلی تھی۔ عام بلیوں کی جسامت سے تین گناہ ضرور رہی ہوگی۔

''آخر یہ ہے کیا بلا۔'' ایس پی ہانپتا ہوا بولا۔

''شکل تو بلی ہی کی سی ہے۔ خدا کرے وہ بیچارہ بچ جائے۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ یہ کس طرف سے آئی تھی۔'' فریدی نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اُس کمرے کی چھت پر سے جناب۔'' ایک سپاہی نے ایک جانب ہاتھ اٹھا کر کہا تھا اور پھر خوفزدہ نظروں سے مردہ بلی کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

''میرے خیال سے اب واپس چلنا چاہئے۔'' ایس پی نے کہا۔ ''تھوڑی دیر میں اندھیرا پھیل جائے گا۔''

فریدی کچھ نہ بولا۔ وہ اُسی کمرے کی طرف دیکھے جارہا تھا جس کی جانب سپاہی نے اشارہ کیا تھا۔

''آپ نے ایس پی کی بات سنی یا نہیں۔'' حمید اُس کے قریب ہوکر آہستہ سے بولا۔

''تم بھی واپس جانا چاہو تو جاسکتے ہو۔ میں کوئی کام ادھورا نہیں چھوڑا کرتا۔''

''آخر آپ کو یقین کیوں ہے کہ وہ یہیں ہوگا۔''

فریدی کچھ نہ بولا۔ ڈی ایس پی نے واپسی کا مشورہ تو دیا تھا لیکن فریدی سے کوئی جواب پائے بغیر وہاں سے ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ حمید مردہ بلی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ شائد زندگی میں پہلی بار اتنی بڑی بلی اُسکی نظروں سے گزری تھی۔ یک بیک وہ چونکا تھا اور تیزی سے مردہ بلی کی طرف بڑھا تھا۔ اُسکے قریب پہنچ کر وہ جھکا اور کچھ دیکھتا رہا۔ پھر سیدھے کھڑے ہوکر ایس پی کی طرف دیکھا۔ انداز ایسا ہی تھا کہ ایس پی کو اُس کے پاس پہنچنا پڑا تھا۔

''یہ دیکھا آپ نے۔'' حمید نے بلی کی گردن کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

حمید نے جھک کر بلی کی گردن ٹٹولی تھی اور وہ آہنی حلقہ پوری طرح ظاہر ہوگیا تھا جسے بالوں نے چھپا رکھا تھا۔

''اس کا یہ مطلب ہوا کہ یہ جنگلی بلی نہیں ہے۔ یہ حلقہ کسی آدمی ہی نے اُس کی گردن میں ڈالا ہوگا۔'' حمید نے کہا۔

''واقعی......یہ تو سوچنے کی بات ہے۔''

''لہٰذا یہاں کوئی نہ کوئی ضرور موجود ہے۔''

''ایسا حکم نہ لگاؤ۔'' عقب سے فریدی کی آواز آئی اور وہ دونوں اُس کی جانب مڑے۔

''گردن کا حلقہ یہاں کسی آدمی کی موجودگی پر دلالت نہیں کرتا۔ ہوسکتا ہے دو سال پہلے اس کی گردن میں ڈالا گیا ہو اور یہ کسی دوسری جگہ سے فرار ہوکر یہاں چلی آئی ہو اور دن رات کے فاقوں نے اسے آدم خور تک بنادیا ہو۔''

وہ خاموش ہوکر سگار کا گوشہ توڑنے لگا۔

''یہ بات بھی ہوسکتی ہے۔'' ایس پی سر ہلا کر بولا۔

''سوال تو یہ ہے کہ یہاں آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔'' حمید بھنا کر بولا۔

''فی الحال اس کمرے کو دیکھنا چاہئے جہاں سے یہ بلی برآمد ہوئی تھی۔''

ایس پی کے چہرے پر ایک سایہ سا آکر گزر گیا۔ اب شائد وہ یہاں ذرا دیر کے لئے بھی نہیں رکنا چاہتا تھا اور پھر فریدی ہی نے اُس کی مشکل آسان کردی۔ اُس نے کہا۔ ''میرا بھی یہی خیال ہے۔ واپسی لیکن ہم دونوں عارضی ایئرپورٹ پر اُتر جائیں گے۔''

حمید کا خون خشک ہوگیا۔ گویا آج ہی کچھ کرگزرنے کی ٹھان لی گئی ہے۔ پھر واپسی میں وہ زیادہ تر اُسی سپاہی کے بارے میں گفتگو کرتے رہے تھے جسے میڈیکل ایڈ کے لئے فوری طور پر شہر کی طرف لے جایا گیا تھا۔

فریدی اور حمید ایئر پورٹ کے قریب رک گئے اور حمید نے ہولے ہولے کراہنا شروع کردیا۔

''قطعی توجہ نہیں دوں گا۔تم اپنی مرضی سے آئے تھے۔'' فریدی نے اُس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''سوال یہ ہے کہ رات میں کوئی خطرہ کیوں مول لیا جائے۔''

''ابھی دو گھنٹے باقی ہیں اندھیرا پھیلنے میں۔''

''تو پھر یہاں کیوں چلے آئے ہیں۔ دوبارہ وہاں تک پہنچنے میں کم از کم آدھا گھنٹہ ضرور صرف ہوجائے گا اور پھر آپ نے کوئی جیپ بھی نہیں روکے رکھی۔ پیدل ہی جانا پڑے گا۔''

''ذرا صبر سے کام لو......!'' فریدی رسٹ واچ پر نظر ڈالتا ہوا بولا۔''جتنی دیر میں اُن لوگوں کو رخصت کیا ہے اتنی ہی دیر روکے رکھنا چاہتا تھا۔ کام تو اب شروع ہوگا۔''

''کیا مطلب......؟''

''یہی کہ پولیس پارٹی آئی اور جھک مار کر واپس چلی گئی۔''

''آخر آپ کو کس بناء پر یقین ہے کہ قلو خان ان کھنڈروں ہی میں کہیں پناہ گزین ہے۔''

''شبہ ہے......اور میں اس شبے کو اپنے طور پر رفع کرنا چاہتا ہوں۔''

''میرے ذہن میں تو وہ خوفناک بلی چمٹی ہوئی ہے۔ پتا نہیں بیچارہ زندہ ہے یا مرگیا۔''

''شائد ہی بچ سکا ہو۔ نرخرہ ادھیڑ دیا تھا۔''

''مفت میں ایک جان ضائع ہوئی۔''

''میں نہیں جانتا تھا کہ اس قسم کا کوئی حادثہ پیش آئے گا۔''

''بلی......!'' دفعتاً حمید چونک پڑا۔

''کیا بات ہے؟''

''وہ بلی ہی کی آواز سے تو خوفزدہ ہوکر بیہوش ہوجاتی ہے۔''

''محض اتفاق بھی ہوسکتا ہے۔ کوئی پُر اسرار کہانی ترتیب دینے کی کوشش نہ کرو۔''

پھر انہوں نے کسی ہیلی کوپٹر کی آواز سنی تھی جو لحہ بہ لحہ قریب ہوتی جارہی تھی۔

''آؤ......!'' فریدی حمید کا ہاتھ پکڑ کر ایئر پورٹ کے پھاٹک کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

فریدی نے سنتری کو اپنا شناخت نامہ دکھایا اور وہ سیلوٹ کر کے ایک طرف ہٹ گیا۔

پھر اُن کے رن وے تک پہنچتے پہنچتے وہ ہیلی کاپٹر لینڈ کرگیا تھا جس کی آواز انہوں نے سنی تھی۔ پائیلٹ نے نیچے اُتر کر فریدی کو سیلوٹ کیا۔

''کیا سب سامان موجود ہے۔''

''یس کرنل......!'' اُس نے جواب دیا۔

''پندرہ منٹ بعد ہم روانہ ہوں گے۔''

''اوکے کرنل......!''

''کیا یہاں کوئی کینٹین نہیں ہے۔'' حمید نے چپکے سے پوچھا۔

''ہے کیوں نہیں! پندرہ منٹ چائے کیلئے کافی ہوں گے۔'' فریدی نے جواب دیا۔

پندرہ منٹ کینٹین میں گزارنے کے بعد وہ پھر ہیلی کوپٹر کی طرف پلٹے اور حمید نے کہا۔

''اب آپ یہ شور مچانے والا باجا لے کر اُدھر جائیں گے۔

''یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی۔ زیر تربیت پائلٹ انہی اطراف میں مشق کرتے ہیں اور سرچ پارٹیاں اندھیری راتوں میں مشق کیلئے خصوصیت سے انہی کھنڈروں کا رخ کرتی ہیں۔ ہیلی کوپٹروں سے سرچ لائٹ کی روشنی کھنڈروں کے تاریک ترین حصوں میں ڈالی جاتی ہے۔''

''تب تو ٹھیک ہے۔''

اُن کے بیٹھتے ہی ہیلی فضا میں بلند ہونے لگا تھا۔ اُس نے ایئر پورٹ کا ایک چکر لگایا اور پھر اُس کا رخ کھنڈروں کی طرف ہوگیا۔

''اُس عمارت پر نظر رکھنا جس سے بلی نیچے آئی تھی۔'' فریدی نے حمید کے کان سے منہ لگا کر زور سے کہا اور حمید نے اُس عمارت پر سے گزرتے ہوئے چھت کا جائزہ لیا جو ایک گوشے میں کھلی ہوئی تھی۔ پتا نہیں چھت کا وہ حصہ گرگیا تھا یا وہاں اوپر پہنچنے کیلئے زینے تھے۔

''تم نے دیکھا'' فریدی نے اُسے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ حمید نے سر کو مثبت جنبش دی تھی۔ کچھ دور جانے کے بعد فریدی کی ہدایت پر پائلٹ نے ہیلی کاپٹر کو

پھر اُسی جانب پلٹایا۔ اس بار زاویہ دوسرا تھا اور وہ چھت کے کھلے ہوئے حصے کا جائزہ بخوبی لے سکتے تھے۔

"زینے......!" فریدی طویل سانس لے کر بولا۔ حمید نے سرہلا کر تائید کی اور پھر تیسرے چکر میں ہیلی کوپٹر اُسی عمارت کی چھت پر معلق ہوگیا تھا۔ اس دوران میں فریدی نے ایک تھیلا اٹھا کر کاندھے سے لٹکالیا تھا۔ ایک اسٹین گن حمید کے ہاتھ میں تھما دی اور دوسری خودسنبھالی۔ بہرحال وہ چھت پر اترنے کیلئے تیار ہوچکے تھے۔ پائیلٹ نے رسیوں کی سیڑھی نیچے لٹکا دی اور وہ چھت پر اُتر گئے۔ اترنے سے قبل فریدی نے پائیلٹ کو چند ہدایات دی تھیں۔

وہ بہت احتیاط سے چھت کے کھلے ہوئے حصے کی طرف بڑھنے لگے۔ یہ کوئی بہت بڑا ہال معلوم ہوتا تھا۔ جو وقت کی شکست وریخت سے محفوظ رہ گیا تھا۔ ابھی اتنا اندھیرا نہیں پھیلا تھا کہ انہیں اوپر ہی سے زینوں کی پوزیشن نہ معلوم ہوسکتی۔

"مجھے آگے چلنے دو۔" فریدی نے کہا اور تھیلے سے ٹارچ نکال کر زینے طے کرنے لگا۔ حمید اُس کے پیچھے تھا۔ سات آٹھ زینے طے کرنے کے بعد ٹارچ روشن کرنی پڑی تھی اور وہ فرش تک پہنچے تھے۔ عجیب طرح کی ناگوار بو وہاں پھیلی ہوئی تھی۔ سیلن اور چمگادڑوں کے بیٹ کی ملی جلی بدبو تھی۔

ہیلی کاپٹر کا شور اب بہت دور سے سنائی دے رہا تھا۔ یہ ایک خاصا طویل وعریض ہال ثابت ہوا۔ لیکن بالکل خالی تھا۔ فریدی نے ٹارچ کی روشنی میں فرش پر کچھ نشانات دیکھے۔ جو زینوں سے شروع ہوکر ایک جانب بڑھتے چلے گئے تھے۔ گردآلود فرش پر بلی کے پنجوں کے یہ نشانات بہت واضح تھے۔ حمید کا دل کھوپڑی میں دھڑکنے لگا۔ کیونکہ یہ نشانات بڑی ترتیب سے ایک جانب بڑھتے چلے گئے تھے۔ فریدی ادھر اُدھر بھی روشنی ڈالتا جارہا تھا۔ لیکن ایک مخصوص سمت کے علاوہ اور کہیں بھی وہ نشانات نہ دکھائی دیئے۔ ان نشانات کا اختتام ایک دیوار کے قریب ہوا تھا اور پھر وہیں فریدی نے کسی سرنگ کا دہانہ دریافت کیا۔ تو گویا وہ بلی اسی سرنگ کے ذریعے کہیں اور سے آئی تھی اور سیدھی زینوں کی طرف چلی گئی تھی۔ دونوں دہانے میں اتر گئے۔ یہاں گھٹن کا احساس شدید ہوگیا تھا اور کچھ ایسی گرمی محسوس ہو رہی تھی جیسے سرنگ کا اختتام جہنم ہی کے دہانے پر ہوا ہو۔ قریباً دو ڈھائی سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے

بعد ایک سالخوردہ دروازہ اُن کی راہ میں حائل ہوگیا تھا۔ اُسے کھول لینے میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی کیونکہ وہ دوسری طرف سے بولٹ نہیں کیا گیا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی مدھم سی روشنی نظر آئی تھی اور زنجیروں کی جھنکاریں سنائی دی تھیں۔ دونوں نے اسٹین گنوں کے دستے مضبوطی سے پکڑ لئے اور پھر دروازے سے گزرتے ہی اُن کی آنکھوں کے سامنے ایک عجیب منظر تھا۔

قلو خان زنجیروں سے جکڑا کھڑا نظر آیا۔ لالٹین کی دھندلی سی روشنی میں اُس کے چہرے کی خوفزدگی کچھ ایسی لگ رہی تھی جیسے اُس نے موت کو بہت قریب سے دیکھ لیا ہو۔

"خدا کے لئے مجھے بچا لو" وہ انہیں دیکھتے ہی وحشیانہ انداز میں بولا۔ "پتا نہیں وہ دیوانہ کیا کرنا چاہتا ہے۔"

فریدی اور حمید خاموش رہے اور قلو خان کہتا رہا۔ "شائد تم میرے لئے فرشتہ رحمت بن کر آئے ہو کرنل۔"

"تم ابھی کس دیوانے کی بات کرر ہے تھے؟" فریدی نے سرد لہجے میں کہا۔

"خان اعظم کی...... میں نہیں سمجھ سکتا کہ آخر وہ چاہتا کیا ہے اور دیکھو ہوسکتا ہے تم مجھے موردالزام ٹھہراؤ۔ لیکن میں اُس کے احکامات کا پابند تھا۔ جب تم ڈیرہ غزن خان آئے تھے تو وہ میری ہی حویلی میں موجود تھا لیکن مجھے حکم تھا کہ کسی کو وہاں اُس کی موجودگی کی خبر نہ ہونے دوں۔ لہٰذا مجھے شکارگاہوں کا حوالہ دینا پڑا تھا اور تم تو سبھی کچھ جانتے ہوگے۔ نذرگل حس مہم پر گیا تھا اُس سے بھی واقف ہوگئے ہوگے۔ لیکن میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں کہ اُس کا مقصد کیا تھا۔ پھر نذرگل کو اُسی کے حکم سے زہر دیا گیا۔ کیپٹن حمید اور دوسرا آدمی اُسی کے حکم سے قیدی بنائے گئے۔ جو کچھ ان سے پوچھا جارہا تھا وہ بھی اُسی کے حکم سے تھا۔ جب یہ فرار ہوگئے تو اُس نے راستوں کی ناکہ بندی کرائی اور جب میں نے ناکہ بندی ٹوٹنے کی خبر پہنچائی تو مجھ سمیت وہاں سے فرار ہوکر یہاں پہنچا۔ اُس کے بعد مجھے بس اتنا یاد ہے کہ تھکن دور کرنے کے لئے اُس نے مجھے کوئی مشروب پلایا تھا۔ اُس میں پتا نہیں کیا تھا کہ پیتے ہی سدھ کھو بیٹھا۔ دوبارہ ہوش آیا تو خود کو اسی حال میں دیکھا جس میں تم اس وقت دیکھ رہے ہو۔ اب میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے اور میرا کیا حشر کرنا چاہتا ہے۔ خدارا مجھے اس عذاب

سے رہائی دلاؤ۔"

"شاہدہ کہاں ہے؟" فریدی نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"شاہدہ" اُس نے چونک کر حیرت سے فریدی کی طرف دیکھا اور بولا۔ "کون شاہدہ؟ کیا خان عظمت کی بیٹی۔"

"ہاں میں اُسی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔"

"مجھ سے پوچھ رہے ہو...... بھلا میں کیا بتا سکتا ہوں۔"

"اس لئے کہ تم اُس سے شادی کرنا چاہتے تھے۔"

"خدا سے ڈرو...... میری آنکھوں میں خاک۔ میں تصور بھی نہیں کرسکتا۔"

"خان اعظم نے اُس کے لئے تمہارا پیغام بھجوایا تھا۔"

"کہیں میں پاگل نہ ہوجاؤں۔ پتا نہیں وہ دیوانہ کیا کرنا چاہتا ہے! کرنل فریدی میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں۔"

"خان اعظم نے اُن لوگوں کو اسی لئے جوتا بھجوایا تھا کہ وہ اعلان جنگ سے خائف ہوکر شاہدہ کی شادی تم سے کردیں۔"

"خداوندا...... تو نذر گل اس لئے وہاں بھیجا گیا تھا۔ میں سمجھا تھا کہ شائد وہ کسی بات پر اُن لوگوں سے ناراض ہوگیا ہے۔"

"آج صبح شاہدہ اپنی گاڑی میں چندرینا جارہی تھی کہ کسی نے اُس کے ڈرائیور کو قتل کردیا اور خود وہ غائب ہے۔"

"خدا کے لئے خان اعظم کو تلاش کرو اور پاگل خانے بھجوا دو۔ اب میں کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔ وہ مجھے مار ڈالے گا...... لوگوں کو یہ باور کرانے کے لئے کہ میں شاہدہ کو لے کر کسی طرف نکل گیا ہوں۔"

"مگر کیوں......؟" فریدی نے اُسے بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"میری سمجھ میں تو نہیں آتا لیکن یہ بات ضرور سمجھ میں آگئی ہے کہ وہ مجھے قتل کرکے مفرور باور کرائے گا اور اپنے سارے جرائم میرے سر تھوپ دے گا۔ اب نہ جانے اُسے کس بات کا انتظار ہے جو مجھے اس وقت تک زندہ رہنے دیا۔"

"کیا تم اندازہ لگا کر بتا سکو گے کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا۔"

"شائد محل میں منتظر ہوگا تم لوگوں کی آمد کا۔ تاکہ ہر معاملے سے لاعلمی ظاہر کرکے تمہیں میری تلاش جاری رکھنے کی تاکید کرسکے۔"

فریدی نے متفق ہوجانے کے سے انداز میں سر کو جنبش دی تھی اور پھر اُس بلی کا ذکر چھیڑ دیا تھا جس کی وجہ سے اس عمارت کی طرف توجہ مبذول ہوئی تھی۔

انہوں نے دیکھا کہ اس بلی کے تذکرے پر قلو خان کے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی ہے۔

"وہ...... وہ...... آدم خور بلیاں ہیں......!" وہ بدقت بولا۔ "درجنوں کی تعداد میں یہیں کہیں کسی تہہ خانے میں...... اُن کی نسل خان اعظم کے پردادا کے وقت سے پلتی چلی آرہی ہے۔ میں نے اُن کی کہانی اپنے باپ کی زبانی سنی تھی۔ خان اعظم کے بزرگ جسے سزائے موت دیتے تھے وہ انہی بلیوں کے حوالے کردیا جاتا تھا۔ خداوندا...... وہ آدم خور بلیاں آج بھی موجود ہیں۔"

"کیا تم نے انہیں نہیں دیکھا۔"

"ہرگز نہیں۔ صرف سنتا رہا ہوں۔ میرے باپ نے بیس سال پہلے شک ظاہر کیا تھا کہ اُن بلیوں کی نسل اب بھی موجود ہوگی۔ اسی لئے تو خان اعظم کے معتوبوں کی لاشوں تک کا پتا نہیں چلتا۔"

"لیکن وہ بلی اسی عمارت کی چھت پر سے کودی تھی اور ہم اُسی کے پنجوں کے نشانات ہی کی بناء پر اس سرنگ کے وجود سے واقف ہوسکے تھے۔"

"تت...... تو کیا...... وہ ادھر ہی سے۔" قلو خان کانپتا ہوا بولا۔

"اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہوسکتا۔ ورنہ وہاں اس ہال کے کسی دوسرے حصے میں اُس کے پنجوں کے نشانات ملتے۔"

"خدا کے لئے مجھے یہاں سے فوراً نکال لے چلو۔"

"ہاں ہاں...... ضرور...... لیکن قلو خان...... یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ خود تم نے ہی خان اعظم کو ٹھکانے لگا دیا ہو۔ کیونکہ جو کچھ تم نے انہیں مجرم ثابت کرنے کے لئے کہا ہے وہی تم پر بھی صادق آسکتا ہے اور ہمیں اس عمارت کی طرف متوجہ کرنے کے لئے ایک عدد آدم خور بلی

بھی استعمال کر ڈالی ورنہ خصوصیت سے ہم اسی عمارت کی طرف توجہ کیوں دیتے۔ تم جانتے تھے کہ صمد خان تمہاری اس پناہ گاہ سے واقف ہے۔"

"بہت خوب! اور خود میں نے ہی اپنے آپ کو ان زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔" قلو خان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میں بخوبی دیکھ رہا ہوں کہ کس طرح جکڑے کھڑے ہوئے ہو۔" فریدی بولا اور حمید اُس کے لہجے سے پہچان گیا کہ وہ واقعی قلو خان کی طرف سے مطمئن نہیں ہے۔ لہٰذا اُس کا ہوشیار ہوجانا ضروری تھا۔ دفعتاً قلو خان کی ساری زنجیریں چھنچھناتی ہوئی فرش پر آرہیں اور اُس نے اسٹین گنوں کی پرواہ کئے بغیر اُن دونوں پر چھلانگ لگائی۔ حمید نے پھرتی سے پیچھے ہٹ کر اُس کی کمر پر اسٹین گن کا دستہ رسید کردیا۔ وہ سیدھا فریدی ہی پر گیا تھا۔ لیکن حمید کے ہاتھوں چوٹ کھا کر اُس کی طرف پلٹ گیا۔ ٹھیک اسی وقت فریدی کی اسٹین گن اُس کے شانے پر پڑی اور وہ کسی کٹکھنے کتے کی طرح غرا کر فریدی پر آیا۔ لیکن فریدی نے پھرتی سے پیچھے ہٹ کر اُس کے سینے پر ٹھوکر رسید کی یہ اور بات ہے کہ وہ کسی پہاڑ کی طرح اٹل ثابت ہوا ہو۔ اس کے باوجود بھی فریدی سے لپٹ پڑا۔ ٹھیک اسی وقت حمید نے کسی عورت کی کراہیں سنی تھیں اور بوکھلا کر چاروں طرف دیکھنے لگا تھا۔

عورت کے ہاتھ اور پیر بندھے ہوئے تھے اور وہ کہنیوں کے بل گھسٹتی ہوئی ایک تاریک گوشے سے روشنی کی طرف آرہی تھی۔

"اُسے دیکھو.....!" اُس نے فریدی کو کہتے سنا جو ابھی تک قلو کو زیر کرلینے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ وہ کسی بپھرے ہوئے درندے کی طرح فریدی پر تابڑ توڑ حملے کررہا تھا۔ حمید عورت کی طرف جھپٹا۔ یہ شاہدہ تھی۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ آہستہ آہستہ کراہے جارہی تھی۔ حمید نے تیزی سے اُس کے ہاتھ پیر کھول دیئے اور اُسے آوازیں دینے لگا۔ اُس نے آنکھیں کھولی تھیں اور اس طرح حمید کو دیکھتی رہی تھی جیسے پہچاننے کی کوشش کررہی ہو۔ پھر دفعتاً چیخنے لگی تھی۔ "انہیں بچایئے...... خدا کیلئے خان بابا کو بچایئے۔" ساتھ ہی وہ اُسی تاریک گوشے کی طرف اشارہ کئے جارہی تھی جدھر سے خود روشنی میں آئی تھی۔

"کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" قلو خان کی غراہٹ سنائی دی۔ ساتھ ہی کسی کے

مرنے کی بھی آواز آئی تھی۔ حمید چونک کر اُدھر متوجہ ہوگیا۔ فریدی نے قلو کو گرالیا تھا اور اب اسٹین گن کے دستے سے اُس کے سر پر ضرب لگا رہا تھا۔ پھر وہ اُسے چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ شاہدہ کے ہاتھ پیروں سے کھولی ہوئی رسی سے اُس کے ہاتھ پیر باندھے گئے تھے اور اب فریدی پوری طرح شاہدہ کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔

"خان ...... بب...... بابا......!" وہ پھر اندھیرے کی طرف ہاتھ اٹھا کر چیخی اور بے حس و حرکت ہوگئی۔ فریدی نے حمید کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا تھا اور خود تاریک گوشے کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا۔

ٹارچ روشن کی تھی اور یہاں ایک اور دروازہ دکھائی دیا جو بہ آسانی کھل گیا تھا۔ پھر پہلی ہی جیسی ایک مختصر سی سرنگ طے کرکے تیسرے دروازے تک پہنچا جس کی دوسری طرف عجیب سا شور برپا تھا۔ متعدد بلیوں کی چیخیں اور غراہٹیں تھیں۔ اسٹین گن سیدھی کرکے اُس نے دروازے پر ٹھوکر ماری۔ دروازہ کھل گیا۔ بدبو کا زبردست ریلا نیم گرم ہوا کے ساتھ اُس کے جسم سے ٹکرایا تھا۔ اس طویل و عریض کمرے کا منظر کسی کمزور دل آدمی کے بس کا روگ نہیں تھا۔ یہاں بھی لالٹین کی دھندلی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک آدمی چھت سے لٹکتا نظر آیا۔ نیچے کئی خونخوار بلیاں تھیں۔ جو اچھل اچھل کر اُس تک پہنچنے کی کوشش کررہی تھیں۔ اُن میں سے ایک نے فریدی کی طرف بھی چھلانگ لگائی تھی۔ اسٹین گن سے گولیوں کی بوچھاڑ نکلی اور اُن میں سے کئی گر کر تڑپنے لگیں۔ پھر باقی ماندہ فریدی ہی پر جھپٹ پڑی تھیں۔ ٹریگر پر دوبارہ دباؤ پڑا۔ لیکن اتنی دیر میں ایک بلی اُس کی ٹانگوں سے چمٹ ہی گئی تھی۔ پتلون کا پائینچہ پھٹ کر جھول گیا اور پنڈلیوں پر خراشیں آئیں۔

ذرا ہی سی دیر میں تیرہ عدد خوفناک بلیوں کی لاشیں فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔ پھر بڑی دشواری سے وہ اُس آدمی کو چھت سے اتارنے میں کامیاب ہوا تھا۔ فریدی نے اُسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ یہ خان اعظم کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد وہ تینوں بیہوشوں سمیت ایئر پورٹ تک پہنچے تھے اور حمید نے شاہدہ کو ہیلی کاپٹر سے اتار کر ہاتھوں پر اٹھایا تھا اور ڈسپنسری کی طرف دوڑ لگائی تھی۔ قریب ہی ایک بار بردار طیارے سے سامان اُتارا جارہا تھا اور رن وے پوری طرح روشن تھا۔

دوسری صبح حمید پر قاسم کی دھاڑ بن کر نازل ہوئی تھی۔ پچھلی رات اُسے پہلے تو ایئرپورٹ والوں نے پکڑا تھا پھر پولیس کے حوالے کردیا تھا۔ کئی گھنٹے حوالات میں بھی گزارے تھے۔ پھر ایس پی ہومی سائیڈ جو اُسے حمید کے دوست کی حیثیت سے پہچانتا تھا آڑے نہ آتا تو اتنی جلدی گلوخلاصی ممکن نہ ہوتی۔ بہرحال اُسی نے سارا ہسپتال سر پر اٹھالیا تھا۔ پھر حمید کی نیند کیسے نہ ٹوٹتی۔ اُس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تھا اور قاسم کسی بھرے ہوئے بیل کی طرح شائد اُس پر ٹوٹ ہی پڑتا اگر ٹھیک اسی وقت فریدی نہ پہنچ جاتا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے۔'' اُس نے سخت لہجے میں پوچھا تھا اور قاسم صرف ہونٹ ہلا کر رہ گیا تھا۔ آواز نہیں نکلی تھی۔ فریدی نے گھورتے ہوئے کہا۔ ''اپنے کمرے میں جاؤ...... تھوڑی دیر بعد ہم وہیں آئیں گے۔''

قاسم کچھ کہے بغیر مڑا تھا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تھا۔

''خان اعظم نے بیان دینے کے بعد خودکشی کرلی۔'' فریدی نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا اور حمید ہکا بکا رہ گیا۔

فریدی بستر کے قریب والی کرسی پر بیٹھ کر سگار سلگانے لگا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بولا۔

''وہ اُسی وقت سے قلتو خان کی قید میں تھا جب شاہدہ نے محل میں قیام کیا تھا۔ خان شکار پر جانے کے لئے تیار تھا۔ شاہدہ نے اُس سے کہا کہ وہ بھی کچھ دن شکارگاہ میں اُس کے ساتھ گزارنا چاہتی ہے۔ خان تیار ہوگیا۔ اُسے شاہدہ اور ناصر سے محبت تھی کیونکہ خود لاولد تھا۔ انہی دونوں کو اپنا وارث بھی قرار دیتا۔ وہ شکارگاہ کے لئے روانہ ہوئے۔ قلتو بھی ہمراہ تھا۔ وہ انہیں دھوکے سے وہیں لے گیا جہاں سے برآمد ہوئے تھے اور خان کو قابو میں کر لینے کے بعد اُس نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ شاہدہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس پر خان بھڑ گیا۔ خان کے ساتھ اُن کا میر شکار بھی تھا وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہوگیا۔ قلتو نے اُسے اس پنجرے میں دھکیل دیا جس میں آدم خور بلیاں تھیں۔ وہ اُس پر جھپٹ پڑیں اور اُس کی تکا

بوٹی کرڈالی۔ شاہدہ نے وہ منظر دیکھا تھا اور بیہوش ہوگئی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ پورا واقعہ اُس کے ذہن سے محو ہوگیا۔ صرف اتنا ہی یاد رہا کہ خان اس وقت محل ہی میں تھا۔ جب وہ وہاں گئی تھی اور پھر محض اندازے سے کہہ دیتی تھی کہ وہ تین چار دن بعد شکارگاہوں کی طرف چلا گیا تھا۔ قلتو نے بیہوشی ہی کے عالم میں اُسے وہاں سے ہٹادیا تھا۔ محل میں پہنچایا تھا اور یہ دیکھنے کے لئے کچھ دن محل ہی میں رکھا تھا کہ وہ دوسروں کو کیا بتاتی ہے۔ لیکن کوئی خاص ردعمل نہ دیکھ سکا۔ اسی دوران میں بلی کی آواز سن کر شاہدہ پر دورہ پڑا اور معاملے کی نوعیت قلتو خان کی سمجھ میں آگئی۔ اس کے بعد بھی پس پردہ رہ کر معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ شاہدہ کو تہ خانے والے حادثے کے متعلق کچھ یاد ہے یا نہیں۔ لیکن شاہدہ کی یادداشت کی سطح پر وہ واقعہ نہیں اُبھر سکا تھا۔ اُس نے کچھ دنوں کے بعد اُسے گھر واپس بھجوا دیا اور خان بدستور اُسی تہ خانے میں قید رہا۔ وہیں اُس نے اُسے مجبور کر کے شاہدہ سے شادی کا تحریری پیغام عظمت محل بھجوایا تھا اور اُسے اس لئے زندہ رکھا تھا کہ عظمت محل سے انکار ہوجانے کی صورت میں کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرے گا۔ پیغام بھجوا دینے کے بعد ہی سے عظمت محل والوں کو دہشت زدہ کرنے کے لئے نت نئی تدابیر اختیار کرتا رہا تھا۔ نذرگل والا واقعہ بھی اُسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ عظمت محل والے یہی سمجھتے رہے کہ یہ سب کچھ خان اعظم کی طرف سے ہو رہا ہے۔ بہرحال پھر بات شاہدہ کے اغواء تک پہنچی۔ اغواء کر کے وہ اُسے پھر وہیں لے گیا جہاں خان اعظم مقید تھا اور اب وہ خان اعظم سے عظمت محل والوں کے نام اس نوعیت کا خط لکھوانا چاہتا تھا کہ اُس نے شاہدہ کی شادی زبردستی قلتو خان سے کردی اور اُنہیں وادی سرخاب سے باہر روانہ کردیا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ واپس آجائیں گے اور چونکہ خان نے پہلی بار اپنے خاندان والوں سے زبردستی کی ہے لہٰذا اب وہ بھی کسی کو منہ نہیں دکھائے گا۔ ہمیشہ کے لئے روپوش ہو رہا ہے۔ خان نے ایسا کوئی خط لکھنے سے صاف انکار کردیا تھا۔ لیکن قلتو نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ اُسے یقین تھا کہ اگر دو دن بھی اسی طرح چھت سے لٹکا رہا اور آدم خور بلیاں اُس کا صفایا کردینے کے لئے اچھلتی کودتی رہیں تو راہ پر آجائے گا۔ ادھر شاہدہ کا یہ حال تھا کہ قلتو کے آگے خان کی رہائی کے لئے گڑگڑاتی رہی تھی۔ شادی پر بھی آمادہ ہوگئی تھی اور یہ بھی کہہ رہی تھی کہ خان کو اُس کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں کرنے دے گی۔ لیکن قلتو

اتنا نادان نہیں تھا۔ پکا کام کرنا چاہتا تھا۔ خان سے آخری خط لکھواتا اور انہیں ختم کر دیتا۔ خان نے بتایا ہے کہ قلتو کے خاندان میں دولت کی ہوس سینکڑوں سال سے چلی آ رہی ہے۔ اُس کے اجداد نے ایسے ہی جابرانہ مجرمانہ طریقوں سے دوسروں کی جائیدادیں حاصل کی تھیں۔ یہ اُس کی موروثی ہوس تھی۔ شاہدہ سے شادی کرنے کے بعد ناصر کو ختم کر دینے کی کوشش کرتا۔ اس طرح کہ قتل حادثہ معلوم ہو۔ اُس کے بعد دونوں گھرانوں کی دولت شاہدہ کے حصے میں آتی۔ یعنی اُس کا مالک قلتو ہوتا۔"

"پھر خان نے کیوں خودکشی کر لی۔"

"اُس کے ہاتھ بھی تو صاف نہیں تھے۔ وہ خوفناک بلیاں اُسی کی تھیں اور اُن کی نسل اسی کے اجداد کے وقت سے چلی آ رہی تھیں جس بڑے پنجرے میں وہ بند رہتی تھیں اُن میں کئی انسانی پنجر ملے ہیں۔ بس اتنا ہی تھا کہ ہمارے معاملات میں اُس کا ہاتھ نہیں تھا۔ اُس کی تمام تر ذمہ داری قلتو پر تھی۔ اچھا ہی ہوا کہ اُس نے خودکشی کر لی ورنہ بہت ذلیل ہوتا۔ بہرحال شاہدہ اب معمول پر ہے۔ دوسری بار بلیوں کا سامنا ہوتے ہی پچھلا واقعہ یادداشت کی سطح پر اُبھر آیا تھا۔ خان نے اپنی بہن روشن زمانی خانم کے پُراسرار مرض کی وجہ بھی یہی بتائی تھی۔ کسی پر اُن بلیوں کو حملہ آور ہوتے دیکھا تھا اور جزوی طور پر یادداشت کھو بیٹھی تھی۔"

"بہرحال میرے مقدر میں تفریح نہیں ہے۔" حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "جہاں گھر سے باہر قدم نکالا۔ بدبختی نے تعاقب شروع کر دیا۔"

مزید کچھ نہ بولا۔ اُٹھ کر کھڑکی کے قریب آ گیا تھا اور گہری گہری سانسیں لینے لگا تھا۔ جیسے تازہ ہوا سے کسی قسم کی گھٹن دور کرنا چاہتا ہو۔

ختم شد

جاسوسی دنیا نمبر 120

دہشت گر

(مکمل ناول)

پیش رس

عرصہ دراز کے بعد فریدی، حمید اور قاسم سے ملئے۔ لیکن قبل اس کے آپ اس کہانی سے لطف اندوز ہوں آپ کو تھوڑا سا بور بھی کروں گا۔ یعنی پھر وہی کاغذ...... کتاب کی قیمت بڑھانے کے بعد سے اب تک کاغذ کی قیمت میں تقریباً پچیس فیصد اضافہ ہوگیا ہے۔ میں نے قیمت صفحات میں اضافے کے ساتھ بڑھائی تھی۔ لیکن اب سوچ رہا ہوں کہ بات کیسے بنے۔ قیمت میں مزید اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔ لہٰذا آپ ہی کوئی حل تلاش کیجئے۔ آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔ لیکن خدارا قیمت بڑھانے کو نہ کہئے گا۔ کوئی اور حل۔ جو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ صفحات پھر کم کئے جائیں۔ قلم باریک کرایا جائے اور بائیس کی بجائے تیئس سطریں لکھوائی جائیں اور مواد اتنا ہی رہے جتنا اضافے کے صفحات سمیت دے رہا ہوں۔ میرے خیال سے اس میں کوئی قباحت نہ ہوگی۔ آپ کی کیا رائے ہے۔ فوراً مطلع کیجئے!

ایک صاحب نے لکھا ہے کہ آپ انگلش میں بھی لکھنا شروع کردیجئے۔ اس طرح آپ کی اقتصادی حالت بھی مغربی ہی ملکوں کے مصنفوں کی سی ہوجائے گی۔ انگریزی میں ساری دنیا کا مارکیٹ آپ کو ملے گا۔ اگر باہر ہی کا کوئی پبلیشر بھی مل گیا تو اتنی رائلٹی ملے گی کہ آپ بھی ارل اسٹینلے گارڈنز کی طرح اپنا ہوائی جہاز رکھ سکیں گے۔

بھیا! ہوائی جہاز رکھ تو سکوں گا لیکن اُس پر بیٹھے گا کون؟ تھان پر بندھا ہنہنایا کرے گا۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ اُس پر بھی ''ابن صفی کا ہوائی جہاز'' لکھوا دوں گا اور دیکھ دیکھ کر خوش ہولیا کروں گا۔

بھائی محض ہوائی جہاز کے ڈر سے آج تک فرانس نہیں جاسکا۔ (نہ جانے کیوں فرانس جانے کو اتنا دل چاہتا ہے)

مجھے آپ ابن صفی سابق لالوکھیت والا اور حال مقیم ناظم آباد ہی رہنے دیجئے۔ اسی میں میری بہتری ہے اور آپ بھی ہر ماہ میری کتاب پڑھتے رہیں گے ورنہ اگر ہوائی جہاز کے ڈر سے لکھنا ہی چھوٹ گیا تو کیا ہوگا۔

میری جیسی بھی اقتصادی حالت ہے اس پر رب العزت کا احسان مند ہوں۔ مگن ہوں...... دولت کی ریل پیل ذہنی سکون کی دشمن ہوتی ہے آدمی مشین بن کر رہ جاتا ہے۔ میرے لئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ میری ضروریات پوری ہوتی رہیں اور مجھے آپ سے قرض نہ لینا پڑے۔ میں اسے سب سے بڑی دولت مندی سمجھتا ہوں کہ جب میں سونے کے لئے لیٹوں تو مجھے فوراً نیند آجائے۔

ایک صاحب نے پوچھا ہے آخر یہ زیرولینڈ ہے کہاں؟ کب پتہ چلے گا اس کا۔

عرض ہے کہ ابھی میں بھی تلاش ہی میں ہوں۔ مجھے بھی نہیں مل سکا۔ اس کے مختلف یونٹوں میں بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ مرکز تک پہنچ نہیں ہوسکی۔ جب بھی پہنچ سکا آپ کو مطلع کردوں گا۔ آگے چل کر سوال کیا ہے کہ عمران، فریدی اور حمید کی عمریں کیا ہیں۔ بھائی خواتین کی طرح یہ حضرات بھی اپنی اصل عمر ظاہر کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ یہ آپ پر منحصر ہے۔ جس عمر کا دل چاہے تعین کرلیں۔ انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

والسلام

ابن صفی

۱۹۷۷/۰۹/۰۳

بالآخر قاسم گھر سے نکل بھاگا۔ بیوی نے زندگی تلخ کر رکھی تھی۔ وجہ تھی قاسم کی ڈاڑھی۔ پچھلے پندرہ دنوں سے وہ ڈاڑھی بڑھانے کے خبط میں بھی مبتلا ہو گیا تھا۔ سر کے بال تو پہلے ہی سے کاندھے تک پہنچے ہوئے تھے۔ لیکن وہ اسے جدید فیشن کے مطابق سمجھ کر نظر انداز کر گئی تھی۔ لیکن جب قاسم نے شیو کرنا بھی ترک کر دیا تو ایک دن جھلا کر بولی۔ ''کیا اب میرے دادا جان بنو گے۔''

''اپنا بھی بنوں غا......!'' قاسم نے خوش ہو کر کہا۔

''میں کہتی ہوں اگر تم نے شیو نہ کیا تو اچھا نہ ہوگا۔''

''قیا اچھا نہ ہوگا۔'' قاسم آنکھیں نکال کر بولا۔

''بالکل جنگلی معلوم ہونے لگے ہو۔''

''میں پوچھ رہا ہوں قیا اچھا نہ ہوغا۔''

''میں کہیں چلی جاؤں گی۔''

''کب......؟'' قاسم نے بہت زیادہ خوش ہو کر پوچھا۔

''تم تو چاہتے یہی ہو۔''

''قیوں نہ چاہوں......کس کام آئی ہو۔''

''باوا جان سے پوچھو جا کر۔''

''وہ بہت بھولے بھالے ہیں۔ شرما قر جوتا اُتار لیں غے۔''

''ابھی فون کرتی ہوں۔''

''یہیں اٹھا لاؤ فون۔''

''جہنم میں جاؤ۔'' وہ پیر پٹخ کر بولی اور وہاں سے چلی گئی۔

لیکن حقیقتاً بات یہیں ختم نہیں ہو گئی تھی۔ اُس نے سچ مچ عاصم صاحب کو فون پر اس نئی چویشن کی اطلاع دے دی۔

''نماز بھی شروع کی یا نہیں۔'' عاصم صاحب نے سوال کیا۔

''ارے چچا جان......آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ وہ ہپی بننے کے خبط میں مبتلا ہو گئے ہیں۔''

''چرس تو نہیں پینے لگا۔'' عاصم صاحب نے غالباً بوکھلا کر پوچھا تھا۔

''گھر میں تو نہیں پیتے۔''

''منہ سے بدبو آتی ہے۔''

''میں نہیں جانتی۔'' وہ جھنجھلا کر بولی۔

''اچھا اُسے میرے پاس بھیج دو۔''

اُس نے باپ کا پیغام بیٹے تک پہنچا دیا اور بیٹا بھڑک اٹھا۔

''اُن کے فرشتے بھی میری ڈاڑھی نہیں منڈوا سکتے۔''

''یہی جواب دے دوں فون پر تمہاری طرف سے۔'' بیوی نے پوچھا۔

''نہیں اس کی جرورت نہیں۔ میں خود بات قر لوں غا۔''

''سر کی مالش کرا کے جانا۔'' بیوی بولی۔

ایک گندی سی گالی قاسم کے ذہن میں گونج کر رہ گئی اور اُس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے کہ کہیں زبان سے بھی نہ پھسل جائے اور پھر اُس کی زبان سے چھٹانک بھر کی گالی بھی ڈیڑھ من کی معلوم ہوتی تھی۔

بہرحال باپ کے پاس جانے کا غچہ دے کر گھر ہی سے نکل بھاگا اور ایک دوسرے درجے کے ہوٹل میں پناہ لی۔ اول درجے کے کسی ہوٹل کا رخ اس لئے نہیں کیا تھا کہ وہاں باپ کے جان پہچان والوں سے مڈبھیڑ ہو جانے کا امکان تھا۔ ہوٹل میں قیام ہو جانے کے بعد اُسے وہ شخصیت یاد آئی جس نے اُس کی روکھی پھیکی زندگی کو یہ نیا موڑ عطا کرنے کی کوشش

کی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ شخصیت کیپٹن حمید کے علاوہ اور کون ہوتی اور کون تھا جو قاسم کو اتنی باقاعدگی سے منہ لگا سکتا۔ اُس کے دوسرے ملنے والے تو اُسے ''مہا بور'' سمجھتے تھے۔

ایک دن قاسم نے زندگی کی بے کیفی کا شکوہ کیا تھا۔ اس پر حمید نے کہا کہ وہ کچھ دنوں کیلئے ہپی کیوں نہیں بن جاتا۔ زندگی میں کم از کم ایک بار ڈاڑھی سمیت بھی اُسے اپنے خانہ دل میں جگہ دینے کی کوشش کرے گا۔ پھر دونوں شمالی سرحد کی طرف نکل چلیں گے۔ جہاں سفید فام غیر ملکی ہپیوں کے قافلے بھٹکتے پھرتے ہیں۔ ان میں عورتیں بھی ہوتی ہیں اور بسا اوقات اتنی دلکش ہوتی ہیں کہ بس دیکھتے ہی رہ جاؤ۔ سہل الحصول بھی ہوتی ہیں اور اس پر اُن کے مرد ساتھیوں کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا بشرطیکہ تمہاری جیب اُن کیلئے چرس مہیا کر سکے۔

قاسم اس ذکر پر مبہوت رہ گیا تھا۔ سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ ہر چند کہ مشورہ یونہی رواروی میں دیا گیا تھا لیکن وہ سیریس ہوگیا۔ دوسرے دن شیو نہیں کیا تھا اور پھر پندرہ دن میں تو شکل ہی نہیں پہچانی جاتی تھی۔ حمید نے کم از کم بیس دن کا کورس بتایا تھا لیکن پندرھویں ہی دن اُسے اطلاع دینی پڑی کہ وہ ''صاحب ریش'' ہوگیا ہے۔

''لیکن ابھی مجھے فراغت نصیب نہیں ہوئی۔'' دوسری طرف سے حمید کی آواز آئی۔

''امے قیوں بور کرتے ہو۔'' قاسم نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

''پانچ دن مزید انتظار کرو۔ اُس کے بعد سے چھٹیاں شروع ہوں گی۔''

''ابے چھٹی کی ایسی تی تیسی..... کیا کسی نے پکڑ کر باندھ دیا ہے کہ یہاں تک بھی نہیں آسکتے۔''

''جس ہوٹل میں تم ٹھہرے ہوئے ہو اُس کے قریب سے گزرنا بھی میرے لئے باعث توہین ہوگا۔''

''بڑے نواب جادے ہیں سالے۔'' قاسم بھنا کر بولا اور ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا اور خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ ''ابے ہاں تو قیا میں دودھ پیتا بچہ ہوں..... دیکھا جائے غا۔''

پھر وہ تنہا ہی ہوٹل سے نکل کھڑا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک ایسے شوروم میں داخل ہوا جہاں موسیقی کے آلات فروخت کئے جاتے تھے۔ وہاں سے ایک گٹار خریدا اور اُسے کاندھے پر ڈال کر یونہی بے مقصد آوارہ گردی کی ٹھان لی۔ جدھر سے بھی گزرتا لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ دیکھنے لگتے۔ ایسا دیوزاد ہپی

شائد ہی کبھی نظروں سے گزرا ہو۔

پیدل چلتے چلتے تھک گیا تو بھنا کر ایک ٹیکسی میں بیٹھا اور پھر ہوٹل کی طرف پلٹ آیا۔

کمرے میں پہنچ کر وہ فون کی طرف جھپٹا اور بڑے طیش کے عالم میں ایکسچینج کو کیپٹن حمید کے نمبر بتائے اور دوسری طرف سے رابطہ قائم ہوتے ہی ماؤتھ پیس میں دہاڑا۔ ''اُلو کی طرح گھوم پھر کر واپس آ غیا ہوں۔''

''اُلو کو اُجالے میں نکلنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔'' حمید کی آواز آئی۔

''سالے تم نے پھر میرا کباڑا کیا ہے۔''

''صبر سے کام لو..... پانچ دن بعد۔''

''قیا ہوغا پانچ دن بعد۔ ہپی لونڈیاں آسمان سے برسیں گی۔'' قاسم دانت پیس کر بولا۔ ''تم نے مجھے اُلو بنایا ہے۔''

''اتنا بڑا اُلو میرا باپ بھی نہیں بنا سکتا۔'' حمید کی آواز آئی۔

''چپ رہو۔ خدا تمہیں غارت کرے۔ دربدر کر دیا مجھ قو.....!''

''تاؤ کھانے کی ضرورت نہیں۔ اگر میری عدم موجودگی میں کوئی ہپی عورت مل بھی گئی تو تم اُس سے کہو گے کیا۔''

''ابے ہاں..... یہ بات تو ہے۔'' قاسم یک بیک ڈھیلا پڑ گیا۔

''لہٰذا پانچ دن بعد جب میں بھی پوری طرح ہپی بن جاؤں گا تو پھر بات بنے گی۔''

''تم بھی بنو گے۔'' قاسم نے حیرت سے کہا۔

''اگر کبھی ہپی کے ساتھ کوئی شریف آدمی دکھائی دیا ہو تو بتاؤ۔''

''وہ تو نہیں دکھائی دیتا۔''

''بس تو پھر مزید پانچ دن صبر کرو۔''

''اور یہیں پڑا رہوں۔''

''کیا حرج ہے۔ اس طرح تمہاری تڑپ اور بڑھے گی اور تم کام کے ہپی بن جاؤ گے۔''

''اکیلے مجھے شرم آتی ہے..... گھبرا قر ایک گٹار خرید لیا ہے۔''

''یہ تو تم نے بہت اچھا کیا..... اب آرام سے بیٹھو اور گٹار پر زوزو، زور زو زو میرا

محبوبہ ہے تو......بجانے کی کوشش کرو۔"

"ابے ہاں یہ زوزوزو، زور قیا ہے۔"

"کتے کو چک چک، چک چک کرکے بلاتے ہیں نا......اسی طرح محبوب کو بلانے کے لئے زوزو، زوزو کرتے ہیں۔"

"ابے نہیں......!"

"ہاں...... ہاں......ورنہ یہ گانا اتنا مقبول کیوں ہوتا۔"

"میں نے تو نہیں دیکھا کسی کو زوزو، زوزو کرتے۔"

"تم نے ابھی محبوب ہی کہاں دیکھا ہے۔"

"اکیلے مجھ سے گیٹار بھی نہیں بجے غا۔"

"اسی لئے جورو نے گھر سے نکال دیا ہے۔"

"اے جبان سنبھال کے......میں خود نقلا ہوں۔"

"اچھا......اچھا چین سے بیٹھو۔" حمید نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

قاسم نے آنکھیں نکال کر انسٹرومنٹ کو گھورا اور ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔ اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔

"قون ہے......!" قاسم دہاڑا۔

"روم سروس جناب۔" باہر سے آواز آئی۔

"آجاؤ......!"

ایک ویٹر دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔

"آپ نے طلب فرمایا ہے جناب۔"

"میں نے۔" قاسم نے سوالیہ انداز میں کہا اور ویٹر قریب آکر آہستہ سے بولا۔ "یہاں چرس پینا منع ہے۔"

"قون پیتا ہے۔" قاسم دہاڑا۔

"ناراض ہونے کی ضرورت نہیں جناب۔ میں تو یہ عرض کرنے حاضر ہوا تھا کہ چرس بھی مہیا کی جاسکے گی۔ بنے بنائے سگریٹ......بس قیمت ذرا زیادہ ہوگی۔ بیس روپے کا دس

کا پیکٹ......!"

قاسم کو اس دوران میں یاد آ گیا تھا کہ ہپی چرس بھی پیتے ہیں لہٰذا جلدی سے پرس نکالا اور دس دس کے دو نوٹ کھینچ کر اسکے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ وہ قاسم کو سگریٹ کا پیکٹ دیتا ہوا بولا۔

"اگر کسی حسین ساتھی کی ضرورت ہو تو تب بھی مجھے ہی یاد رکھئے گا۔ میرا نام شریف ہے۔"

"حسین ساتھی......قیا مطلب......!"

"آپ تو بہت بھولے معلوم ہوتے ہیں جناب۔" وہ اسکی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مسکرایا۔

"یہ کیا بدتمیجی ہے۔"

"معافی چاہتا ہوں۔ آپ زیادہ شوقین مزاج نہیں معلوم ہوتے لیکن دولت مند ضرور ہیں ورنہ یہاں کیوں تشریف لاتے۔"

"پتا نہیں تم قیسی باتیں قر رہے ہو۔" قاسم تھوک نگل کر بولا۔

"آپ کے قبیلے کے لوگ تو عموماً فٹ پاتھوں ہی پر رات بسر کرتے ہیں۔"

"اچھا......اچھا......!" قاسم سر ہلا کر بولا۔ "ہاں...... ہاں...... میں شوقیہ ہوں۔"

"شوق برا نہیں ہے۔ تو پھر لاؤں کسی کو۔"

"سوچ قر بتاؤں غا۔"

"ضرور ضرور......بس کچھ زیادہ خرچ کرنا پڑے گا۔"

"کتنا زیادہ۔"

"تین سو اُس کے ڈیڑھ سو میرے اور ڈیڑھ سو ہوٹل کے۔ آپ بہت شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں اس لئے آپ سے کھل کر بات کر رہا ہوں۔"

"چھ سو......کچھ ایسے جیادہ بھی نہیں ہیں؟"

"آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔"

"تھوڑی دیر بعد بتاؤں گا۔"

"بہت بہتر......روم سروس کو فون کر کے شریف کو طلب کر لیجئے گا۔"

وہ چلا گیا اور قاسم خاموش بیٹھا طرح طرح کے منہ بناتا رہا۔ پھر یک بیک دونوں ہاتھوں سے سر پیٹنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی کہتا بھی جا رہا تھا "لیقن میں اُس سے قہوں غا

کیا.....لیکن میں اُس سے کہوں غا کیا۔ابے حمید سالے میں قیا قہوں۔''

کرنل فریدی نے بجھا ہوا سگار ایش ٹرے میں رکھ دیا اور سامنے بیٹھے ہوئے منحنی سے زرد رو آدمی پر اچٹتی ہوئی سی نظر ڈالی۔

وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''آپ نے ابھی تک نہیں بتایا کہ مجھ سے کیوں ملنے آئے ہیں۔'' فریدی نے آہستہ سے کہا۔

''مم......میری سمجھ میں نہیں آتا کہ......آپ سے کیا کہوں......اور آپ کچھ کر بھی سکیں گے یا نہیں۔خواہ مخواہ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالوں۔وہ ہاتھ بہت لمبے ہیں۔''

''آپ خاصے پریشان معلوم ہوتے ہیں۔''

''جی ہاں......اور میں شکوہ آباد سے آیا ہوں۔''

''اوہ......اچھا......!''

''اور ایسی کہانی لایا ہوں جو صرف میری نہیں بلکہ شکوہ آباد کے لاکھوں شہریوں کی کہانی ہے اور آج کی کہانی نہیں ہے کئی سال سے ہم کتوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔عادی ہوگئے ہیں۔میں کبھی آپکے پاس نہ آتا اگر اس دوران میں ایک نئی مصیبت نازل نہ ہوگئی ہوتی۔''

''میں اُسی کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔''

''آپ کو علم ہوگا کہ وہاں کئی جگہ بموں کے دھماکے ہوئے ہیں۔لوگوں کی املاک تباہ ہوئی ہیں اور کچھ لوگ زخمی بھی ہوئے ہیں۔''

''مجھے علم ہے۔اس کے ذمہ داروں کی تلاش جاری ہے۔''

''میں ایس پی سٹی کو اسی کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا تھا لیکن اُس نے دھکے دلوا کر اپنے آفس سے نکال دیا۔''

''آپ مجھے بتائیے......!''

''میں کھل کر عرض کروں گا کہ ایس پی سٹی ان واقعات کے ذمہ دار افراد سے واقف

ہے......لیکن......!''

''ہوسکتا ہے......میں آپ کے اس خیال کی تردید نہیں کروں گا۔لیکن آپ ایس پی سٹی کو کیا بتانا چاہتے تھے۔''

''میں اُسے یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں نے ان واقعات کے ذمہ دار کو دیکھا تھا اور اُس کے جسم کی بناوٹ اور چلنے کے انداز سے اُسے پہچان سکتا ہوں۔''

''شکل سے نہیں پہچان سکتے۔''

''جی نہیں......اندھیرا پھیل چکا تھا۔جب میں نے اُسے دیکھا تھا۔''

''آپ کو علم ہے کہ شکوہ آباد میں نزارت کی تفریح گاہ شہر سے خاصی اونچائی پر واقع ہے۔شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا اور میں وہیں ایک ویران گوشے میں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔دن بھر کی تھکن کے بعد وہاں شام کی سرد ہوائیں نیند ہی لاتی ہیں۔بہرحال میں نے اپنے قریب ہی بھاری قدموں کی آوازیں سنیں اور چونک پڑا۔وہ ایک لمبا تڑنگا اور قوی ہیکل آدمی تھا اور اپنی دھن میں آگے بڑھا جارہا تھا۔میری طرف توجہ تک نہیں دی۔مطلب یہ کہ شاید اُسے علم نہیں تھا کہ اُس گوشے میں اُس کے علاوہ اور کوئی بھی موجود ہے۔وہ چٹان کے سرے کی طرف بڑھتا رہا۔مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں وہ نادانستگی میں چٹان کے نیچے ہی نہ جاپڑے۔ہوسکتا ہے کوئی سیاح ہو۔پہلی بار ادھر آیا ہو۔میں اُسے آگاہ کرنے کے لئے اٹھ ہی رہا تھا کہ وہ چٹان کے سرے پر پہنچ کر رک گیا۔میں پھر بیٹھ گیا اور اُس کی طرف سے توجہ ہٹالی۔لیکن تھوڑی دیر بعد پھر متوجہ ہونا پڑا کیونکہ وہ اونچی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا اور جو کچھ بھی کہہ رہا تھا اتنا واضح تھا کہ اس کا ایک ایک لفظ مجھے آج بھی یاد ہے۔''

''کیا کہہ رہا تھا۔'' فریدی نے دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

''وہ کہہ رہا تھا کہ اے روشنیوں کے شہر میں تجھے اندھیروں کی گود میں سلا دوں گا۔تیرے سارے حسن کو خاک میں ملا دوں گا۔شاید تجھے یاد نہیں کہ اٹھارہ سال پہلے تیری گود میں ایک عورت بیوہ ہوئی تھی اور تو نے اُسے سر چھپانے تک کی جگہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔شکاری کتے اس پر جھپٹے تھے اور تو نے اُسے پستیوں میں دھکیل دیا تھا۔میں تیری اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔''

''خوب......!'' فریدی سر ہلا کر رہ گیا اور اجنبی کہتا رہا۔

''بس جناب عالی! دوسرے ہی دن سے وہ دھماکے شروع ہو گئے تھے۔''

''تو آپ یہی کہانی شکوہ آباد کے ایس پی کو سنانا چاہتے تھے۔'' فریدی نے پوچھا۔

''جی ہاں......!''

''اور اُس نے سننے سے انکار کر دیا تھا۔''

''جی ہاں......!''

''اچھا ہی ہوا۔''

''میں نہیں سمجھا جناب۔'' اجنبی کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ظاہر ہے کہ آپ اُس شخص کی نشاندہی نہ کر سکتے اور ایس پی آپ کو پریشان کر ڈالتا۔ اُس کی شہرت اچھی نہیں ہے۔''

''اور اُس کے معاملے میں وہاں سے لے کر یہاں تک سب بے بس ہیں۔ وہاں نہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اُس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے اور نہ سیشن جج۔'' اجنبی نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''آپ کا تعلق کسی سیاسی جماعت سے تو نہیں ہے۔''

''جی نہیں۔'' اجنبی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''لیکن وہ جب چاہے ہر ایک کو کسی سیاسی جماعت سے منسلک کر کے ناکوں چنے چبوا سکتا ہے۔''

''ممکن ہے آپ کا خیال درست ہو۔ وہ بہت دنوں سے وہاں ملک دشمن اور تخریب کار عناصر سے برسرِپیکار ہے۔''

''اگر اُس کے بارے میں آپ کی یہی رائے ہے تو ناحق میں نے اتنا لمبا سفر کیا۔'' اس نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

''آپ نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

''میرا نام شیر افگن ہے اور میں آج تک ایک چوہا بھی نہیں مار سکا۔''

''آپ خاکساری سے کام لے رہے ہیں جناب۔'' فریدی مسکرا کر بولا۔ ''آپ بڑے دل گردے والے لگتے ہیں۔ آپ کے علاوہ آج تک اور کوئی مرکز والوں کے پاس ایس پی شکوہ آباد کی شکایت نہیں لایا۔''

''اگر وہ میری بات سن لیتا تو میں بھی نہ آتا۔''

''مجھے حیرت ہے؟'' فریدی بولا۔

''کس بات پر......!''

''اس آدمی کی باتوں سے اس حد تک متاثر ہونے کے باوجود بھی آپ نے اس کا تعاقب نہیں کیا۔''

''یقیناً کرتا۔'' وہ لمبی سانس لے کر بولا۔ ''لیکن اُس نامراد مرض کو کیا کروں جو کبھی کبھی بڑے بے تکے مواقع پر اُبھر آتا ہے۔''

''اوہ......!''

''بیٹھے بیٹھے پیر اچانک سو جاتے ہیں اور کم از کم آدھے گھنٹے تک اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کر سکتا۔''

''یہ کبھی کبھی ہوتا ہے۔''

''جی ہاں...... بہت علاج کیا۔ لیکن شفا نہ ہوئی۔ بس دوائیں استعمال کرنے سے جلدی جلدی مرض کا حملہ نہیں ہوتا۔''

''دیسی طریق علاج بھی کبھی آزمایا۔''

''نہ جانے کتنے اقسام کے تیلوں کی مالش کرا ڈالی ہوگی۔''

''سوال تو یہ ہے کہ آپ اُسے پہچانیں گے کس طرح اگر کہیں مل بھی گیا۔ یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکیں گے کہ یہ وہی ہے۔ بے شمار قدآور اور بھاری جسم والے شکوہ آباد میں ہوں گے۔''

''اپنے چلنے کے انداز کی بناء پر پہچانا جا سکتا ہے۔''

''سمجھ میں آنے والی بات ہے۔'' فریدی سر ہلا کر پُرتفکر لہجے میں بولا۔

''چلنے کے انداز سے میں اُسے پہچان لوں گا۔''

''اور آواز تو پہچان ہی سکیں گے۔''

''بالکل...... بالکل......!''

''آواز سے جوان لگ رہا تھا یا معمر......!''

''یہ کہنا مشکل ہے۔بعض جوانوں کی آوازیں بھی بوڑھوں جیسی ہوتی ہیں۔''

''زیادہ تر ایسا نہیں ہوتا۔''

''بہرحال میں یقین کے ساتھ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اُس آواز کو ہزاروں میں پہچان لوں گا۔''

''اور اُس کا دوبارہ ملنا محض اتفاق ہی پر مبنی ہوگا۔''

''بس یہی ایک دشواری ہے۔''

''ہے نا دشواری۔'' فریدی مسکرا کر بولا۔''لیکن شاید میں آپ کے اس مرض کے سلسلے میں کچھ کرسکوں جس کا ذکر ابھی آپ نے کیا تھا۔''

''آپ اس کے لئے کیا کرسکیں گے۔''

''علاج......! میرا ایک شناسا شکوہ آباد ہی میں رہتا ہے اور علم العقاقیر کا ماہر ہے۔''

''علم العقاقیر کیا؟ میں نہیں سمجھا۔''

''جڑی بوٹیوں کا علم۔ اُسکے پاس بے شمار نسخے ہیں۔ شاید آپ اُسے جانتے بھی ہوں۔''

''یہ پروفیسر ملیٹھی کا ذکر تو نہیں ہے۔''

''وہی وہی۔'' فریدی سر ہلا کر بولا۔''جڑی بوٹیوں کے خبط ہی کی بناء پر شاید آپ لوگوں نے اُسے یہ نام دیا ہے۔ ورنہ کبھی پروفیسر خلجی کہلاتا تھا۔''

''وہ تو دیوانہ ہے جناب۔''

''اور شاید آپ کے بیان کردہ حلئے پر بھی پورا اترتا ہے۔ خاصا لحیم شحیم ہے۔ پتہ نہیں چلنے کا انداز بھی اُسی کے مطابق ہے یا نہیں۔''

اجنبی کچھ نہ بولا۔کسی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ شاید فریدی کے اس ریمارک نے اُسے حافظے پر زور ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بولا۔''یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔''

''وہ تنہائی میں بڑبڑاتا بھی رہتا ہے۔ دھمکیاں دینے کی بھی عادت ہے۔''

''اب آپ نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔''

''آواز کو بھی یاد کیجئے۔ پہلے بھی آپ نے اُس کی آواز سنی ہوگی۔''

''نہیں جناب! آواز پروفیسر کی ہرگز نہیں ہوسکتی۔ پروفیسر کی آواز تو ہر حال میں پہچانی جائے گی۔ اتنا لمبا چوڑا ہونے کے باوجود بھی چیں چیں بولتا ہے۔''

''اور شاید اُس کی زندگی میں کبھی کوئی ایسی بیوہ عورت بھی نہ رہی ہو جس کے لئے وہ شکوہ آباد کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے پر تل جائے۔''

''مجھے اس کا علم نہیں۔''

''تو پھر یہ دھماکے......؟''

''میں یہی سوال لے کر حاضر ہوا ہوں۔ شکوہ آباد میں اب کوئی بھی محفوظ نہیں رہا۔ تخریب کار کسی خاص اور اہم آدمی کو نشانہ بناتے ہیں۔ لیکن اس بار تو جسے بھی چاہا......!''

''میرا بھی یہی خیال ہے کہ عام دہشت گردی کی سی صورت ہے۔''

وہ کچھ نہ بولا۔ فریدی نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ تھوڑی دیر بعد شیر افگن نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔''میں اس وقت خود کو اول درجے کا بیوقوف محسوس کر رہا ہوں۔''

''آخر کیوں؟'' فریدی کے لہجے میں حیرت تھی۔

''میں نے خواہ مخواہ آپ کا وقت برباد کیا۔''

''ہرگز نہیں شیر افگن صاحب! آپ کو اس وقت سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچا ہے کہ اب آپ خود کو اس مرض سے نجات پایا ہی ہوا سمجھئے۔''

''لیکن میں اس مرض کی دوا لینے تو نہیں آیا تھا آپ کے پاس۔''

''میں سمجھتا ہوں۔'' فریدی سر ہلا کر بولا۔''آپ چاہتے ہیں کہ میں شکوہ آباد کے معاملات میں مداخلت کروں۔''

''جی ہاں......میں یہی چاہتا ہوں۔'' شیر افگن خوش ہوکر بولا۔

''لیکن اب یہ میرے لئے ممکن نہیں ہے۔'' فریدی آہستہ سے بولا۔

''مجھ سے وہ اجازت نامہ واپس لے لیا گیا ہے جس کے تحت میں اتنا بااختیار تھا۔''

''مجھے حیرت ہے۔''

''آپ کو حیرت نہ ہونی چاہئے۔ سیاسی حالات آپ کے سامنے ہیں۔''

''اوہ.....تو کیا آپ پر بھی اس کا اثر پڑا ہے۔''

''مجھ پر ہی نہیں...... ہر اصول پسند آدمی بے دست و پا ہو کر رہ گیا ہے۔''

''اور اس بھیڑیئے کو شکوہ آباد میں کھلی چھٹی ہے۔''

''کس بھیڑیئے کی بات کر رہے ہیں وہ جسے آپ نے نزارت کی تفریح گاہ میں دیکھا تھا۔''

''جی نہیں...... میں اُس بھیڑیئے کی بات کر رہا ہوں جس نے مجھے اپنے دفتر سے نکلوا دیا تھا۔ شکوہ آباد کے بے تاج بادشاہ کی بات کر رہا ہوں۔ وہ جو ملکی قوانین کو پس پشت ڈال کر اپنے قوانین خود وضع کرتا ہے جس کی بیداد کی فریاد، شکوہ آباد کی کوئی عدالت بھی نہیں سن سکتی۔''

''مجھے علم ہے شیر افگن صاحب۔''

''شکوہ آباد شریفوں کے رہنے کی جگہ نہیں رہی۔ لیکن ہم اپنی زمینیں اور املاک چھوڑ کر کہاں جائیں۔ غیر ملکی ہپیوں کے غول کے غول چاروں طرف دندناتے پھرتے ہیں۔ کھلے عام منشیات کی اسمگلنگ اور تجارت ہوتی ہے۔ جہاں کسی نے احتجاج کیا تخریب کاری کے الزام میں دھر لیا گیا۔''

''میں سب کچھ جانتا ہوں شیر افگن صاحب...... لیکن جب تک میرے محکمے کا سربراہ مجھے وہاں کسی کام پر نہ لگائے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔''

''پھر بھی آپ کہتے ہیں کہ میں خود کو بیوقوف محسوس نہ کروں۔''

''لیکن اگر میں اپنے کچھ دن شکوہ آباد میں گزارنا چاہوں تو اس میں کوئی قباحت نہ ہوگی۔ میں اپنی چھٹیاں وہیں گزاروں گا جو پانچ دن بعد سے شروع ہو جائیں گی۔''

''کیا پہلے ہی سے ارادہ تھا۔''

''جی ہاں...... اس دوران میں میرے کئی قریبی دوست بھی تخریب کار بنا دیئے گئے ہیں لیکن میں اس پر تیار نہیں ہوا۔''

''اُوہ تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ نجی طور پر......''

''اور پھر اُسی دوران میں آپ کے مرض کا بھی علاج ہو جائے گا۔''

''لیکن میں پروفیسر خلجی کے ہتھے نہیں چڑھنا چاہتا۔''

''فکر نہ کیجئے۔ سب کچھ میری نگرانی میں ہوگا۔ میں اُسے بھٹکنے نہیں دوں گا۔''

''ہاں...... اب اُس اجنبی کے بارے میں مزید کچھ بتایئے جسے اپ نے نزارت کی

تفریح گاہ میں دیکھا تھا۔''

''اُس کے بارے میں جو کچھ بھی جانتا تھا آپ کو بتا چکا ہوں۔''

''آپ کو یقین ہے کہ اس دوران میں بڑے پیمانے پر جو دھماکے ہوئے ہیں اس میں اسی کا ہاتھ ہے۔''

''پھر اور کیا سمجھوں جب کہ اس کے دوسرے ہی دن سے یہ سلسلہ شروع ہوا تھا۔''

''خاصا ڈرامائی انداز ہے۔ شام کے دھندلکے میں وہ نزارت کی ایک اونچی چٹان پر کھڑا ہو کر شکوہ آباد کی روشنیوں پر نظر ڈالتا ہے اور مکالمے بولنا شروع کر دیتا ہے کہیں اُس نے آپ کو دیکھ تو نہیں لیا تھا۔''

''خدا جانے......اوہ......تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اُس نے مجھے سنانے کے لئے یہ بکواس کی تھی۔''

''اتنی بے دردی سے اُسے بکواس نہ کہئے جب کہ اُس میں کسی ستم رسیدہ بیوہ کا بھی ذکر تھا۔ لیکن اٹھارہ سال پہلے کی بات تھی۔ کیا اٹھارہ سال پہلے کے کسی وقوعے کا حوالہ اُس تقریر کو زیادہ مؤثر بنا سکتا تھا۔''

''میں بھلا اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''اٹھارہ سال پہلے تو ایس پی شہباز بھی شکوہ آباد میں نہیں تھا۔ پھر وہ کون تھا جس نے اٹھارہ سال پہلے کسی بیوہ پر ستم ڈھایا تھا۔ آپ کی عمر تو وہیں گزری ہے کیا آپ کو اس سلسلے میں کچھ یاد پڑتا ہے۔''

''جی نہیں! میں نے اُس پر بہت غور کیا ہے لیکن مجھے ایسا کوئی واقعہ یاد نہیں آیا۔''

''خیر میں دیکھوں گا۔''

''بہر حال...... بہت بہت شکریہ کرنل صاحب! میرا مشن ناکام نہیں رہا۔''

''لیکن یہ بات ابھی تک صاف نہیں ہوسکی کہ آپ اُس گمنام آدمی کی شکایت لے کر آئے ہیں یا ایس پی شہباز کی۔''

''بنیادی طور پر ایس پی شہباز ہی کی شکایت سمجھئے کیونکہ اس نے میری بات نہیں سنی تھی اور دھڑا دھڑ گرفتاریاں شروع کر دی تھیں۔''

"آپ کا خیال ہے کہ وہ گرفتاریاں ناجائز ہیں۔"

"جی ہاں! میں یہی سمجھتا ہوں۔ بلکہ شکوہ آباد کے زیادہ تر لوگ تو یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ ان دھماکوں میں خود شہباز ہی کا ہاتھ ہے۔ کچھ مخصوص لوگوں کو حراساں کرنے کے لئے اُس نے یہ حرکت کی ہے۔"

"لیکن آپ کے ذہن میں وہی اجنبی ہے۔"

"ایسے حالات میں اور کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"خیر جناب...... آپ سے بڑی مدد ملے گی۔"

"اب اجازت دیجئے۔" شیر افگن اٹھتا ہوا بولا۔ پستہ قد اور دبلا پتلا آدمی تھا۔ عمر چالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ چہرہ جھریایا ہوا اور زرد تھا۔ آنکھیں بھی دھندلی تھیں۔

فریدی سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔

یہ ایک نجی ملاقات تھی اور فریدی کی کوٹھی میں ہوئی تھی۔ اُس کے رخصت ہو جانے کے بعد فریدی نے بجھا ہوا سگار دوبارہ سلگایا اور اسے ہونٹوں میں دبائے ہوئے فون پر کسی کے نمبر ڈائیل کرنے لگا۔

دوسری طرف سے جواب ملنے پر بولا۔ "ابھی ابھی کوٹھی سے ایک ٹیکسی جس کا نمبر ایکس وائی، زیڈ تین ہزار چار سو ہے نکلی ہے۔ اس کا تعاقب کرو۔"

پھر اُس نے شیر افگن کا حلیہ دہرا کر کہا۔ "تمہیں یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کہاں جاتا ہے اور کن لوگوں سے ملاقات کر رہا ہے۔"

کال کا سلسلہ منقطع کر کے وہ ڈائننگ روم سے باہر نکل گیا۔

تیسری بار فون کی گھنٹی بجی تھی اور حمید بھنا کر اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ قاسم کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے دو بار نظر انداز کر چکا تھا۔ اگر وہی تھا تو پیچھا چھڑا لینا کارے دارد۔ ہار کر تیسری بار ریسیور اٹھانا ہی پڑا۔

لیکن "ہیلو" نسوانی آواز میں کہی۔

"قون......!" دوسری طرف سے قاسم کی آواز آئی اور پھر حمید نے تھوک نگلنے کی آواز بھی صاف سنی۔

"آپ کون ہیں؟"

"آپ...... قق قہاں سے بول رہی ہیں۔"

"قق قہاں......!"

"اوہ ماف قیجئے غا...... میرے حلق میں درد ہو رہا ہے۔"

"تو علاج کیجئے...... فون کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"شش شاید رانگ نمبر......!" دوسری طرف سے قاسم کی آواز آئی اور یکلخت سلسلہ منقطع ہو گیا۔

حمید نے ابھی ریسیور رکھا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی پھر بجی اور حمید ریسیور اٹھا کر دہاڑا۔

"ابے کیوں بھیجہ چاٹ رہا ہے۔"

"ہوش میں ہو یا نہیں۔" دوسری طرف سے فریدی کی آواز آئی اور حمید کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹتے چھوٹتے بچا۔

"اوہ معاف کیجئے گا۔ قاسم بہت دیر سے پریشان کر رہا ہے۔"

"جس عالم میں بھی ہو اُٹھ کر نیاگرا چلے آؤ۔"

"بب...... بہت بہتر۔"

حمید نے گھڑی دیکھی۔ رات کے ساڑھے دس بجے تھے۔ بائیں ہاتھ سے سر سہلاتے ہوئے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ آرام کرنے کا موڈ تھا اور اس حد تک تھا کہ قاسم کے ساتھ متوقع تفریح سے بھی روگردانی کی تھی۔

سلیپنگ سوٹ اُتار کر طوعاً کرہاً جانے کے لئے کپڑے پہنے اور گیراج میں پہنچ کر اُس گاڑی کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگا جس کی بیٹری ڈاؤن تھی۔

ملازموں نے کہا صاحب دوسری گاڑی نکال لیجئے! بس شامت آ گئی سبھوں کی۔ آپے سے باہر ہو کر بولا۔ "تم مجھ سے زیادہ قابل ہو...... چلو دھکا لگاؤ۔" اس طرح بمشکل تمام گاڑی اسٹارٹ ہوئی تھی۔

خواہ مخواہ یہ حرکت کر گزرا تھا۔ جھلاہٹ بُری چیز ہے۔ عقل خبط ہو کر رہ جاتی ہے۔

اور پھر وہی ہوا جس کا خدشہ اس جھلاہٹ کے باوجود بھی تھا۔ یعنی لائٹ جل جانے کے بعد بیٹری کا رہا سہا دم بھی نکل گیا اور گاڑی دو ڈھائی میل چلنے کے بعد بند ہو گئی اور جھٹکے لے کر بند ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ٹنکی میں پٹرول بھی نہیں تھا۔

اب اپنی اس حماقت پر غصہ آنے لگا تھا۔ سڑکیں سنسان ہوتی جا رہی تھیں اور سردی شباب پر تھی۔ گاڑی سے اُتر کر خواہ مخواہ بونٹ اُٹھایا اس طرح انجن پر جھک پڑا جیسے کوئی سمجھ میں نہ آنے والی خرابی واقع ہو گئی ہو۔

گاڑیاں گزرتی رہیں لیکن کسی نے گھاس بھی نہ ڈالی۔ جو حماقت کر بیٹھا تھا اس کی بناء پر گھر بھی فون نہیں کر سکتا تھا۔ آخر اس سے یہ ڈیوٹ پن سرزد ہی کیوں ہوا۔ دل ہی دل میں سر پیٹتا رہا۔

دراصل جھلاہٹ کی وجہ کھڑے گھاٹ ''طلبی'' نہیں تھی بلکہ طلب کرنے کا انداز تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ کوئی واقعہ ہوا ہے۔ ایسا واقعہ کہ شاید وہ چھٹیاں بھی خطرے میں پڑ جائیں جو پانچ دن بعد شروع ہونے والی تھیں۔

کچھ دیر بعد ایک خالی ٹیکسی نظر آئی۔ ہاتھ اُٹھا کر اُسے رکوایا اور ڈرائیور سے بولا۔ ''اگر مجھے اس وقت نیا گرہ پہنچا دو تو یہ گاڑی تمہاری۔''

''ارے صاحب...... نیا گرا'' اس نے دانت نکال دیئے۔

''ہاں! میں غلط نہیں کہہ رہا۔ ابھی ابھی ٹرانسفر لیٹر دے سکتا ہوں۔''

اُس نے پھر دانت نکال دیئے اور بولا۔ ''میں دیکھوں......!''

''کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔''

''گاڑی رکھنے کا وقت ہو گیا ہے صاحب اور نیا گرہ سے خالی واپس آنا پڑے گا۔ وہاں سب گاڑیوں سے جاتے ہیں۔''

''میٹر سے تین گنا زیادہ کرائے کے بل میں کیا خیال ہے۔''

''اگر ایسی بات ہے تو سر کے بل چلیں گے صاحب۔''

حمید نے گاڑی لاک کی اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ جان میں جان آئی اور اُس نے کہا۔

''جتنا تیز چل سکتے ہو چلو۔''

''لیکن صاحب ویٹنگ نہیں کروں گا۔''

''کون کہتا ہے؟''

''نہیں صاحب! میں نے کہا پہلے ہی بتا دوں۔ ابھی ابھی ایک بیگم صاحبہ چوٹ دے چکی ہیں۔ ہسپتال گئی تھیں اپنے کسی عزیز کو دیکھنے وہاں پہنچیں تو گڑگڑانے لگیں کہ بھیا بس پندرہ منٹ کی ویٹنگ کر لو یہاں سے مجھے واپسی کے لئے سواری نہیں ملے گی۔ آ گیا ان کی جھاؤلی میں۔ پورے سوا گھنٹے بعد واپس آئیں۔ کہنے لگیں تمہارا نقصان پورا کر دوں گی۔ شرافت آڑے آئی، خاموشی سے لا کر گھر چھوڑا۔ میٹر نے ویٹنگ سمیت چودہ روپے پچاس پیسے بنائے تھے۔ دہاڑنے لگیں کہ میٹر غلط چل رہا ہے۔ تم نے اُسے ایڈوانس کر رکھا ہے دس روپے سے زیادہ نہیں بن سکتے۔ اتنے میں گھر کے اندر سے ایک باوردی تھانے دار صاحب نکل آئے۔ چپ چاپ دس روپے لئے اور بھاگ کھڑا ہوا۔''

''یار تم لوگ بھی تو ٹھگتے رہتے ہو بیچاریوں کو.... میٹر سے دو روپے زیادہ لیں گے جناب۔''

''پھر اور کسے ٹھگیں جناب۔ انہی سے خود بھی ٹھگے جاتے ہیں۔ پیسوں کا تو حساب ہی نہیں کرتیں۔ چار روپے پچھتر پیسے بنے۔ واپسی کے لئے چونی نہیں ہے میرے پاس۔ بس ہضم کر گئیں پچھتر پیسے۔ پرسوں کا واقعہ سنئے، دو بیبیاں گاڑی میں بیٹھیں، کہنے لگیں فلاں جگہ ہمارا مکان بن رہا ہے، بس مستریوں کو کچھ ہدایت دیں گی اور واپسی ہو جائیں گی۔ مکان میں داخل ہوئیں۔ واقعی بن رہا تھا۔ مزدور کام کر رہے تھے۔ دس پندرہ منٹ گزر جانے کے بعد میں نے ہارن بجانا شروع کیا۔ باہر نہ آئیں تو خود اُتر کر اندر گیا، لیکن اُن بی بیوں کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ مزدوروں نے بتایا کہ وہ ان کے لئے اجنبی تھیں۔ کسی کا پتا پوچھا اور دوسری طرف سے باہر نکل گئی تھیں۔ دوڑ کر اُدھر پہنچا لیکن کس گھر کا دروازہ بجاتا۔''

حمید ہنس پڑا۔

''مجھے بھی ہنسی ہی آئی تھی۔'' ٹیکسی ڈرائیور بولا۔

''اگر پھر کبھی ملاقات ہو گئی تو۔''

''میری کون سنے گا جناب......عورتوں کا معاملہ ہے۔''

"یہ بھی ٹھیک ہے اس دن اندازاً کتنے کی چوٹ ہوئی تھی۔"

"چھ روپے چالیس پیسے کی۔"

"وہ بھی میں ہی ادا کردوں گا۔"

"اب تو آپ سے خوف معلوم ہونے لگا ہے جناب۔"

"جب تک پائی پائی ادا نہ کردوں گاڑی سے اُترنے نہ دینا۔"

بہرحال اسی طرح کی بکواس کر کے اپنا بگڑا ہوا موڈ ٹھیک کرتا چلا گیا اور نیاگرہ پہنچ کر حسب وعدہ پورا حساب بیباق کردیا۔

"اگر گھنٹے آدھ گھنٹے کی بات ہو تو ویٹ کرلوں جناب۔" ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔

"نہیں دوست! یہ رات شاید یہیں گزر جائے۔"

"یہ...... یہ پولیس کی گاڑیاں کیوں کھڑی ہوئی ہیں۔" ٹیکسی ڈرائیور چونک کر بولا۔

لیکن حمید اُترا چلا گیا۔ موڈ پھر خراب ہونے لگا تھا۔

اندر سارجنٹ امر سنگھ سے ملاقات ہوئی۔ فریدی کا کہیں پتا نہ تھا۔

"چھٹی کٹائی میں ضرور پڑے گی۔" امر سنگھ نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"ہوا کیا۔" حمید پھاڑ کھانے دوڑا۔

"قتل کے علاوہ اور کیا ہوتا۔"

"کرنل کہاں ہیں۔"

"پتا نہیں، کچھ دیر پہلے تو یہیں تھے۔"

"کس کا قتل ہوا ہے۔"

"ہوٹل کے رجسٹر میں شیر افگن نام لکھا ہوا ہے، شکوہ آباد سے آیا تھا۔"

"لیکن یہ ایک دم کرنل کہاں آ کودے۔"

"میں یہ سب کچھ نہیں جانتا۔ لیکن معاملہ عجیب ہے اس سے پہلے ایسا قتل نہ دیکھا نہ سنا...... قاتل اُس بیچارے کی گردن ریت کر بھاگا۔ لوگوں نے دوڑایا۔ لیکن وہ زینے طے کرتا ہوا آخری منزل یعنی کھلی چھت پر پہنچ گیا اور وہاں سے چھلانگ لگادی۔"

"ہڈیاں سرمہ ہوگئی ہوں گی۔"

"جی نہیں! سرمے کی مدد سے بھی نہیں تلاش کی جاسکیں۔"

"کیا مطلب......؟"

"قاتل فرار ہوگیا۔"

"اوپری منزل سے چھلانگ لگا کر فرار ہوگیا۔ بھنگ تو نہیں پی گئے۔"

"نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔ اس نے اپنی پشت پر ایک چھوٹا سا پیراشوٹ باندھ رکھا تھا۔ چھلانگ لگاتے ہی وہ کھل گیا لوگ باہر دوڑے تو اُس نے ایک ہینڈ گرنیڈ کھینچ مارا۔ بس دھاکا ہوتے ہی سب اندر...... اور وہ زمین پر پہنچ کر نہایت اطمینان سے ایک اسپورٹس کار میں فرار ہوگیا۔"

"خدا کی پناہ......!" حمید سر سہلا کر بولا۔ "واقعی چھٹیوں کا چالیسواں ہوگیا۔"

"خیریت ہوئی کہ ہینڈ گرنیڈ کے دھاکے سے کوئی زخمی نہیں ہوا۔"

"اور اب جناب کرنل صاحب اُس اسپورٹس کار کے چکر میں ہوں گے۔"

امر سنگھ کچھ نہ بولا۔ حمید نے لاش دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ امر سنگھ کے بیان کے مطابق قتل پانچویں منزل پر ہوا تھا اور قاتل چار منزلوں کی سیڑھیاں طے کر کے کھلی چھت پر پہنچا تھا۔ درمیان میں اُسے کوئی بھی نہ روک سکا۔

"اگر وہ شکوہ آباد سے آیا تھا تو وہیں کیوں نہ قتل کردیا گیا۔" حمید نے امر سنگھ کو گھورتے ہوئے فریدی کے لہجے کی نقل اُتاری۔

"کیا لاش نہیں دیکھنی۔" امر سنگھ نے مسکرا کر پوچھا۔

"نہیں...... لیکن وہ جگہ ضرور دیکھنا چاہتا ہوں جہاں سے وہ جیالا پیراشوٹ کے ذریعے اُتر کر فرار ہوا تھا۔"

"تو آیئے میرے ساتھ۔"

وہ دونوں چلتے چلتے ایک جگہ رک گئے اور حمید نے پلٹ کر ہوٹل کی عمارت کی طرف دیکھا۔

"وہ یہیں اُترا تھا۔" امر سنگھ بولا۔

عمارت سے قریباً دو سو گز کا فاصلہ ضرور ہوگا۔ حمید نے کہا۔ "تو پھر اُسے چھلانگ نہیں بلکہ اُڑان کہنا چاہیے۔"

''اسی پر تو حیرت ہے۔ دیوار کے قریب پیراشوٹ کے بیکار ہو جانے کا امکان تھا۔ لہٰذا اتنی لمبی چھلانگ لگانی ہی پڑی ہوگی کہ پیراشوٹ کے کھلنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔''

''کیا وہ خاموشی سے قتل کر کے فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ پیراشوٹ ساتھ رکھنے کا مطلب یہ ہوا کہ اُسے یہ کرتب ہر حال میں دکھانا ہی تھا؟''

''یہ کام کا نکتہ ہے۔'' امر سنگھ سر ہلا کر بولا۔

''کیا وہ میرے لئے کچھ کہہ گئے ہیں۔''

''نہیں......مجھ سے تو کچھ نہیں کہا۔''

''لاش والے کمرے میں کون ہے۔''

''فنگر پرنٹ سیکشن کام کر رہا ہے۔''

حمید نے ٹارچ امر سنگھ کے ہاتھ سے لے لی اور اُس کی روشنی میں آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ دستی بم کا ڈالا ہوا گڑھا بھی عمارت سے کچھ ہٹ کر ہی نظر آیا۔

''دھماکہ محض دہشت زدہ کرنے کے لئے تھا۔'' اُس نے کہا۔

''اس کے بغیر تو اُس کا فرار ناممکن ہی ہو جاتا۔'' امر سنگھ بولا۔ ''لیکن جناب حیرت اس پر ہے کہ اُس بے وقعت سے آدمی کے قتل کے لئے اتنا ہنگامہ۔''

''بے وقعت سے کیا مراد ہے تمہاری۔''

''آپ خود چل کر دیکھ لیجئے! زندہ دیکھتے تو ترس آتا۔ لاش پر آنسو بہانے کو جی چاہے گا۔''

''بکواس بند کرو۔ بیوی بچوں میں بیٹھ کر ایسی باتیں کی جاتی ہیں۔''

''میرا مطلب تھا کہ اس ہنگامے کی کیا ضرورت تھی۔ راہ چلتے ایک زوردار گھونسہ پسلی پر رسید کر دیا جاتا تو وہ دوسری سانس نہ لے سکتا۔''

حمید کچھ کہے بغیر عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ پانچویں منزل پر واردات والے کمرے تک پہنچنے کے لئے کسی کی رہنمائی کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ اُس کے سامنے ایک باوردی کانسٹیبل موجود تھا۔ حمید نے لاش دیکھی اور امر سنگھ کے قول کی صداقت اُس پر واضح ہوگئی۔ واقعی اُس مکھی سے آدمی کے قتل کے لئے اتنے ڈرامائی انداز کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو سچ مچ ایک ہی گھونسے کا معلوم ہوتا تھا۔ کسی تیز دھار آلے سے اُس کی گردن کاٹی گئی تھی۔ حمید اسی

الجھن میں پڑا ہوا تھا کہ آخر یہ معاملہ براہ راست فریدی تک کیسے پہنچ گیا۔

وہ کمرے سے پلٹنے ہی والا تھا کہ راہداری سے کسی نے اس کا نام لے کر مخاطب کیا۔

یہ اسسٹنٹ منیجر تھا اور اُسے اطلاع دینے آیا تھا کہ فون پر اُس کی کال ہے۔

وہ تیزی سے فون تک پہنچا اور دوسری طرف سے فریدی کی آواز سنی جو پاور ہاؤز کے قریب اُس کا منتظر تھا۔

''کیسے پہنچوں۔'' حمید ماؤتھ پیس میں بولا۔ ''گاڑی تو راستے ہی میں رہ گئی۔''

''کیا مطلب......؟''

''غلطی سے وہ گاڑی نکال لی تھی جس کی ٹنکی میں پٹرول کم تھا۔''

''احمق ہو۔ امر سنگھ کی موٹر سائیکل لے لو۔ وہ فنگر پرنٹ والوں کے ساتھ واپس چلا جائے گا۔''

''لیکن یہ چھلانگ میری سمجھ میں نہیں آئی......میرا مطلب ہے کیس کی چھلانگ۔''

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا اور حمید نے ریسیور کریڈل پر رکھ کر طویل سانس لی۔

امر سنگھ کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اپنی موٹر سائیکل اُس کے حوالے کر دی اور پھر جو سردی نے مزاج پوچھا ہے حمید صاحب کا تو آنکھوں اور ناک کی رطوبتوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔ پتہ نہیں کس طرح منزل مقصود پر پہنچا تھا۔

ٹھیک فریدی کی لنکن کے قریب جا رکا۔

''تم آ گئے۔'' فریدی کے لہجے میں کسی قدر تلخی تھی۔ آواز گاڑی کے اندر سے آئی تھی۔

''اور میرا نام دائمی نزلہ ہے۔'' حمید شوں شوں کرتا ہوا بولا۔

فریدی دروازہ کھول کر گاڑی سے اُترا اور سڑک کی بائیں جانب چلتا ہوا بولا۔ ''ادھر آؤ۔''

حمید نے خاموشی سے تعمیل کی۔ فریدی سڑک سے کچے میں اُتر گیا تھا اور ٹارچ روشن کر لی تھی۔ کچھ دور چلنے کے بعد ٹارچ کی روشنی کا دائرہ ایک اسپورٹس کار پر پڑا اور حمید نے فوراً ہی یہ بات مارک کی کہ اُس پر نمبر پلیٹ موجود نہیں ہے۔

''انجن ابھی گرم ہے۔'' فریدی نے کہا۔ ''اور دیکھو...... یہاں سے کسی اور گاڑی کے

ٹائروں کے نشانات سڑک کی طرف گئے ہیں۔"

"یہ تو آپ خود بھی دیکھ کر مطلب سمجھ سکتے تھے، مجھے کیوں خواہ مخواہ نزلے میں مبتلا کیا۔"

"تم اسپورٹس کاروں کے خبط میں بھی تو مبتلا ہو، اُس دن دعوئی کر رہے تھے کہ اس سال کے موڈل شہر میں کس کس کے پاس ہیں تمہارے علاوہ شاید ہی کوئی بتا سکے۔"

"اُوہ...... ذرا ٹارچ مجھے دیجئے...... ڈاٹسن کا نیا ماڈل...... نمبر پلیٹ غائب...... ڈاٹسن کی اسپورٹس کار...... گڈ لارڈ...... یہ گاڑی صوفیہ کی ہوسکتی ہے یا سلمان کی...... یا پھر خواجہ بخش کی۔"

"یہ سب کون ہیں؟"

"صوفیہ سیٹھ راشد کی لڑکی ہے۔ سلمان ایک صوبائی وزیر کا لڑکا ہے اور خواجہ بخش وہی ہے جس کی لانچیں پچھلے دنوں اسمگلنگ کے سلسلے میں پکڑی گئی تھیں۔"

"گاڑی کا انجن نمبر نوٹ کرو...... اور ان تینوں کو چیک کرو۔"

"لیکن یہ احمق نمبر پلیٹ کیوں نکال لے گیا۔ کیا اس کے بغیر گاڑی کے مالک کا پتا نہ لگ سکتا۔"

"دیر لگے گی...... اگر تم یہ تین نام نہ لیتے تو محض انجن نمبر کی بناء پر پتا لگانے میں خاصا وقت صرف ہوتا۔"

"بہرحال کوئی یہاں پہلے سے اُس کا منتظر تھا۔ اسپورٹ کار یہیں چھوڑی اور اُسے دوسری گاڑی میں نکال لے گیا۔ لیکن یہ تو بتایئے کہ یہ کیس براہ راست آپ تک کیسے پہنچ گیا۔"

"پھر بتاؤں گا...... وقت نہ ضائع کرو۔ ان تینوں کو فوراً چیک کرو۔"

"تو پھر موٹر سائیکل......!" حمید کراہا۔

"گاڑی لے جاؤ۔ موٹر سائیکل میرے لئے چھوڑ دو۔" فریدی جھنجھلا کر بولا۔

"تکلفاً بھی انکار نہیں کروں گا...... ورنہ میری ناک۔"

"جلدی کرو۔" فریدی اُسے سڑک کی جانب دھکیلتا ہوا بولا۔ "مجھے یہاں اس وقت تک ٹھہرنا ہے جب تک اس گاڑی کی نگرانی کے لئے کوئی نہ پہنچ جائے۔"

"سیٹھ راشد کی بیٹی سے ابتداء کرتا ہوں کہ یہاں سے قریب ترین وہی ہے۔" حمید

نے کہا اور لنکن میں آ بیٹھا۔

کچھ دور اُسی سڑک پر چلنے کے بعد گاڑی بائیں جانب کچے میں اُتار دی۔ سیٹھ راشد کی کوٹھی تک پہنچنے کے لئے شارٹ کٹ لے رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بڑی بڑی کوٹھیوں والے اُس علاقے میں داخل ہوا جہاں زیادہ تر شہر کے بڑے تاجر آباد تھے۔

سیٹھ راشد کی کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں پولیس کی ایک پٹرول کار کھڑی دیکھ کر حمید کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

"کیا قصہ ہے۔" حمید نے اُس سے پوچھا۔

"کیسا قصہ! آپ کون صاحب ہیں جناب۔"

"میں نے تم سے سوال کیا ہے اُس کا جواب چاہتا ہوں...... کون ہے اس پٹرول کار پر۔"

"ڈی ایس پی صاحب ہیں...... اندر گئے ہیں۔"

حمید نے گاڑی آگے بڑھائی اور پورچ کی طرف لیتا چلا گیا۔ اتنے میں ڈی ایس پی مذکور بھی شاید واپسی کے لئے باہر نکلا تھا۔ حمید کو گاڑی سے اُترتے دیکھ کر پورچ کے زینوں ہی پر رک گیا۔

"آپ......!" اُس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"آپ کو حیرت ہوئی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ بات میری ذات سے آگے نہیں بڑھی تھی۔"

"کون سی بات؟" حمید نے سوال کیا۔

"سیٹھ صاحب کی بیٹی کو جو واقعہ پیش آیا تھا۔"

"اوہ...... تو پھر کوئی اور بات ہوگی۔ کس کی بیٹی کو کیا واقعہ پیش آیا۔"

"مس صوفیہ سے آٹھ بجے کے قریب کسی نے اُن کی اسپورٹس کار چھین لی اور سر پر گھونسہ مار کر بیہوش کر دیا۔"

"اوہ...... لیکن کہاں۔"

"وہ نیا گرا جا رہی تھیں۔ سیاہ رنگ کی ایک بڑی گاڑی نے راستہ روک رکھا تھا۔ انہیں

بھی رُکنا پڑا۔ سیاہ گاڑی سے ایک آدمی اُترا، اُنہیں ان کی گاڑی سے باہر کھینچ لیا۔ پھر سر پر گھونسہ پڑنے کے بعد کے واقعات کا علم انہیں نہیں۔“

”آپ تک رپورٹ کیسے پہنچی۔!“ حمید نے پوچھا اور ڈی ایس پی کی آنکھوں میں الجھن کے آثار دکھائی دیئے۔

”کیا آپ کا یہ سوال کسی اہمیت کا حامل ہے۔“

”بالکل! وہ چھینی ہوئی اسپورٹس کار ایک قتل میں ملوث ہوگئی ہے۔ کیا آپ کو نیا گرہ والے قتل کی اطلاع نہیں ملی۔“

”نہیں ......میں نہیں جانتا۔ مس صوفیہ نے اس واقعے کی اطلاع قریباً نو بجے فون پر دی تھی۔“

”کیا وہ اندر موجود ہے۔“

”جی ہاں!“

”فی الحال واپسی کا ارادہ ملتوی کردیجئے۔ میرے ساتھ آیئے۔ اسپورٹس کار مل گئی ہے اور میں اس کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔“

”آپ لوگ واقعی حیرت انگیز ہیں۔“

حمید بُرا سا منہ بنائے ہوئے اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آیا۔ صوفیہ ابھی تک یہیں موجود تھی۔ سیٹھ راشد بھی تھا۔ حمید صوفیہ کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ شہر کی کسی بھی ایڈونچر پسند لڑکی کے لئے اجنبی نہیں تھا۔

”اوہ ......ہیلو کیپٹن۔“ صوفیہ لہک کر اُٹھی اور اُس سے مصافحہ کرتی ہوئی بولی۔ ”تو بات اس حد تک بڑھی ہے۔“

”خوفناک حد تک بڑھی ہے۔ ذرا دیکھئے یہ نمبر آپ ہی کی گاڑی کے انجن کا تو نہیں۔“
حمید نے کاغذ کا ایک سیاہ پرزہ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”انجن نمبر......!“ صوفیہ نے حیرت سے کہا۔ ”ارے جناب رجسٹریشن نمبر پوچھئے۔“

”نمبر پلیٹس گاڑی سے نکال لی گئی ہیں۔“

”تو کیا گاڑی مل گئی؟“ سیٹھ راشد نے پوچھا۔

”جی ہاں......!“

اتنے میں صوفیہ بولی۔ ”غالباً یہ نمبر میری ہی گاڑی کے انجن کا ہے۔ رجسٹریشن کی کتاب گاڑی ہی میں تھی۔ اُس پر انجن نمبر بھی تحریر ہے۔“

”محترمہ جو نمبر پلیٹس نکال لے گیا اُس نے رجسٹریشن بک کب چھوڑی ہوگی۔ بہرحال آپ کی گاڑی ایک قتل میں ملوث ہوگئی ہے۔“

”نہیں......!“ سیٹھ راشد اُچھل پڑا۔

”جی......!“ حمید نے کہا اور بڑے ڈرامائی انداز میں نیا گرہ والے قتل کی روداد دہرانے لگا۔

سیٹھ راشد اور صوفیہ کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

”گاڑی کہاں ہے۔“ ڈی ایس پی نے حمید کے خاموش ہوتے ہی سوال کیا۔

”پاور ہاؤز کے عقب میں۔ کرنل صاحب کے زیر نگرانی......وہ گاڑی میری کئی بار کی دیکھی ہوئی تھی اس لئے سیدھا یہیں چلا آیا۔“

”میں نے ایک بار آپ کو اُسی میں لفٹ بھی تو دی تھی۔“ صوفیہ بولی۔

”جی ہاں مجھے یاد ہے اور اب ذرا اُس آدمی کا حلیہ بیان کیجئے جس نے آپ پر حملہ کیا تھا۔“

”حلیہ......بہت مشکل ہے۔ وہاں اندھیرا تھا اور میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکی تھی۔“

”آپ کو ہوش کیسے آیا تھا اور واپسی کس طرح ہوئی تھی۔“

”خود بخود ہوش میں آئی تھی۔ سڑک کے کنارے پڑی ہوئی تھی۔ ہوش آتے ہی خوف کے مارے دم نکلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد نیا گرہ کی طرف سے ایک گاڑی آتی دکھائی دی تھی۔ بس لفٹ لے کر گھر آگئی اور گھر ہی سے مقصود صاحب کو فون کیا تھا۔“

ڈی ایس پی سر ہلا کر رہ گیا۔

”جس سے لفٹ لی تھی وہ کون تھا۔“

”نہ اُس بیچارے نے مجھ سے میرا شجرہ نسب پوچھا اور نہ میں نے اُس سے اس کا۔“

”لیکن نیا گرہ والی سڑک پر آپ کو تنہا دیکھ کر اُسے حیرت تو ہوئی ہوگی۔ کیا آپ نے اُسے اپنی کہانی سنا دی تھی۔“

”میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس سوال کی کیا اہمیت ہے۔“ سیٹھ راشد نے دخل اندازی کی۔

”میں ایک قتل کی تفتیش کر رہا ہوں اور صوفیہ صاحبہ کسی نہ کسی طرح......!“

”قتل کے سلسلے میں ان کا نام مت لیجئے۔“ راشد بات کاٹ کر بولا۔

”قاتل نے فرار کے لئے جو گاڑی استعمال کی وہ صوفیہ صاحبہ کی تھی۔“

”آپ اس کا بیان سن چکے ہیں۔“

”محترم! بات نہ بڑھایئے۔“

”آپ اس قسم کے سوالات کر رہے ہیں جیسے آپ کو اُس کے بیان پر یقین نہ ہو۔“

”یہ سوالات اسی کوشش پر مبنی ہیں کہ میں ان کے بیان پر یقین کرلوں...... ورنہ قانون کسی بیان کی صداقت کے لئے شاہد بھی طلب کرتا ہے۔“

”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ اگر کوئی اس کے بیان کی تائید نہ کرسکا تو آپ اسے مشتبہ سمجھیں گے۔“

”ڈیڈی پلیز......!“ صوفیہ ہاتھ اُٹھا کر بولی۔ ”بات نہ بڑھایئے۔ میں کیپٹن کا نکتہ نظر سمجھ رہی ہوں۔ لیکن میں اس معاملے میں بے بس ہوں۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ وہ محض رہزنی نہیں تھی تو میں لفٹ دینے والے کا نام اور پتہ ضرور نوٹ کرلیتی۔“

”حلیہ بتایئے، شاید اسی طرح کچھ کام چل جائے۔ اس کی گاڑی کا میک اور موڈل بھی یاد ہو تو بتایئے۔“

”ادھیڑ عمر کے ایک سنجیدہ سے آدمی تھے۔ چہرہ بیضوی، رنگت صاف۔ گھنی مونچھیں، پیشانی کشادہ...... گاڑی مزدا ففٹین ہنڈریڈ تھی۔ موڈل تہتر چوہتر کا ہوگا۔“

حمید کا قلم نوٹ بک کے صفحے پر چلتا رہا۔

”کیا میری موجودگی ضروری ہے۔“ ڈی ایس پی نے حمید سے پوچھا۔

”آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔“

”تو پھر میں چلوں۔“ اُس نے کہا اور ڈرائینگ روم سے نکل گیا۔

”آپ کچھ پئیں گے کیپٹن۔“ صوفیہ نے پوچھا۔

”کافی پلوا دیجئے...... بلیک۔“

”میں ابھی آئی۔“ کہتی ہوئی وہ بھی چلی گئی اور حمید نے سیٹھ راشد سے کہا۔

”مس صوفیہ میرے لئے اجنبی نہیں ہیں اور میں ان کا بہت احترام کرتا ہوں۔ آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ عدالت میں وکیل سرکار انہیں کم سے کم پریشان کرسکے۔“

”مجھے اپنے رویئے پر افسوس ہے۔ دراصل اچانک ایسی خبر سن کر۔“

”میں سمجھتا ہوں۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ لفٹ دینے والے کو ڈھونڈ نکالوں گا اور یہ مشکل بھی آسان ہوجائے گی۔“

صوفیہ واپس آگئی، اُس کے چہرے کی تازگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ بدستور مسکرا رہی تھی۔

”کسی طرح بھی سہی آپ نے میرے گھر میں قدم تو رکھا۔“ اس نے حمید سے کہا۔

”بہت پہلے آچکا ہوتا لیکن ہمارا کہیں قدم رکھنا بدشگونی ہی تصور کیا جاتا ہے۔“

”چھوڑیئے بھی۔ کیا آپ لوگوں کی کوئی سوشل لائف ہی نہیں۔“

”میری تو سوشل لائف کے علاوہ اور کوئی لائف ہی نہیں۔“

”میں بہت تھکا ہوا ہوں۔“ سیٹھ راشد اُٹھتا ہوا بولا۔

”آپ آرام کیجئے ڈیڈی۔“ صوفیہ نے ہنس کر کہا۔ ”کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ میں اس قتل میں ملوث نہیں ہوں۔“

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ حمید بولا۔

سیٹھ راشد چلا گیا اور اتنے میں ایک ملازم کافی کی ٹرالی سمیت ڈرائینگ روم میں داخل ہوا۔

”فرار کا ایسا طریقہ نہ کبھی دیکھا اور نہ سنا۔“ صوفیہ بولی۔

حمید کچھ نہ بولا۔ وہ خود ہی اپنے لئے کافی انڈیلنے لگا تھا۔ دوسری پیالی صوفیہ کی طرف سرکادی۔

”تو آپ لفٹ دینے والے کو تلاش کریں گے۔“ صوفیہ نے پوچھا۔

”آپ کو شبہے سے بالاتر کردینے کے لئے یہ ضروری ہوگا۔“

”مجھ پر کس قسم کا شبہ کیا جاسکتا ہے۔“

"اعانت جرم کا......فرار کے لئے آپ ہی نے اپنی گاڑی مہیا کی تھی۔"

"بڑا مضحکہ خیز خیال ہے۔"

"ہے تو......لیکن رات......آخر نمبر پلیٹس کیوں نکالی گئیں۔"

"میں کیا بتاؤں؟"

"یہ سوال آپ سے نہیں تھا؟ میں خود سوچ رہا ہوں اگر وہ محض رہزنی تھی تو رہزن کو نمبر پلیٹیں نکالنے سے کیا فائدہ پہنچا۔"

"ہاں ہے تو الجھاوے کی بات۔"

"میں نے یہ نہ سیٹھ صاحب کی موجودگی میں اس لئے نہیں اُٹھایا تھا کہ وہ اور زیادہ پریشان ہوجائیں گے۔"

"آپ نے اچھا کیا......لیکن یقین کریں کہ اس قتل سے میرا کوئی تعلق نہیں اور ہاں مقتول کی بھی شناخت ہوئی یا نہیں۔"

"نیاگرہ کے رجسٹر میں اُس نے اپنا نام شیرافگن لکھوایا تھا۔ سکونت کے خانے میں شکوہ آباد درج تھا۔"

"نہیں......!" صوفیہ بوکھلا کر کھڑی ہوگئی۔

"کیا دُبلے پتلے اور پستہ قد تھے۔"

"آپ بالکل صحیح حلیہ بیان کررہی ہیں۔"

"ڈیڈی......!" دفعتاً وہ حلق پھاڑ کر چیخی اور گرتی پڑتی بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی۔ کافی پاٹ ٹرالی سے اُچھل کر قالین پر جاپڑا تھا۔ حمید ہکا بکا بیٹھا رہ گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب اُسے کیا کرنا چاہیے۔ قتل سے ان لوگوں کا تعلق رہا ہو یا نہ رہا ہو لیکن شاید مقتول سے کوئی تعلق ضرور تھا۔ ورنہ وہ اس طرح بدحواس نہ ہوتی۔ اُس نے اُٹھ کر قالین پر پڑا ہوا کافی پاٹ اُٹھایا اور کافی کے اُس تاریک دھبے کو دیکھنے لگا جس نے ایک بیش قیمت قالین کا ستیاناس کردیا تھا۔

"تو وہ سیٹھ راشد کا سوتیلا بھائی تھا۔" کرنل فریدی نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر کہا۔ حمید کچھ نہ بولا۔ پوری روداد پہلے ہی سن چکا تھا۔

"لیکن نمبر پلیٹوں کا معاملہ۔" فریدی اُس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

"اس انکشاف کے بعد سے یہ الجھن بھی رفع ہوگئی ہے۔" حمید نے کہا۔ "صاف ظاہر ہے کہ کوئی اس قتل کو سیٹھ راشد کے سر تھوپنا چاہتا ہے۔ ورنہ نمبر پلیٹیں کیوں نکال لے جاتا۔"

"بظاہر الجھن رفع کردینے ہی والی بات ہے۔"

"لیکن بباطن......؟" حمید نے سوال کیا۔

"کچھ نہیں......فی الحال اس سلسلے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔"

"میں رات ہی سے پوچھ رہا ہوں کہ آخر یہ معاملہ براہِ راست آپ تک کیسے پہنچ گیا۔"

"معاملہ نہیں پہنچا بلکہ معاملے تک خود مجھے پہنچنا پڑا تھا۔"

"میں نہیں سمجھا۔"

"شیرافگن صرف مجھ سے ملنے یہاں آیا تھا اور میں اس کی نگرانی کرا رہا تھا۔ اس طرح بات فوراً مجھ تک پہنچ گئی۔ نگرانی کرنے والا اس وقت نیاگرہ ہی میں موجود تھا جب یہ قتل ہوا۔"

حمید نے تیزی سے کھوپڑی سہلائی اور چھٹیوں کے جنازے پر پھول چڑھا دیئے۔

"ویسے بھی میں یہ چھٹیاں شکوہ آباد میں گزارتا۔" فریدی بولا۔

"کک......کیوں......؟"

"ایسی ہی کوئی بات تھی اور تم نادانستگی میں شمال کی تفریح گاہوں کا ذکر کرکے خوش ہولیا کرتے تھے۔ شکوہ آباد بھی اُنہی تفریح گاہوں میں سے ایک ہے۔"

"یعنی چھٹیوں میں بھی آپ کو وہاں کوئی کام کرنا تھا۔"

"ظاہر ہے۔"

"ایس پی شہباز کا کوئی معاملہ ہے۔"

''اس کے علاوہ وہاں اور کیا رکھا ہے۔'' فریدی نے کہا اور شیر افگن سے اپنی گفتگو کے بارے میں بتانے لگا۔

حمید نے اس کے خاموش ہونے پر کئی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لی تھیں اور اپنی نبض ٹٹولنے لگا تھا۔

''تمہیں کیا تکلیف ہے؟'' فریدی نے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے تو کوئی تکلیف نہیں ہے لیکن وہ بے موت مارا جائے گا۔''

''کون......؟''

''قاسم......!''

''کیا مطلب......؟''

''وہ ایک ہوٹل میں ہپی بنا بیٹھا ہے۔ گھر سے نکالا گیا ہے۔ میں نے کہا تھا اُسے ہپی بنا کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ اس طرح وہ ہپی عورتوں سے متعلق بھی اپنی معلومات میں اضافہ کر سکے گا۔''

''اُوہ...... بڑی عمدہ بات سجھائی تم نے۔'' فریدی نے کہا اور بیٹھ کر سگار سلگانے لگا۔ حمید اُسے حیرت سے دیکھے جا رہا تھا۔ آخر اس میں خوشی کی کیا بات تھی۔ وہ تو سمجھا تھا کہ اس سلسلے میں بھی اسے سخت سست سننا پڑے گا۔

سگار سلگا کر اُس نے کہا۔ ''تم بھی ہپی بنو گے۔''

''میں......!'' حمید اچھل پڑا۔

''ہپی عورتوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی خواہش تمہیں بھی ہوگی۔''

''کیوں مذاق کر رہے ہیں۔''

''نہیں...... میں سیریس ہوں۔ تم دونوں سرحد پار جاؤ گے اور وہاں ہپیوں کے کسی ایسے قافلے سے جلد ملو گے جو غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے ادھر آنا چاہتا ہو۔''

''اس سے کیا ہوگا۔''

''بس اپنی آنکھیں کھلی رکھنا...... میں شہباز کو کئی اطراف سے گھیرنا چاہتا ہوں۔''

''تو کیا اس قتل میں شہباز کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔''

''میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔ اگر خود اُسے اپنی زندگی خطرے میں نظر آتی تو اس کا ذکر مجھ سے ضرور کرتا۔''

''کھلی ہوئی بات ہے۔''

''یہ قتل میرے لئے چیلنج بھی ہو سکتا ہے۔''

''میں سمجھ گیا۔ آپ اس قتل کے توسط سے باضابطہ طور پر شکوہ آباد جا سکیں گے۔''

''ضروری نہیں ہے۔ اوپر والے کسی اور کے سپرد بھی کر سکتے ہیں کیس۔''

''لیکن آپ اسی پر اڑ جائیں گے کہ آپ ہی جائیں گے۔''

''وہ میرے پاس آیا تھا اور کسی بڑے جرم کی نشاندہی کرنا چاہتا تھا۔ خیر...... میرے ساتھ آؤ۔'' فریدی دروازے کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ ''ذرا سیٹھ راشد سے بھی دو دو باتیں ہو جائیں۔''

دن کے دس بجے تھے۔ سیٹھ راشد گھر ہی پر موجود تھا۔ صوفیہ سے ملاقات ہوئی اور اس نے بتایا کہ اُس انکشاف کے بعد سیٹھ راشد پر دل کا دورہ پڑا تھا۔ ساری رات گھر والوں نے جاگ کر گزاری تھی۔

''اب کیا کیفیت ہے!'' فریدی نے پوچھا۔

''سو رہے ہیں۔ آپ انہیں فی الحال نہ چھیڑیں تو بہتر ہوگا۔ میں آپ کے سوالات کے جواب دے سکوں گی۔''

''بات دراصل یہ ہے مس صوفیہ کہ شیر افگن صاحب صرف مجھ سے ملاقات کی غرض سے یہاں آئے تھے۔''

''آپ سے۔'' صوفیہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

''جی ہاں اور اُنہوں نے قطعی اس کا ذکر نہیں کیا تھا کہ شہر میں ان کا کوئی رشتہ دار بھی ہے۔''

''بڑی عجیب بات ہے کہ آپ سے ملنے آئے اور قتل کر دیئے گئے۔ بہرحال یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ڈیڈی سے اُن کے تعلقات بہتر نہیں تھے ورنہ وہ نیاگرہ کی بجائے یہیں قیام کرتے۔ ہمیں شہر میں ان کی موجودگی کا علم نہیں تھا۔''

''اور اس قتل کے سلسلے میں آپ کی گاڑی اس طرح استعمال کی گئی۔''

''آپ خود ہی غور فرمائیے۔'' صوفیہ طویل سانس لے کر بولی۔ ''یہ قتل ہمارے سر منڈھنے کی کوشش کی گئی ہے ورنہ بقول حمید صاحب ایک لاتعلق رہزن کو نمبر پلیٹ نکال لے جانے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔''

فریدی کچھ نہ بولا۔ صوفیہ نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ''چچا شیر افگن اور ڈیڈی کے درمیان کوئی ایسا تنازعہ بھی نہیں تھا جس میں مال یا جائیداد کا دخل ہوتا۔ دادا کے ورثے کا بٹوارہ اسی طرح ہوا تھا جیسے قانوناً اور شرعاً ہونا چاہئے۔ کسی نے کسی کا کچھ دبا لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بس چچا شیر افگن، ڈیڈی کو فرعون بے ساماں کہتے تھے اور ان کے مقابلے میں خود کو انسانی قدروں کا حامل سمجھتے تھے کہ میں کسی مغرور آدمی سے راہ و رسم نہیں رکھ سکتا خواہ میرا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔''

''آپ لوگوں کا بزنس شکوہ آباد میں بھی ہے۔'' فریدی نے سوال کیا۔

''ہماری ایک ٹینری بھی ہے نا۔ اس کے لئے شکوہ آباد سے خام چمڑہ آتا ہے۔ اُسے جو چاہے سمجھ لیجئے۔ اسی حد تک بزنس ہے۔''

''شیر افگن صاحب کے کاروبار اور انکے متعلقین کے بارے میں بھی جاننا چاہتا ہوں۔''

''مویشیوں کی فارمنگ کرتے تھے خاصا بڑا کاروبار ہے۔ سرتا پا انسانیت میں ڈوبے ہوئے تھے اس لئے ایک ایسی بیوہ سے شادی کی تھی جس کے ایک جوان بیٹا بھی تھا۔ خود اُن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔''

''تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ اب وہی ماں بیٹے اُن کے کاروبار پر قابض ہوں گے۔''

''اگر ڈیڈی نے اپنا قانونی حق وصول نہ کرلیا تو لازماً اب وہی دونوں ان کی املاک کے مالک ہوں گے۔''

''لڑکا اُنہی کے ساتھ رہتا تھا۔''

''جی ہاں...... اور ہمیں ملنے والی اطلاعات کے مطابق وبال جان بھی تھا۔''

''وضاحت کیجئے؟''

''اول درجے کا آوارہ اور بدمعاش۔ ایئر فورس میں فلائیٹ لیفٹیننٹ تھا۔ وہاں بھی کچھ حرکت کی۔ نکالا گیا اور سزا بھی ہوئی۔''

''اوہ......!''

''میں نے تو آج تک دیکھا بھی نہیں...... صرف نام سنا ہے۔''

''کیا نام ہے؟''

''نادر شجاع۔ شکوہ آباد کے بدنام افراد میں سے ہے۔ وہاں شیطان کی طرح مشہور ہے۔''

''شادی کب ہوئی تھی شیر افگن صاحب کی۔''

''یہی کوئی دس بارہ سال پہلے کی بات ہے۔''

حمید نے معنی خیز نظروں سے فریدی کی طرف دیکھا۔ اُسے فریدی کی سنائی ہوئی کہانی کا وہ حصہ یاد آ گیا جس میں چودہ سال پہلے کی کسی بیوہ کا ذکر تھا۔

''مس صوفیہ! اپنے ذہن پر زور دے کر اُس حملہ آور کے بارے میں بھی تو کچھ بتائیے۔'' فریدی نے کہا۔

''سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتی ہوں کہ ایک خاصا لمبا تڑنگا آدمی تھا اور ظاہر ہے کہ خاصا طاقتور بھی تھا۔ ورنہ ایک گھونسے میں......!''

وہ جملہ پورا کئے بغیر خاموش ہوگئی۔ پھر یک بیک چونک کر بولی۔ ''نادر ایئر فورس میں تھا۔ پیراشوٹ کے استعمال سے بخوبی واقف ہوگا۔''

فریدی کچھ نہ بولا۔ صوفیہ کے چہرے سے دبا ہوا سا جوش ظاہر ہو رہا تھا جیسے بہت دور کی کوڑی لانے پر اپنی ذہنی صلاحیت کی داد چاہتی ہو۔ لیکن فریدی نے موضوع سے ہٹتے ہوئے سوال کیا۔ ''راشد صاحب پر پہلی بار دل کا دورہ پڑا ہے۔''

''جی نہیں...... وہ مستقل طور پر دل کے مریض ہیں۔''

''اب شیر افگن صاحب کا پتہ بھی لکھوا دیجئے تاکہ اُنکے متعلقین کو اطلاع دی جاسکے۔''

''وہ تو میں لکھوا دوں گی لیکن یہ بتائیے کہ وہ آپ سے کیوں ملنے آئے تھے۔''

''یہی تو نہیں معلوم ہوسکا! پہلی ملاقات سرسری تھی۔ گفت و شنید کی دوسری ملاقات پر ٹھہری تھی۔ لیکن انہیں اس کا موقع نہ مل سکا۔''

صوفیہ نے حمید کو شیر افگن کا پتہ لکھوایا اور فریدی اُٹھتا ہوا بولا۔ ''اب اجازت دیجئے۔ میری طرف سے راشد صاحب کی مزاج پرسی کیجئے گا۔''

"ٹھہریئے! مجھے حملہ آور کے بارے میں کچھ اور بھی یاد آ رہا ہے۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔"

"اُس کے پاس سے کچھ اس قسم کی بو آ رہی تھی جیسی چڑیا گھر میں بھیڑیوں کے کٹہرے کے آس پاس گونجتی رہتی ہے۔"

"اُوہ اچھا...... یہ ایک بہت ہی خاص علامت ہوئی۔ بہت بہت شکریہ۔ مس صوفیہ ذہن پر مزید زور دینے کی کوشش کیجئے گا۔"

"کیپٹن حمید صاحب مجھے بہت دنوں سے جانتے ہیں۔"

"اسی لئے تو آپکی گاڑی دیکھتے ہی پہچان لی تھی۔ ورنہ پتہ نہیں کہاں کہاں سر مارنا پڑتا۔"

"مجھے صرف ڈیڈی کی وجہ سے تشویش ہے۔ اُن کی صحت اس قسم کے ہیجان برداشت کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔ آپ انہیں میری طرف سے اطمینان دلا دیجئے گا۔ ابھی تک تو ایسا ہوا نہیں کہ کوئی ناکردہ گناہ میرے ہاتھوں سزا کو پہنچا ہو۔"

"اب کدھر......!" حمید نے گاڑی میں بیٹھتے وقت پوچھا۔

"اب اُدھر...... جہاں تمہاری مرمت ہوگی۔" فریدی نے کہا اور گاڑی حرکت میں آ گئی۔

"نادر شجاع والی بات قابل غور ہے۔" حمید نے کہا۔

"کس حیثیت سے۔"

"وہ ایئر فورس میں تھا لہٰذا پیراشوٹ......!"

"کافی ثبوت نہیں ہے۔ بہرحال اس پہلو سے بھی غور کیا جاسکتا ہے۔"

"اور پھر وہ بیوہ والی بات۔"

"اس نے تو کہا تھا کہ وہ چودہ سال پہلے کی کسی ایسی بیوہ سے واقف نہیں ہے جس پر شہر میں کوئی ستم ٹوٹا ہو۔"

"اگر یہ نادر شجاع اس کے بتائے ہوئے حلیئے پر پورا اُترا تو۔"

"دیکھا جائے گا۔"

تھوڑی دیر بعد گاڑی ماڈل ٹاؤن کی ایک عمارت کے سامنے روکی تھی۔ حمید جانتا تھا کہ

وہ بھی اُنہی عمارتوں میں سے ہے جہاں فریدی کی ضرورت کا بہتیرا سامان رہتا تھا اور وہ گھر یا دفتر سے رابطہ رکھے بغیر بھی اشد ضروری معاملات وہیں نپٹا دیتا تھا۔

"اب سرحد پار روانگی تک تمہارا قیام یہیں رہے گا۔" فریدی نے عمارت کے اندر پہنچ کر کہا۔ "یہیں میں تمہیں ہپی بناؤں گا۔"

"اتنی جلدی...... گناہ بخشوا لینے کی تو مہلت دی ہوتی۔"

"وقت کم ہے۔ تم قاسم کے پاس ہپی ہی کے میک اپ میں جاؤ۔ یہاں ایک انسٹنٹ کیمرہ بھی موجود ہے اُسے ساتھ لے جانا اور قاسم کی تصویریں اُتار لینا۔ پاسپورٹ اور ویزا کیلئے تمہاری تصویریں میں خود بنالوں گا اور کل صبح تک تمہیں پاسپورٹ اور ویزا مل جائیں گے۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔"

"سرحد پار پہنچ کر جو کچھ کرنا ہوگا اس کے لئے تحریری ہدایات ملیں گی۔"

"او کے باس۔"

قاسم کبھی کبھار بجانے کی کوشش کرتا اور کبھی سر پیٹنے لگتا کہ حمید کے چکر میں پڑ کر یہ کیا کر بیٹھا ہے۔ نہ گھر واپس جاسکتا تھا اور نہ ڈاڑھی صاف کرا سکتا تھا۔ ڈاڑھی اس لئے اب رکھنی ہی تھی کہ بیوی کو جلانے کے کام آئے گی اور گھر اس لئے نہیں جاسکتا تھا کہ ظالم باپ دو چار حجام ساتھ لے کر پہنچ جائے گا۔ اسی طرح بیٹھا جل کڑھ رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔

"قون ہے۔" وہ بھنا کر دہاڑا۔

"روم سروس جناب۔"

"ارے باپ رے۔" کہہ کر قاسم نے دونوں ہاتھوں سے کلیجہ دبا لیا پھر مردہ سی آواز میں بولا۔ "آ جاؤ۔"

دروازہ کھول کر شریف اندر داخل ہوا۔

"لاؤں جناب۔" اُس نے کہا۔

''نن نہیں......ابھی نہیں......میں اپنا چورن کا ڈبہ گھر بھول آیا ہوں۔'' قاسم نے بوکھلا کر کہا۔

''چورن کا ڈبہ۔'' شریف کے لہجے میں حیرت تھی۔

''اے ہاں۔'' قاسم کھسیانے انداز میں بولا۔''قبھی قبھی عورتوں کو دیکھ کر متلی بھی ہونے لگتی ہے اس لئے چورن کا ڈبہ۔''

''متلی......!'' شریف ہنس کر بولا۔''ارے نہیں صاحب۔''

''قیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔'' قاسم آنکھیں نکال کر بولا۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا لیکن آپ جذبات کے ہیجان کو تو متلی نہیں سمجھتے۔''

''اے ہوتا ہوغا کچھ تم سے مطلب......بس کہہ دیا جب چورن کا ڈبہ آجائے غا تب......!''

''خیر......سگریٹ تو نہیں چاہئیں۔''

''لاؤ......دے دو۔'' قاسم جیب سے پرس نکالتا ہوا بولا۔

''اکٹھے دو پیکٹ لے لیجئے۔''

''دس بھی ہوں تو دے دو۔'' قاسم بگڑ کر بولا۔

''نہیں......صرف دو ہی ہیں اس وقت۔''

قاسم نے دس دس کے چار نوٹ اُس کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور اُس نے دو پیکٹ حوالے کرتے ہوئے کہا۔''جب چورن کا ڈبہ آجائے تو مجھے مطلع فرما دیجئے گا۔''

''پھر ما دوں گا......اب جاؤ۔'' قاسم ہاتھ ہلا کر بولا۔

وہ چلا گیا۔لیکن تھوڑی دیر بعد پھر دستک ہوئی۔

''ابے اتنی جلدی قیسے آجائے گا ڈبہ۔'' قاسم جھلا کر دہاڑا۔لیکن دستک پھر ہوئی۔

''ہت تیرے کی۔'' قاسم بھنا کر اُٹھا اور دروازہ کھول کر کھڑا ہوگیا۔لیکن اس بار ایک ہپی دکھائی دیا۔

''مجھے کیپٹن حمید نے بھیجا ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''اچھا......اچھا......آجاؤ۔'' قاسم جلدی سے پیچھے ہٹتا ہوا بولا۔

ہپی اُس کے کہے بغیر سامنے والی کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔''کوئی لونڈیا وونڈیا ساتھ نہیں ہے کیا۔''

''ہو جائے غی......وہ بھی ہو جائے غی۔'' قاسم نے بڑے خلوص سے کہا۔''چرس پیؤ گے۔''

''یہ کیا بدتمیزی ہے۔'' ہپی نے آنکھیں نکالیں۔

''کک......کیسی بدتمیزی۔'' قاسم بوکھلا گیا۔

''اتنی بدتمیزی سے اُن محترمہ کا نام لیتے ہو۔یوں پوچھو نور اُتارو گے حلق سے؟''

''ہی ہی......چلو یہی سہی۔'' کہہ کر قاسم نے تینوں پیکٹ نکالے اور اُس کے سامنے رکھ دیئے۔

ہپی نے اُسے غور سے دیکھا اور پیکٹ سے سگریٹ نکال کر سونگھنے لگا۔پھر آہستہ سے بولا۔''کیپٹن حمید نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تم سچ مچ چرس پینے لگو۔''

''لانت ہے پینے والے پر......وہ سالا روم سروس والا میرے سر تھوپ غیا ہے۔بیس بیس روپے کے پیکٹ۔''

''بس رکھے رہو۔پینا مت ورنہ سر نیچے ہوگا اور ٹانگیں اوپر۔''

''بہت اچھا......لیقن حمید بھائی کہاں ہیں؟''

''وہ وہیں مل جائیں گے جہاں ہم دونوں کو جانا ہے!''

''قہاں جانا ہے۔''

''سرحد کے پار جہاں سے ہپیوں کے قافلے ادھر آتے ہیں۔''

''اچھا اچھا......!''

''میں تمہاری تصویریں کھینچوں گا پاسپورٹ کے لئے۔''

''جرور جرور......تو تم بھی ساتھ چلو گے۔''

''ہاں میں بھی ساتھ چلوں گا۔''

''تم بھی چرس نہیں پیتے۔''

''نہیں......قطعی نہیں۔''

''اچھا اچھا سمجھ غیا......تم بھی لونڈیائی ہپی ہو۔''

''یہ لونڈیائی کیا ہوتا ہے۔''

''صرف لونڈیوں والے ہپی۔ چرس والے نہیں۔''

''بے فائدہ بکواس سے کیا حاصل...... یہ باتیں کہی نہیں جاتیں۔''

''بہت اچھا تم کھینچو تصویر۔ دیکھا جائے گا۔''

''ہپی نے اپنے تھیلے سے انسٹینٹ کیمرہ نکالا اور قاسم پوز دینے کی کوشش میں آزمنہ قدیم کا کوئی آدمی معلوم ہونے لگا۔''

ابھی یہ عمل جاری ہی تھا کہ دروازے پر پھر دستک ہوئی۔

''ابے اب قون ہے۔'' قاسم غرایا۔

''روم سروس جناب۔'' باہر سے آواز آئی۔ قاسم کچھ کہنے ہی والا تھا کہ نووارد ہپی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ پھر اس نے یکدم دروازہ کھولا تھا۔

ویٹر کے پیچھے ایک غیر ملکی ہپی لڑکی کھڑی نظر آئی۔ اُس کے لمبے اور سنہرے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ بڑی آنکھوں اور اُداس، چہرے والی یہ سفید فام لڑکی بڑی دلکش لگ رہی تھی۔

اجنبی ہپی کو سامنے دیکھ کر شریف گڑبڑا گیا۔

''اُن صاحب کی فرمائش پر۔'' اس نے قاسم کی طرف انگلی اُٹھا کر کہا۔

''اندر آجاؤ۔'' ہپی نے کہا۔ قاسم ہونقوں کی طرح منہ کھولے بیٹھا تھا۔

''چورن کے ڈبے کے بغیر بھی کام چلے گا صاحب۔'' شریف نے قاسم سے کہا اور اُس نے صرف منہ بند کرلیا اور ہپی کی طرف دیکھنے لگا۔

''سب ٹھیک ہے۔'' ہپی نے اُسے تشفی دی۔

''یہ بیچاری بالکل مفلس ہوگئی ہے۔'' شریف نے کہا۔ ''چرس اور پیٹ بھر کھانے کے علاوہ اور کچھ نہ چاہئے...... لیکن میرے پانچ سو روپے ہوئے اور ہوٹل کے ڈیڑھ سو۔''

''انجکشن تو نہیں لیتی۔'' ہپی نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا! خود پوچھ لیجئے۔''

ہپی نے انگلش میں لڑکی سے یہی سوال کیا اور اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ لیکن ہاتھ کے اشارے سے سگریٹ طلب کی تھی۔ حمید نے میز پر رکھے ہوئے پیکٹوں میں سے ایک اُٹھا کر اُسے تھما دیا اور اُس کے چہرے کی اُداسی یکلخت کافور ہوگئی۔ بڑے چاؤ سے ایک سگریٹ سلگا کر طویل کش لیا اور سگریٹ کے پیکٹ کو پیار سے دیکھنے لگی۔

''ادائیگی کردو۔'' ہپی نے قاسم سے کہا۔

''ولیقن چورن کا ڈبہ۔''

''لڑکی اپنا تھیلا فرش پر رکھ کر آرام کرسی پر نیم دراز ہوگئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے چرس کے سگریٹ کے علاوہ اُسے اور کسی چیز کی پرواہ نہ ہو۔''

''کیسا چورن کا ڈبہ۔''

''جناب! یہ کہہ رہے تھے کہ عورتوں کو دیکھ کر کبھی کبھی متلی بھی ہونے لگتی ہے۔'' ویٹر نے کہا۔

''اس لئے گھر سے چورن کا ڈبہ منگوائے بغیر معاملے کی بات نہیں کریں گے۔''

ہپی کے ہونٹوں پر ایک بے ساختہ قسم کی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ اُس نے قاسم کا شانہ تھپک کر کہا۔ ''چورن کا ڈبہ بھی آجائے گا۔ تم ادائیگی کردو۔''

قاسم نے ساڑھے چھ سو کے نوٹ نکالے اور ویٹر کو تھما دیئے۔ وہ اُسے فرشی سلام کرتا ہوا رخصت ہوگیا۔

''تم کہاں سے آئی ہو۔'' ہپی نے لڑکی سے سوال کیا۔

''ماں کے پیٹ سے۔'' اُس نے سگریٹ کے مشتعل سرے پر نظر جمائے ہوئے جواب دیا۔

''ہمارے ساتھ رہوگی۔''

''کیا مضائقہ ہے۔''

''ہم کل سرحد پار فلائی کریں گے۔''

''ضرور کرنا۔''

''مطلب ہے تم بھی چلوگی۔''

''کیوں نہ چلوں گی۔''

''تمہارا کوئی ساتھی بھی ہے۔''

''ماں کے پیٹ سے تنہا آئی تھی۔''

''یہ سالا ماں کے پیٹ تھہاں سے نقل آیا ہے۔'' قاسم اردو میں بڑبڑایا۔

''پاسپورٹ ہے۔''

''ہے کیوں نہیں۔''

''نکالو...... ویزا بنواؤں گا۔''

اُس نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر پاسپورٹ نکالا اور ہپی کی طرف بڑھا دیا۔ سگریٹ ختم ہو چکا تھا اس لئے اُس نے اُن دونوں کی طرف بھی توجہ دی اور دونوں کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد بولی۔ ''تم دونوں بہت مالدار معلوم ہوتے ہو۔''

لیکن انہوں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

پھر ہپی اُٹھتا ہوا بولا۔ ''میں شام تک واپس آؤں گا۔''

''اور یہ...... اور یہ۔'' قاسم ہکلا کر بولا۔

''میری واپسی تک یہیں رہے گی۔''

''بچ...... چورن کا ڈبہ۔''

''واپسی میں لیتا آؤں گا۔''

''ارے سنو تو۔'' قاسم بے بسی سے ہاتھ ہلا کر رہ گیا۔ کیونکہ وہ تو باہر نکل گیا تھا۔ آخر اُس نے تھوک نگل کر لڑکی کی طرف دیکھا جو اب تھیلے سے ایک کتاب نکال کر اُس میں محو ہو گئی تھی۔

قاسم نے پہلے تو دانت نکالے پھر سختی سے ہونٹ بھینچ کر بیٹھ گیا۔ لڑکی کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں کسی دوسرے کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہو۔

قاسم اُٹھ کر فون پر روم سروس کو للکارنے لگا۔ ''شریف کو بلاؤ۔''

''جی صاحب! میں ہی بول رہا ہوں۔''

''بس لونڈیا پکڑا کر چلتے بنے...... مجھے بھوخ لگی ہے۔ دو مسلم رانیں ڈبل بکرے والی اور ایک بڑا والا چکن فرائی۔''

''بہت بہتر جناب...... ابھی حاضر کرتا ہوں۔''

قاسم ریسیور رکھ کر مڑا تو لڑکی بولی۔ ''مجھے نروان کی تلاش ہے۔''

''ضرور مل جائے گا۔'' اُس نے کہا۔

قاسم انگریزی روانی سے بول سکتا تھا لیکن اُردو حلق میں پھنسنے لگتی تھی۔ انگریزی کا تلفظ بھی صحیح کرتا تھا اور یہ کوئی انوکھی بات بھی نہیں تھی۔ بہتیرے ایسے ہیں کہ انگریزی میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوتے ہیں لیکن اُردو ان کا بیڑہ غرق کر دیتی ہے۔ بعض اچھے مقرروں میں بھی کئی اردو کے مارے ہوئے نظر آ جائیں گے۔ بیچارے کہنا کچھ چاہتے ہیں لیکن زبان سے کچھ نکلتا ہے اور عوام جو زیادہ تر باتوں کے رسیا ہوتے ہیں کبھی تو محظوظ ہوتے اور کبھی دوڑا لیتے ہیں۔

تو بے چارہ قاسم بھی اس بپتا کا مارا ہوا تھا۔ بچپن ایسے بچوں میں گزرا تھا جو ''پتا چلا'' کو ''معلوم چلا'' بولتے تھے اور گھر پر باوا جان ''تلفظ'' کے معاملے میں ہلاکو خان بن جاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے تو گھر اور باہر کی اردو گڈمڈ ہوئی اور پھر ڈنڈے خان نے تلفظ کی بھی ایسی کی تیسی کر کے رکھ دی۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں ذہنی نشوونما تو ماری ہی جاتی ہے۔

بہرحال یہ تھے قاسم صاحب۔

''تم نروان کے بارے میں کیا جانتے ہو۔'' لڑکی نے پوچھا۔

''اچھا خاصا ہوتا ہے۔''

''تم کچھ بھی نہیں جانتے۔''

قاسم خاموش ہی رہا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی اور تالو خشک ہوا جا رہا تھا۔

لڑکی نے پیکٹ سے دوسرا سگریٹ نکالا اور اُسے سلگانے لگی۔ قاسم گم سم بیٹھا دیکھتا رہا۔ اُسے یہ لڑکی کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ روائتی لونڈیا تو بالکل نہیں معلوم ہوتی تھی۔

''آخر مقصد کیا ہے۔'' اُس نے کش لے کر کہا۔

''کس کا مقصد......!'' قاسم تھوک نگل کر بولا۔

''اسی کا۔'' اُس نے اشارے سے قاسم کا سراپا ناپتے ہوئے کہا۔

قاسم نے سوچا بُرے پھنسے۔ یہ سالا حمید کا بھیجا ہوا ہپی بھی ایک ہی حرامزادہ نکلا۔ اس وبال کو اُس کے سر مار کر خود چلتا بنا۔ سالے نے چورن کے ڈبے والی بھی نہ منی۔ ابے حمید

سالے کمینے۔ خدا تجھے غارت کرے۔ گھر پر بیٹھے بھی جان جلائے جارہا ہے۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" لڑکی پھر بولی۔

"مجھے بھوک لگی ہے۔"

"بھوک تو مجھے بھی لگی ہے۔"

"میں نے تمہارے لئے مرغ مسلم منگوایا ہے۔"

"مرغ ہو یا اُبلے ہوئے آلو ہوں۔ میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پیٹ بھرنے سے مطلب!"

قاسم نے سوچا تب تو سستی پڑی ہے۔ مگر سالی ساٹھ روپے کی چرس اکیلے اکیلے پی جائے گی۔

"اچھا تو تب تک گیٹار ہی سناؤ۔"

"تمہارے پلے نہیں پڑے گی۔ انگلش دھنیں نہیں بجا سکتا۔"

"اپنی ہی سناؤ۔"

قاسم نے بوکھلا کر گیٹار پر ہاتھ مارا۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی اور دونوں اس طرف متوجہ ہوگئے۔ ویٹر نے خود ہی دروازہ کھولا اور کھانے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا۔

دو مسلم رانیں اور ایک مرغ دیکھ کر لڑکی بولی۔ "یہ کتنے افراد کا کھانا ہے۔"

"میرا اور تمہارا۔"

"میرے لئے بس مرغ کی ایک ٹانگ کافی ہوگی اور تم اتنا کھاؤ گے۔"

"ہاں کچھ سہارا ہو جائے گا۔ ابھی لنچ کا وقت ہی کہاں ہوا ہے۔" قاسم نے کہا اور پھر ویٹر پر غرایا۔ "تم کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو دھپا ہو جاؤ۔"

وہ چلا گیا۔ قاسم نے ایک ران اُٹھائی اور ادھیڑنے لگا۔

"تم میری سمجھ میں نہیں آئے۔" لڑکی نے حیرت سے کہا۔

"کھاؤ...... کھاؤ...... مجھے سمجھ کر کیا کرو گی۔"

"ہاں اور کیا...... بقیہ دنیا کب سمجھ میں آئی ہے۔" لڑکی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ اور چھری سے مرغ کی ٹانگ کاٹنے لگی۔

"تمہارا نام کیا ہے۔" قاسم نے ڈرتے ڈرتے پہلا سوال کیا۔

"کارسیکا...... تم سکی کہہ سکتے ہو اور تمہارا نام۔"

"قاسم......!"

"اچھا نام ہے۔ ویسے تم صرف دیکھنے ہی میں دیو نہیں ہو، دیوؤں کی طرح کھاتے بھی ہو۔"

"اتنے میں پیٹ نہیں بھرے گا...... دوسروں کے سامنے کھاتے ہوئے شرماتا ہوں۔ اس لئے تھوڑا سا منگوایا ہے۔"

"یہ تھوڑا سا ہے۔" وہ مرغ کی ٹانگ پلیٹ میں رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھو...... بیٹھو...... کیوں پریشان ہو رہی ہو۔"

"پریشان ہو رہی ہوں۔ ارے میں پاگل ہو جاؤں گی۔"

"نہیں ہو گی۔ بیٹھ جاؤ...... میرے پاس بہت رقم ہے۔ تمہارا بھی کام چلے گا اور میرا بھی۔"

وہ بیٹھ گئی لیکن حیرت سے قاسم کو دیکھتی رہی۔ مرغ کی ٹانگ بھی نہیں اٹھائی تھی۔

شکوہ آباد کے ایس پی کا دفتر کیا تھا اچھا خاصا نگار خانہ تھا۔ دیواروں پر نادر قسم کی پینٹنگز آویزاں تھیں اور جگہ جگہ نوادرات رکھے ہوئے تھے۔ لیکن خود ایس پی شہباز آرٹسٹ کی بجائے پہلوان لگتا تھا۔

چڑھی ہوئی گھنی مونچھیں، سرخ سرخ آنکھیں۔ پیشانی کی سلوٹیں کسی وقت بھی معدوم نہ ہوتیں۔ اچھے اچھے مقرر بھی اُس کی شکل دیکھتے ہی ہکلانے لگتے تھے۔

اس وقت شکوہ آباد کا ایک معزز آدمی اس کے سامنے دم بخود بیٹھا تھا اور شہباز اُسے اس طرح گھور رہا تھا جیسے کچا چبا جائے گا۔

دفعتاً اس نے کہا۔ "مجھے ابھی تک اپنی بات کا جواب نہیں ملا ناصر خان۔"

"میں کیا کہوں۔ علاوہ اس کے کہ میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔"

"میرے پاس اس کا واضح ثبوت موجود ہے کہ تم نے ایک ہفتہ پہلے شیر افگن کو دھمکیاں

دی تھیں۔"

"مجھے اس سے کب انکار ہے۔ لیکن اُس کے قتل میں میرا ہاتھ ہرگز نہیں ہے۔"

"کس بات پر جھگڑا ہوا تھا۔"

"اُس کے فارم کے تین مویشی غائب ہو گئے تھے اور وہ چوری کا الزام میرے ملازموں پر رکھ رہا تھا۔"

"اور تم آپے سے باہر ہو گئے۔"

"کیا میں اتنا کم حیثیت ہوں کہ مویشی چوری کراؤں گا۔"

"تمہارا بڑا بیٹا ایئر فورس میں ہے نا۔"

"جی ہاں۔"

"یعنی پیراشوٹ کے استعمال سے کماحقہ واقف ہے۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔"

"وہی جو تم سمجھ رہے ہو۔"

"میں کچھ بھی نہیں سمجھ رہا۔"

"خیر...... تمہارا بیٹا آج کل چھٹی پر آیا ہوا ہے۔"

"آیا تھا...... اپنی ننہال گیا ہوا ہے۔"

"یعنی یہاں موجود نہیں ہے۔ خیر...... مجھ سے یہ بات چھپی نہ رہ سکے گی کہ وہ شیر افگن کے قتل والے دن بھی ننہال میں تھا یا کہیں اور۔"

"آپ ضرور معلوم کیجئے۔"

"معلوم کر چکا ہوں ناصر خان۔" شہباز نے طنزیہ لہجے میں کہا اور میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ اردلی دفتر میں داخل ہوا۔

"انسپکٹر نعیم کو بھیج دو۔" شہباز نے اُس کی طرف دیکھے بغیر کہا اور وہ چلا گیا۔

"کیا وہ وہاں موجود نہیں ہے۔" ناصر خان نے مردہ سی آواز میں پوچھا۔

"ابھی معلوم ہو جائے گا۔" شہباز نے کہا اور بُرا سا منہ بنائے ہوئے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

اتنے میں ایک سب انسپکٹر نے دفتر میں داخل ہو کر سیلوٹ کیا۔

"انسپکٹر...... تم علی آباد گئے تھے۔ کیا معلوم کیا......؟"

"لیفٹیننٹ داور نے وہاں صرف ایک دن قیام کیا تھا۔"

"اس کے بعد کہاں گیا۔"

"اُن کے نانا نے اُس سے لاعلمی ظاہر کی تھی۔"

"بس جاؤ۔"

سب انسپکٹر چلا گیا اور شہباز سفاک سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "اب کیا کہتے ہو۔"

"آپ اگر اس طرح الجھانا چاہتے ہیں تو یونہی سہی۔"

"بہر حال تم انکار ہی کرتے رہو گے۔"

"آپ مجھ سے کسی ایسی بات کا اعتراف نہیں کرا سکتے جس کا تعلق مجھ سے نہ ہو۔"

"میں نے کہا تھا بتاؤ داور کہاں ہے۔"

"میں نہیں جانتا، اگر وہ علی آباد میں نہیں ہے۔"

"مجھے تم سے کوئی اعتراف نہیں کرانا۔ اعتراف تو داور کرے گا۔ مجھے اُس کا پتا بتاؤ۔"

"میں نے کہہ دیا کہ میں نہیں جانتا۔ سیلانی طبیعت کا مالک ہے۔ چھٹیوں میں کہیں ٹک کر نہیں بیٹھتا۔"

"مجھے تشدد پر مجبور نہ کرو ناصر خان۔"

"میں بھی پٹھان ہوں شہباز خان۔ مجھے دھمکی نہ دو۔"

"یہ بات ہے۔" شہباز میز پر جھک کر اُس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ "ایک مفرور قاتل کی پردہ پوشی بھی کرو گے اور آنکھیں بھی دکھاؤ گے۔"

ناصر خان نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے۔ شاید اس لئے کہ کہیں کچھ اور بھی زبان سے نہ نکل جائے۔

شہباز خان نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی اور اردلی پھر اندر داخل ہوا۔

"فلائنگ اسکواڈ کے جوانوں کو بھیج دو۔" ایس پی نے اُس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

اردلی چلا گیا اور شہباز ناصر خان کی طرف سے منہ پھیرے بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد دو

قوی ہیکل جوانوں نے اندر داخل ہو کر اُسے سلیوٹ کیا۔

''خان ناصر خان کو تفریح کراؤ اور پھر گھر چھوڑ آؤ۔'' شہباز نے ان سے کہا۔

''تت تفریح کا کیا مطلب......!'' ناصر خان آہستہ سے بولا۔

''تفریح کا مطلب تفریح ہے خان۔ مجھے تم نے بہت دیر سے بتایا کہ تم بھی پٹھان ہو۔ لہٰذا اب تمہارے شایانِ شان برتاؤ کیا جائے گا۔''

''خدا شاہد ہے میں نہیں جانتا کہ داور کہاں ہے۔''

''تمہیں اس سے اس کے بیٹے داور کا پتا معلوم کرنا ہے۔'' شہباز نے دونوں جوانوں سے سرد لہجے میں کہا۔

دونوں آگے بڑھے اور ناصر خان کو کھینچ کر کرسی سے اُٹھا دیا۔

''یہ ظلم ہے۔'' ناصر بے بسی سے چیخا۔ معمر آدمی تھا۔ اُن نوجوانوں سے طاقت آزمائی کی تاب نہیں رکھتا تھا۔

دونوں اُسے گھسیٹتے ہوئے باہر لائے اور ایک جیپ پر بٹھا دیا اور خود بھی اُچھل اُچھل کر اُس کے دونوں اطراف میں بیٹھ گئے۔ تیسرا جوان اسٹیئرنگ پر تھا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور جیپ حرکت میں آ گئی۔

''تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔'' ناصر نے اُس سے سوال کیا۔

''چپکے بیٹھے رہو۔'' ایک جوان اُس کے پہلو میں کہنی مار کر بولا۔

جیپ ایک ویران سڑک پر آ نکلی تھی اور اُس کا رخ ویرانے ہی کی طرف تھا۔

ناصر خان سختی سے ہونٹ بھینچے بیٹھا رہا۔ اُس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا اور آنکھوں سے ذہنی انتشار کی سی کیفیت ظاہر ہو رہی تھی۔

کئی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جیپ نے پختہ سڑک چھوڑ دی اور بائیں جانب کچے میں اُتر گئی۔ یہ ایک چھوٹا سا میدان تھا جس پر چھوٹے چھوٹے نکیلے پتھر بچھے ہوئے تھے۔

جیپ رک گئی اور ناصر خان سے اُترنے کو کہا گیا۔

''یہ تم لوگ مجھے کہاں لائے ہو۔'' ناصر خان نے گھٹی گھٹی سی آواز میں پوچھا۔

''تفریح کے لئے خان۔'' ایک جوان ہنس کر بولا۔

''ہاں یہ بہت بڑا خان ہے۔ اسلئے تفریح بھی بہت بڑی ہونی چاہئے۔'' دوسرا بولا۔

ڈرائیور نے اپنے پیروں کے قریب پڑا ہوا رسی کا لچھا اُٹھایا اور زمین پر ڈال دیا۔

''یہ...... یہ کیا ہے۔'' ناصر خان بدقت بولا۔

''ابھی دیکھ ہی لو گے خان۔ ورنہ بہتر یہی ہو گا کہ اپنے بیٹے کا پتہ بتا دو۔''

''تم لوگ تو میری بات کا یقین کرو۔ میں نہیں جانتا۔''

''فکر نہ کرو۔ ہمیں روزانہ ایسے لوگوں سے نپٹنا پڑتا ہے جو کچھ نہیں جانتے لیکن پھر انہیں سب کچھ یاد آ جاتا ہے۔''

''اللہ دیکھنے والا اور سننے والا ہے۔'' ناصر خان کراہا۔ اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور آنکھیں دھندلی پڑ گئی تھیں۔

ایک جوان رسی کا لچھا کھولنے لگا اور دوسرے نے ناصر خان سے کہا۔ ''اب بھی بہتر ہے بتا دو۔ ورنہ تمہاری چیخیں اس ویرانے میں گونجتی رہیں گی۔''

''اگر جانتا ہوتا تو ضرور بتا دیتا۔ یقین کرو۔ اگر اُس نے قتل کیا ہے تو میں اُسے تلاش کر کے قانون کے حوالے کر دوں گا۔''

''تم کہاں تکلیف کرو گے۔ بس ہمیں بتا دو۔ اتنا ہی کافی ہے۔''

''میں کس طرح تمہیں اپنی لاعلمی کا یقین دلاؤں۔''

''کوشش کرو۔''

''وقت نہ برباد کرو یارو تفریح شروع کر دو۔'' ڈرائیور نے کہا۔ وہ سیٹ سے نہیں اُترا تھا۔

دفعتاً ایک نے ناصر خان کو زمین پر پچھاڑ دیا اور دوسرا رسی سے اُس کے دونوں ہاتھ باندھنے لگا۔

''یہ کیا کر رہے ہو۔'' ناصر خان حلق کے بل چیخا۔

''ابھی معلوم ہو جائے گا۔''

اُس کے دونوں ہاتھ باندھ دیئے گئے اور رسی کا دوسرا سرا جیپ کے پچھلے حصے سے باندھتے ہوئے اُس جوان نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے خان کہ تمہارا باپ بڑا جابر آدمی تھا۔''

''میرا باپ جابر تھا۔ میرا بیٹا قاتل ہے۔ لیکن میں نے کیا کیا ہے۔''

"یہ ایس پی صاحب جانیں۔ ہم تو حکم کے بندے ہیں۔"

دفعتاً جیپ اسٹارٹ ہوئی اور آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ ناصر خان نکیلے پتھروں پر اوندھا پڑا ہوا اُس کے ساتھ خاموشی سے گھسٹ رہا تھا۔ دونوں جوان قہقہے لگا رہے تھے۔

"یہ ظلم ہے۔" ناصر خان چیخا اور ان کے قہقہے پہلے سے زیادہ بلند آہنگ ہو گئے۔

ٹھیک اسی وقت ایک لینڈ روور سڑک پر رکی اور اُس پر سے تین آدمی اُتر کر میدان کی طرف بڑھنے لگے۔ جیپ میدان میں چکر لگا رہی تھی۔

دونوں جوان نو واردوں کی طرف متوجہ ہو گئے اور ایک نے کڑک کر کہا۔

"ادھر آنے کی اجازت نہیں ہے۔"

لیکن وہ بڑھتے ہی چلے آئے۔ ان میں سے ایک بہت وجیہہ تھا اور انتہائی توانا معلوم ہوتا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔" اُس نے اُن کے قریب پہنچ کر پوچھا۔

"تم سے مطلب...... اپنا راستہ لو۔ شاید ادھر کے نہیں معلوم ہوتے۔"

"ہم سیاح ہیں...... لیکن...... یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس سے کہو کہ گاڑی روک دے۔"

"تم لاٹ گورنر ہو۔ چلو یہاں سے ورنہ بٹ رسید کروں گا۔" وہ رائفل کندہ اُٹھا کر بولا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے میں اجنبی کے دونوں ساتھیوں نے ریوالور نکال لئے۔

"تم دونوں اپنی رائفلیں زمین پر ڈال دو ورنہ ختم کر دیئے جاؤ گے۔" اجنبی نے بڑی نرمی سے کہا۔

اُن دونوں نے بوکھلا کر رائفلیں زمین پر ڈال دیں۔ شاید اس کے لئے تیار نہیں تھے۔ اضطراری طور پر رائفلیں ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی تھیں۔

اجنبی آہستہ آہستہ چلنے والی جیپ کی طرف بڑھا۔ ڈرائیور نے شاید اس نئے وقوعے کو دیکھ لیا تھا، اُس نے جیپ روک دی اور نیچے اُتر آیا۔ یہ بھی باوردی تھا۔

"اسے کھولو۔" اجنبی نے ناصر خان کی طرف اشارہ کیا جس کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا اور وہ سر اُٹھائے انہیں اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے صرف دیکھ ہی رہا ہو۔ کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت باقی نہ رہی ہو۔

"کون ہو تم حکم دینے والے۔" ڈرائیور غرایا۔

"میں کوئی بھی ہوں۔ لیکن وہی کرو جو کہہ رہا ہوں۔"

"جانتے ہو کس کے حکم سے ہو رہا ہے۔"

"میں نہیں جاننا چاہتا۔ ویسے تمہاری وردیاں دیکھ رہا ہوں۔"

"تو پھر......؟"

"اسے فوراً کھول دو۔ ورنہ یہی حشر تمہارا کروں گا۔"

"اخاہ......!" کہہ کر وہ اجنبی پر جھپٹ پڑا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں اس کا بایاں جبڑا ہل کر رہ گیا۔ ایسا ہی زوردار ہاتھ پڑا تھا۔

اُدھر اُن دونوں نے چیخنا شروع کر دیا۔ ایک کہہ رہا تھا۔ "تم لوگ زندہ نہیں بچو گے۔ ایس پی صاحب تمہیں کتوں سے نچوا ڈالیں گے۔"

اجنبی کا مقابل پھر اُٹھا اور حملہ کرنے کی کوشش کی۔ اس بار اُس کی داہنی پنڈلی پر ٹھوکر پڑی تھی اور وہ منہ کے بل نیچے چلا آیا تھا۔ اجنبی کے دونوں ساتھیوں میں سے ایک انہیں کور کئے کھڑا رہا اور دوسرا جیپ کی طرف بڑھ آیا۔

"اسے کھولو۔" اجنبی نے اپنے ساتھی سے کہا۔

ڈرائیور دونوں ہاتھوں سے پنڈلی دبائے بیٹھا مغلظات اُگل رہا تھا۔ ایس پی کا نام لے رہا تھا۔

اجنبی کے ساتھی نے ناصر خان کے ہاتھ کھولے اور اُسے زمین سے اُٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ ناصر خان بظاہر ہوش میں تھا لیکن اس کی آنکھیں عجیب سی لگ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ہر قسم کے احساس سے عاری ہو۔

"گاڑی میں لے جاؤ...... اور اس سے کہو کہ ان دونوں کو ادھر لائے۔ رائفلوں پر قبضہ کرلو۔" اجنبی نے اپنے ساتھی سے کہا۔

وہ ناصر خان کو سہارا دیئے ہوئے سڑک کی جانب چل پڑا۔

"تم زندہ نہیں رہو گے...... رات نہیں گزار سکتے۔" ڈرائیور اجنبی سے کہہ رہا تھا۔

وہ کچھ نہ بولا۔ اُس کا دوسرا ساتھی اُن دونوں کو بھی وہیں لے آیا اور ان میں سے ایک

بولا۔ ’’تم سرکاری معاملات میں مداخلت کر رہے ہو بھگتو گے۔‘‘

’’اب آپ تینوں اپنی پیٹیاں بھی کھول کر ہمارے حوالے کر دو۔‘‘

’’تم آخر ہو کون۔‘‘

’’سرکاری معاملات تم سے زیادہ سمجھنے والا۔‘‘

’’کیا تم نے ایس پی شہباز کا نام نہیں سنا۔‘‘

’’اُس کی سات پشتوں سے واقف ہوں۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ پیٹیاں کھول دو ورنہ تمہیں تشدد کی ایک نئی قسم سے دوچار ہونا پڑے گا۔ تین گولیاں تمہاری رانوں میں پیوست ہو جائیں گی اور تم پیدل بھی شہباز تک نہیں پہنچ سکو گے۔‘‘

انہیں کمر سے پیٹیاں کھولنی پڑی تھیں۔ اجنبی نے اپنے ساتھی کے ہاتھ سے ریوالور لے کر کہا۔ ’’اب تم جیپ کے چاروں پہیوں کی ہوا نکال دو۔‘‘

وہ تینوں بڑی بڑی قسمیں کھاتے رہے تھے۔ دھمکیاں دیتے رہے تھے لیکن انہیں اس انداز میں بے بس کر دیا گیا تھا کہ وہ تعاقب کرنے کے قابل نہ رہ جائیں۔

ناصر خان لینڈ روور کی سیٹ پر پڑا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اجنبی نے اُسے آوازیں دیں اور وہ آنکھیں کھول کر آہستہ سے بولا۔ ’’آپ نے بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے جناب۔‘‘

’’آپ کون ہیں...... اور یہ سب کیا ہو رہا تھا۔‘‘ اجنبی نے پوچھا۔

لیکن وہ اُس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے بولا۔ ’’جب اُسے یہ معلوم ہوگا تو میرے متعلقین کی شامت آجائے گی۔‘‘

’’آپ کے متعلقین کہاں ہیں۔‘‘

’’یہیں شکوہ آباد میں۔ میرا نام ناصر خان ہے اور یہاں گم نام نہیں ہوں...... شمشاد محل میں رہائش ہے۔‘‘

’’اوہ...... شمشاد محل والے ناصر خان...... خان محی الدین کے بیٹے۔‘‘

’’جی ہاں۔‘‘

’’تو شہباز اس حد تک بڑھ چکا ہے۔‘‘

’’کسی کی بھی پگڑی سلامت نہیں ہے۔‘‘

’’لیکن بات کیا تھی۔‘‘ اجنبی نے پوچھا۔

’’وہ دارالحکومت میں ہونے والے ایک قتل کو میرے بیٹے کے سر منڈھنا چاہتا ہے۔ محض اس لئے کہ ایک ہفتہ قبل مقتول سے میری کسی قدر تلخ کلامی ہو گئی تھی...... وہ اپنے مویشیوں کی چوری کا الزام میرے ملازموں پر رکھ رہا تھا۔‘‘

’’آپ کے بیٹے پر شبہے کی وجہ بھی بتائی ہوگی۔‘‘

’’شاید آپ نے بھی اخبارات میں پڑھا ہو دارالحکومت کے اُس قتل کے بارے میں۔ قاتل نے فرار کے لئے پیراشوٹ استعمال کیا تھا۔‘‘

’’جی ہاں...... مجھے یاد ہے۔‘‘

’’میرا بیٹا ایئر فورس سے تعلق رکھتا ہے۔ فلائٹ لیفٹیننٹ ہے۔ ان دنوں چھٹیوں پر آیا ہوا تھا۔ اپنے ننھیال چلا گیا تھا۔ علی آباد۔ وہاں سے کہیں اور چلا گیا...... سیلانی طبیعت کا مالک ہے۔ کبھی کبھی کسی کو اطلاع دیئے بغیر جدھر منہ اُٹھتا ہے چل دیتا ہے۔ بہرحال شہباز کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق وہ علی آباد میں صرف ایک دن ٹھہرا۔ پھر کہیں اور چلا گیا۔ شہباز مجھ سے اُس کا پتا پوچھ رہا تھا۔ اس کے لئے اُس نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا۔‘‘

’’میں آپ کو شمشاد محل لئے چل رہا ہوں۔ بے فکر رہئے۔ وہ آپ کے متعلقین کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ حیرت ہے کہ اُس نے مقتول کی بیوی کے بیٹے پر شبہ کیوں نہیں کیا۔ وہ بھی تو ایئر فورس کا نکالا ہوا ہے۔‘‘

ناصر خان اُٹھ بیٹھا اور اجنبی کو غور سے دیکھتا ہوا بولا۔ ’’آپ کون ہیں جناب۔‘‘

’’آپ آرام سے لیٹے رہئے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے زخموں کیلئے فی الحال کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ گھر ہی پہنچ کر بات بنے گی۔‘‘

ناصر خان لیٹ گیا۔ لیکن اُس کی نظر اجنبی کے چہرے ہی پر جمی ہوئی تھی۔ آخر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ’’مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پہلے بھی کہیں آپ کو دیکھا ہو۔‘‘

’’مجھے بھی شرمندگی ہے کہ میں پہلی ہی نظر میں آپ کو نہ پہچان سکا۔‘‘

’’آپ کون ہیں۔‘‘

’’میرا نام احمد کمال فریدی ہے...... اٹھارہ سال کی عمر تھی میری جب شمشاد محل میں کچھ

دنوں کے لئے میرا قیام ہوا تھا۔ خان محی الدین اور میرے باپ اچھے دوست تھے۔"

"میرے خدا۔" ناصر خان پھر اُٹھ بیٹھا اور کانپتے ہوئے ہاتھ سے فریدی کا بازو پکڑ کر بولا۔ "آپ کرنل فریدی تو نہیں ہیں...... نواب عزیز الدین خان کے بیٹے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ ایسے حالات میں ملاقات ہوئی۔"

"میں اللہ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اس طرح ذلیل کر رہا ہے وہ شریفوں کو۔"

"بے فکر رہئے۔ فرعونیت کی عمر تھوڑی ہوتی ہے۔"

"وہ یہاں کا شہنشاہ ہے۔ اس کے خلاف کچھ بھی کہئے اوپر والوں کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔"

"بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔ لیکن آدمی آدمی ہی رہے گا خدا نہیں بن سکتا۔"

"کرنل صاحب! اس وقت میں سب کچھ بھول گیا ہوں۔ یقین کیجئے اب زخموں کی تکلیف بھی نہیں محسوس ہو رہی۔"

"شیر افگن کا قتل دارالحکومت میں ہوا تھا۔ اُس کی تفتیش میں کر رہا ہوں۔ اب شہباز مداخلت نہیں کر سکے گا۔"

"جلدی کیجئے کہیں اُس کے شکاری کتے ہم سے پہلے نہ پہنچ جائیں۔"

"فکر نہ کیجئے! اُن تینوں کو پیدل جانا پڑے گا اگر کسی سے لفٹ نہ مل گئی۔ میں نے جیپ کے وائرلیس کو بھی ناکارہ کر دیا تھا۔"

وہ سرحد پار بھی پہنچ گئے۔ لیکن حمید نے خود کو قاسم پر ظاہر نہیں کیا۔ بدستور اُس کے لئے اجنبی بنا رہا۔ ہپی لڑکی کارسیکا ان کے ساتھ تھی۔ خاصی ذہین اور پڑھی لکھی ثابت ہوئی تھی۔ روانگی سے قبل اس نے جس قسم کی کتابیں خریدی تھیں اس سے حمید نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ سچ مچ نروان ہی کی تلاش میں ہے۔ بہت کم گفتگو کرتی تھی زیادہ تر پڑھتی رہتی تھی یا چرس کے

سگریٹ پیتی تھی۔

حمید بھی دھواں اڑاتا رہتا۔ سگریٹ خود رول کر کے پیتا تھا۔ اس کی ضرورت یوں پیش آئی تھی کہ تمباکو فریدی نے فراہم کیا تھا جس کے دھوئیں سے چرس کی بو آتی تھی۔ لیکن وہ چرس کے اثرات نہیں رکھتا تھا۔

انہوں نے تیسرے درجے کے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ کیونکہ وہاں کچھ ہپی بھی مقیم تھے۔

"حمید بھائی کب آئیں گے۔" قاسم نے حمید ہی سے پوچھا۔

"آئیں یا جہنم میں جائیں۔ مجھے پرواہ نہیں۔" جواب ملا۔

"قیا مطلب......؟" قاسم نے آنکھیں نکالیں اور پھر یک بیک چونک کر بولا۔

"ہاں یہ تم نے پاسپورٹ پر میرا نام قو خان کیوں لکھوایا ہے۔"

"اور پھر کیا لکھواتا۔"

"کیا میں تمہیں قو لگتا ہوں۔"

"تم تو قو کے بھی قو قو لگتے ہو۔"

"اے تم خود قو قو بلکہ قی قی۔"

"میری فکر نہ کرو۔"

"تم آخر ہو قون......؟"

"قراقا خان......!"

"سب سالے قاف ہی سے ہیں۔ تو پھر لونڈیا کا نام قلفی قیوں نہیں رکھ دیا تھا۔"

"قلفی سے بھی زیادہ ٹھنڈی معلوم ہوتی ہے۔" حمید سرد آہ بھر کر بولا۔

"سب تمہاری بیوقوفی سے ہوا ہے...... سالی یا تو پڑھتی رہتی ہے یا اُوٹ پٹانگ باتیں قرتی ہے۔ ہونہہ نروان...... مگر یار یہ نروان ہوتا قیا ہے۔"

"ہندی کا لفظ ہے...... بمعنی نجات......!"

"کس سے نجات۔"

"ہوگی کسی سے۔ میں نہیں جانتا۔ لیکن جسے تم مل جاؤ اس کی ہوگئی نجات۔"

"قیا مطلب......؟"

''حمید صاحب کہہ رہے تھے کہ تمہاری بیوی کی بھی نجات ہوگئی ہے۔''

''خبردار جو میری بیوی کا نام لیا۔ گدی سے زبان کھینچ لوں گا اور حمید کی تو۔''

اتنی خوفناک گالی تھی کہ حمید کو پسینہ آ گیا۔ لیکن کیا کرتا۔ سنی ہی پڑی کیونکہ قرا قا خان تھا۔ پھر بھی دبی زبان سے بولا۔

''اتنے اچھے دوست کو اس طرح ذلیل نہ کرو۔''

''اور وہ سالا میری بیوی کو نجات کراتا پھرے۔'' قاسم آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔

''تم لوگ اتنا شور کیوں مچاتے ہو۔'' سکی نے کہا جو سامنے ہی اسٹول پر بیٹھی ہوئی کتاب دیکھ رہی تھی۔

''بتا دوں کہ قوخان کی بیوی کا قصہ ہے۔'' حمید نے آہستہ سے قاسم سے پوچھا اور قاسم بوکھلا کر بولا۔ ''نہیں اس کی کیا جرورت ہے۔ ہرگز نہیں...... بیوی کا نام بھی لیا تو اُٹھا کر پٹخ دوں گا۔''

''شور اس لئے مچاتے ہیں کہ نروان کے علاوہ ہم بھی ہیں اس دنیا میں۔'' حمید نے سکی سے کہا۔

''اچھا تو پھر......!''

''نروان کتابوں کے ذریعے نہیں ملتا۔ آخر تم کس سے نجات چاہتی ہو۔''

''دکھوں سے۔''

''لیکن کتابیں تو اور زیادہ دکھی کر دیتی ہیں۔''

''سب کتابیں نہیں۔ ذرا اسے تو پڑھ کر دیکھو۔''

''کیا ہے اس میں؟''

''کیا نہیں ہے؟''

''صرف الفاظ ہیں۔ ناقابل عمل باتیں۔ جنہیں پڑھ کر ذہن تو جھوم اُٹھتا ہے لیکن پیر نہیں ہلتے۔ ایک کتاب پڑھ کر دوسری پڑھنی پڑتی ہے اور نروان کا معاملہ کھٹائی میں پڑا رہتا ہے۔''

''میں نہیں سمجھی تم کیا کہنا چاہتے ہو۔''

''کتنے دنوں سے اس چکر میں پڑی ہو۔''

''پانچ سال سے۔''

''پانچ سال سے تم کتابوں میں دفن ہو اور تمہیں پتا نہیں کہ اس دوران میں کتنی بہاریں آئیں کتنے پھول کھلے کتنی بارشیں ہوئیں۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''پانچ سال تم نے اندھوں کی طرح گزارے ہیں۔ میری تو روح لرز رہی ہے اس کا تصور کر کے۔''

''پھر تم کیا کرتے پھر رہے ہو۔''

''ہپی ازم پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔''

''اور یہ......!'' اُس نے قاسم کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اس کی نہ پوچھو...... یہ تو خود ہی نروان ہے۔ اگر تم کسی طرح اس کو حاصل کرلو تو سارے دکھوں سے نجات پا جاؤ گی۔''

''میں نہیں سمجھی۔''

''یہ ایک کروڑ پتی کا اکلوتا بیٹا ہے۔''

''اوہ......اچھا......!'' وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

''لیکن اتنا معصوم ہے کہ اتنا بڑا معصوم پہلے کبھی تمہاری نظر سے نہ گزرا ہوگا۔''

''ابے میں اس کا مطلب نہیں سمجھا۔'' قاسم نے اردو میں کہا۔ بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔

''خاموش بیٹھے رہو...... تمہارا معاملہ پکا کر رہا ہوں۔'' حمید نے بھی اردو ہی میں کہا اور سکی انہیں پر اشتباہ نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ ''کیا بات ہے؟''

''کہہ رہا تھا کہ مجھے شرمندہ نہ کرو...... ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اُسترے کی دھار پر نہ چلو۔ کرنسی نوٹوں پر چہل قدمی کرو۔ اسی طرح تمہارا نروان ہو سکتا ہے۔''

''میں ان آلائشوں سے پاک ہونا چاہتی ہوں۔''

''یعنی کرنسی نوٹوں کو آلائش کہہ رہی ہو۔''

''بالکل......!''

"اور چرس کے لئے جسم فروشی کرتی ہو۔"

"کبھی کبھی یہ بھی سوچتی ہوں کہ یہ غلط ہے۔"

"مستقل طور پر سوچنا شروع کردو کہ یہ غلط ہے۔"

"لیکن تم لوگوں نے مجھ سے معاوضہ طلب نہیں کیا۔"

"ہمارا نروان ہو چکا ہے۔"

"آخر مجھے کیوں ساتھ لائے ہو۔"

"تمہیں اور تمہارے توسط سے دوسرے ہپیوں کو اسٹڈی کرنے کے لئے میں کتاب لکھ رہا ہوں نا۔"

"تم اس کی بات کر رہے تھے۔ یہ کیا چیز ہے۔" سکی نے قاسم کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اسے ہپی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں اس لئے بن گیا ہے ہپی۔ ورنہ اسے کسی قسم کی بھی محرومی کا سامنا نہیں۔"

"لیکن اس نے ابھی تک مجھ سے کچھ نہیں کہا۔"

"اسی لئے تو میں اس کو نروان کہتا ہوں۔"

"تو پھر میں کیا کروں۔"

"اس سے قریب ہونے کی کوشش کرو۔ جیسا چاہو گی بن جائے گا۔"

"اے نہیں الاقسم۔" قاسم گڑبڑا کر اردو میں بولا۔ "حمید بھائی کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔"

"کیا کہہ رہا ہے۔" سکی نے پوچھا۔

"کہہ رہا ہے خواہ مخواہ کنونسنگ مت کرو۔ میں زبردستی کا سودا نہیں چاہتا۔ اگر مجھ میں کوئی خوبی ہوگی تو خود ہی اُسے میری طرف متوجہ کردے گی۔"

"تم واقعی حیرت انگیز ہو۔" سکی نے قاسم سے کہا۔

"لہٰذا اب تم دونوں خود ہی طے کرلو۔" حمید اُٹھتا ہوا بولا۔ "میں تمہارے لئے چرس کی تلاش میں جارہا ہوں۔"

"اے نہیں الاقسم...... یہ نہیں چلے گی۔ مجھے اکیلے نہ چھوڑو۔" قاسم بھی گڑبڑا کر اُٹھ گیا۔

"کیوں بے وقوفی کی باتیں کرتے ہو۔ میں حمید کی تلاش میں جارہا ہوں۔ جلدی واپسی

ہوگی۔"

"اکیلے میں مجھے اس سے شرم آتی ہے۔" قاسم شرما کر بولا۔ "یہ بیچاری اتنی نیک اور شریف ہے۔ بالکل مونگ کی دال معلوم ہوتی ہے۔"

"پھر کیا جھک مارنے کے لئے ہپی بنے تھے۔"

"اگر ہپی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں تو مجھ پر ہزار بار لانت۔"

"اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ بیٹھو چین سے۔" حمید نے کہا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔

قاسم غوں غوں ہی کرتا رہ گیا تھا۔

فریدی کی ہدایت کے مطابق حمید کو یہاں پہنچ کر اُس آدمی سے رابطہ قائم کرنا تھا جو اُس کام کے سلسلے میں اس کی رہنمائی کرنے والا تھا۔ حمید یہاں پہلے بھی آچکا تھا اور ہر گلی سے آگاہ تھا۔ دلشاد نامی اسنیک بار کے سامنے رک گیا۔ اندر زیادہ تر میزیں آباد تھیں۔ وہ اندر داخل ہوکر سیدھا کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔

"مجھے آغا طاہر سے ملنا ہے۔" اُس نے بارمین سے کہا اور وہ اُسے اس طرح گھورنے لگا جیسے کوئی نامناسب بات اُس کی زبان سے نکل گئی ہو۔

"تم نے نہیں سنا۔ میں نے کیا کہا ہے۔" حمید نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔

"تم ہو کیا چیز! کہاں سے آئے ہو۔"

"کیا یہ سوال تمہارے فرائض میں داخل ہے۔"

"یہ بھی ایک ہی رہی۔" وہ طنزیہ سی ہنسی کیساتھ بولا۔ "مجھ سے میرا ہی پتا پوچھ رہے ہو۔"

"اوہ اچھا۔" حمید بھی اُس کی ہنسی میں شریک ہوگیا۔

لیکن وہ جواب طلب نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔

"تمہیں میرے بارے میں کرنل فریدی سے اطلاع مل چکی ہوگی۔"

"اچھا...... اچھا۔" وہ چاروں طرف دیکھ کر آہستہ سے بولا۔ "تم اُدھر دفتر میں چل کر بیٹھو۔ میں ابھی آرہا ہوں۔"

اُس نے بائیں جانب والے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ حمید اُس سمت بڑھ گیا۔

چھوٹا سا کمرہ تھا اور سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ سامنے ایک بڑی میز تھی جس کے قریب دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں اور دوسری جانب ایک گھومنے والی کرسی تھی۔

تھوڑی دیر بعد آغا طاہر کوکا کولا کی دو بوتلیں لئے ہوئے دفتر میں داخل ہوا۔

''معافی چاہتا ہوں۔'' وہ ایک بوتل حمید کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ ''آپ کے حلئے نے مجھے برافروختہ کردیا تھا۔ مجھے ہپیوں سے سخت نفرت ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ اس کام کے لئے یہی حلیہ موزوں تھا۔''

''کرنل صاحب کا یہ خیال درست تھا کہ ادھر سے ہی افیون اُدھر لے جاتے ہیں اور آپکی طرف سے اُسی افیون کی ہیروئن بن کر ادھر آتی ہے۔ ہیروئن بنانے کا کارخانہ شکوہ آباد ہی میں کہیں کام کررہا ہے۔''

''ادھر سے افیون تو چلی جاتی ہے لیکن اُدھر سے ہیروئن کیسے آتی ہے۔'' حمید نے سوال کیا۔

''وہی ہپی جو افیون لے جاتے ہیں ہیروئن لے کر واپس آتے ہیں اور یہاں کا ایک بڑا آفیسر اس ہیروئن کو بین الاقوامی تجارت میں جھونک دیتا ہے۔''

''میں سمجھ گیا۔'' حمید سر ہلا کر بولا۔ ''جو ہپی ادھر سے جاتے ہیں اُنہیں پھر ادھر ہی ہٹا دیا جاتا ہے۔ یعنی اُن سے افیون وصول کی گئی اور ہیروئن حوالے کرکے اُنہیں پھر ادھر ہی دھکیل دیا گیا۔''

''جی ہاں......ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ شکوہ آباد کا کوئی ذمہ دار آدمی بھی اس میں ملوث ہے۔''

''جی ہاں......اس کے بغیر تو یہ کام ہو ہی نہیں سکتا۔''

''تو پھر وہ ہپی حقیقتاً ہپی نہ ہوں گے بلکہ تربیت یافتہ کارپرداز ہوں گے۔''

''آپ کا یہ خیال بھی درست ہے۔''

''تو پھر اپنی دال کیسے گلے گی۔''

''ضرور گلے گی۔ اصل کارپرداز تو نصف درجن سے زائد نہیں ہیں۔ ہر مہم پر اُن کے ساتھ نئے چہرے ہوتے ہیں اور یہ واقعی ہپی ہوتے ہیں۔ شکوہ آباد سے سستی چرس حاصل کرنے کے لئے ان کے ساتھ ہولیتے ہیں۔ بہرحال اصل چکر چرس کا نہیں ہے۔ افیون اور

ہیروئن کا کھیل ہے۔''

''ہم تین ہیں۔'' حمید نے کہا۔ ''ہمارے ساتھ ایک سفید فام ہپی لڑکی بھی ہے۔''

''بس تو پھر یہ منزل اور بھی آسان ہوگئی۔ کسی کو شبہ تک نہ ہوسکے گا اور آپ تینوں اُن میں شامل ہوجائیں گے۔''

''تو پھر ہم کب اور کہاں ملیں؟''

''کل شام کو نگار سینما کے قریب۔''

''ٹھیک ہے۔'' حمید اُٹھتا ہوا بولا۔

اُن تینوں کو وہی لینڈ رور ایس پی کے آفس کی کمپاؤنڈ میں داخل ہوتی نظر آئی جس کے مسافر اُن سے نہ صرف اُن کا شکار چھین لے گئے تھے بلکہ انہیں بے بس کرکے پیدل چلنے پر بھی مجبور کردیا تھا۔ قاعدے کی رو سے انہیں حراست میں ہونا چاہئے تھا کیونکہ وہ اپنی پیٹیاں اور رائفلیں کھو بیٹھے تھے۔ لیکن وہ آزاد تھے۔

بڑے جارحانہ انداز میں وہ لینڈ رور کی طرف جھپٹے۔ لیکن گاڑی کے اندر نظر ڈالتے ہی ٹھٹک گئے۔ کیونکہ اُن کی مرمت کرنے والا اس وقت فوجی وردی میں تھا اور اُس کے شانوں پر کرنل کی نشانیاں تھیں۔

پھر اُنہوں نے دیکھا کہ ایس پی بھی اپنے آفس سے نکل آیا ہے اور اُس کی پیشوائی کو آگے بڑھ رہا ہے۔ وہ تینوں جہاں تھے وہیں کھڑے رہے۔

''ہلو کرنل۔'' کہہ کر اُس نے پُرتپاک مصافحہ کیا اور اُسے ساتھ لئے ہوئے اپنے دفتر میں چلا آیا۔

''تشریف رکھئے۔ آپ نے بہت اچھا کیا تھا کہ مجھے فون پر آگاہ کردیا تھا۔''

''میں نے ضروری سمجھا تھا۔'' فریدی بیٹھتا ہوا بولا۔

''ورنہ یہی ہوتا کہ میں اسے کسی تخریب کار کی حرکت سمجھ کر اپنے آدمی شمشاد محل کی

طرف دوڑا دیتا۔"

"اور ان تینوں کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے۔ ناصر خان بہت زیادہ زخمی ہے۔"

"آپ نے بہت اچھا کیا کہ ان کی رائفلیں اور پیٹیاں چھین لیں۔ میں نے اُن مردودوں سے ہرگز یہ نہیں کہا تھا کہ وہ ناصر خان سے بدتمیزی سے پیش آئیں۔ میں نے اُن سے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ اُنہیں شمشاد محل چھوڑ آئیں اور اگر ممکن ہو تو اپنے طور پر اُن سے لیفٹیننٹ داور کا پتہ معلوم کرنے کی کوشش کریں لیکن وہ بدبخت اس حد تک چلے گئے۔ میں آپ ہی کا منتظر تھا۔ اب کیس تیار کرکے اُنہیں اندر کردوں گا۔"

"رائفلیں اور پیٹیاں گاڑی میں رکھی ہوئی ہیں۔ منگوا لیجئے۔" فریدی نے کہا اور جیب سے سگار نکال کر اُس کا گوشہ توڑنے لگا۔ اُس کی آنکھوں سے گہری تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اُس نے کہا۔ "بہرحال میں باضابطہ طور پر شیر افگن کے قتل کی تفتیش کر رہا ہوں۔"

"ظاہر ہے کہ قتل دارالحکومت میں ہوا تھا۔" ایس پی طویل سانس لے کر بولا۔

"لیکن چونکہ وہ یہیں کا باشندہ تھا اس لئے خیال پیدا ہوا ممکن ہے کوئی یہیں سے اُس کے پیچھے لگا ہو اور وہاں پہنچ کر اُسے قتل کردیا ہو۔ اس لئے میں نے بھی کام شروع کردیا تھا۔"

"اقدام غلط نہیں تھا۔" فریدی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا اور سگار سلگانے لگا۔

ایس پی اُسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا اور جب اُس نے سگار سلگا کر اپنا چہرہ اُس کے مقابل کیا تو اُس نے بڑی تیزی سے نظروں کا زاویہ بدل کر کہا۔ "مجھے ان دونوں کے درمیان جھگڑے کی اطلاع ملی تھی۔ اس لئے ناصر خان سے پوچھ گچھ کرنی پڑی۔"

"اور یہ بھی درست ہے کہ لیفٹیننٹ داور ایئرفورس سے تعلق رکھتا ہے اور اچانک غائب بھی ہوگیا ہے۔"

"جی ہاں! میں بھی انہی خطوط پر سوچ رہا ہوں۔" ایس پی جلدی سے بولا۔

"حیرت ہے کہ آپ نے نادر شجاع کو نظرانداز کردیا۔"

"ہرگز نہیں جناب۔" ڈی ایس پی سر ہلا کر بولا۔ "سب سے پہلے میری توجہ اُسی طرف مبذول ہوئی تھی لیکن وہ اس قتل سے پہلے یہیں موجود رہا ہے۔ اب تک کہیں باہر نہیں گیا۔ شیر افگن اُس سے بھی شدید نفرت کرتا تھا اور ہاں ٹھیک یاد آیا...... گذشتہ ہفتے یہاں جو دو چار

دھماکے ہوئے تھے اُن کا ذمہ دار بھی شیر افگن نے نادر ہی کو ٹھہرانے کی کوشش کی تھی۔"

"میں نہیں سمجھا۔" فریدی اُسے غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

"وہ اس سلسلے میں ایک کہانی لے کر میرے پاس آیا تھا۔" ایس پی شہباز نے کہا اور وہی کہانی دہرانے لگا جو شیر افگن فریدی کو پہلے ہی سنا چکا تھا۔

"ہوں......!" فریدی طویل سانس لے کر بولا۔ "تو...... وہ بیوہ۔"

"نادر کی اپنی ماں...... یعنی شیر افگن کی بیوی۔"

"تو کیا چودہ سال پہلے اُس پر اس قسم کے مظالم ٹوٹے تھے۔"

"میں نہیں جانتا کہ حقیقت کیا تھی۔ لیکن سنا ہے کہ نادر کے باپ شجاع نے دولت خان سے قرض لیا تھا جسے ادا کئے بغیر مر گیا تھا۔ دولت خان نے اس کی بیوہ کو اُٹھوا لیا اور وہ ایک ہفتے کے بعد شکوہ آباد کی ایک سڑک پر بیہوش پڑی پائی گئی...... بالکل بے سہارا تھی۔ شیر افگن سہارا بن گیا۔ بہرحال شیر افگن نے اُس اجنبی کا جو خاکہ کھینچا تھا وہ نادر پر پورا اُترتا تھا۔"

"تو آپ نے اس سلسلے میں اُس سے ضرور پوچھ گچھ کی ہوگی۔" فریدی نے کہا۔

"قدرتی بات ہے۔ لیکن مجھے اُس پر یقین نہیں آیا تھا۔"

"یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ۔"

"اس سے پہلے بھی کئی بار شیر افگن اُسے قانونی چکروں میں پھنسا کر جیل بھجوانے کی کوشش کرچکا تھا۔ اُس سے چھٹکارا پانے کی اور کوئی تدبیر بیچارے کی سمجھ ہی میں نہیں آتی تھی۔"

"تو پھر اسے بھی بعید از مکان نہ سمجھنا چاہئے کہ نادر بھی اُس کی تاک میں رہتا ہو۔" فریدی نے کہا۔

"میں کب کہتا ہوں۔ میں نے تو صرف یہ عرض کیا تھا کہ شیر افگن کے قتل سے پہلے ہی سے وہ یہاں موجود رہا ہے۔ میں نے اچھی طرح چیک کرلیا ہے۔"

"اس کے باوجود بھی فی الحال یہی دو افراد مشتبہ ہیں۔ نادر اور داور......!"

"چلئے یونہی سہی۔"

"ان دونوں کے فنگر پرنٹس فراہم ہوسکیں گے؟"

"کیوں نہیں۔"

"مقتول کے کمرے میں پائے جانے والے نشانات میرے پاس محفوظ ہیں۔" فریدی نے کہا۔

"دیکھئے! میری دوراندیشی کی داد دیجئے۔" ایس پی ہنس کر بولا۔ "جیسے ہی مجھے اس قتل کی اطلاع ملی تھی میں نے دونوں مشتبہ افراد کے فنگر پرنٹس حاصل کر لئے تھے۔ نادر کے تو براہ راست لئے تھے اور داور کے اُس کی گاڑی کے اسٹیئرنگ سے۔ اب ذرا یہی دیکھئے کہ گاڑی موجود تھی اور وہ علی آباد غالباً بس سے گیا تھا۔ یہاں سے علی آباد کا فاصلہ صرف پندرہ میل ہے۔ اب یہ ساری باتیں اُسے مشتبہ قرار دینے کے لئے کافی ہیں یا نہیں۔"

"واقعی آپ نے بڑا کام کیا۔"

ایس پی نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجا کر اردلی کو طلب کیا اور اُس سے بولا۔ "نصیر خان سے کہو فنگر پرنٹس کا فائیل لے آئے۔"

تھوڑی دیر بعد فنگر پرنٹس کا فائیل آ گیا تھا اور ایس پی نے اس میں سے دو شیٹ منتخب کر کے فریدی کی طرف بڑھا دیئے تھے۔

اُسی رات کو قریباً گیارہ بجے فریدی اپنے ہوٹل سے فون پر ناصر خان کے نمبر ڈائیل کر رہا تھا۔

دوسری طرف سے جواب ملنے پر بولا۔ "میں فریدی بول رہا ہوں خان! آپ کے صاحبزادے کا پتہ معلوم ہونا بے حد ضروری ہے۔"

"کیوں؟ کیا ہوا؟" دوسری طرف سے ناصر خان کی آواز آئی۔

"حالات ان کے حق میں نہیں ہیں۔"

"میں نہیں سمجھا۔"

"مقتول کے کمرے میں پائے جانے والے انگلیوں کے نشانات میں سے کچھ داور کی انگلیوں کے نشانات سے ٹیلی کر رہے ہیں۔"

"موازنہ کرنے کے لئے آپ کو داور کے نشانہائے انگشت کہاں سے ملے۔" ناصر خان نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔

"شہباز نے فراہم کئے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ قتل اور طریقہ قتل کا علم ہوتے ہی اُس

نے دونوں مشتبہ افراد کے نشانہائے انگشت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"دوسرا کون......؟"

"نادر شجاع......دونوں کے نشانات اس نے فراہم کئے ہیں۔"

"داور کے نشانات اسے کہاں سے ملے؟"

"کہہ رہا تھا کہ داور کی گاڑی کے اسٹیئرنگ سے اٹھائے ہیں اور اس پر بھی حیرت ظاہر کر رہا تھا کہ گاڑی ہوتے ہوئے بھی شائد صاحبزادے نے علی آباد کا سفر بس سے کیا تھا۔"

"گاڑی خراب تھی۔ لیکن میں اسے تسلیم نہیں کر سکتا کہ وہ نشانات داور کے ہوں گے۔ گاڑی کئی دنوں سے کمپاؤنڈ میں ایک درخت کے نیچے کھڑی ہوئی ہے داور اُسے وہیں چھوڑ کر چل دیا تھا۔ اگر آپ اُس کے نشان ہائے انگشت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اُس کے کمرے سے کیجئے۔"

"یہ خیال بھی بُرا نہیں ہے۔" فریدی نے کہا۔ "اچھی بات ہے۔ میں شہباز سمیت کل دس بجے تک شمشاد محل آؤں گا اور اُسی کے آدمی میری نگرانی میں وہاں کام کریں گے۔"

"مجھے منظور ہے۔"

فریدی نے ریسیور کریڈل پر رکھ کر طویل سانس لی اور کھڑکی کے باہر پھیلے ہوئے اندھیرے میں گھورنے لگا۔

پلکیں جھپکائے بغیر وہ قاسم کو دیکھے جا رہی تھی اور قاسم اس طرح سر جھکائے بیٹھا تھا جیسے مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہوں۔ دفعتاً سکی نے کہا۔ "تم میری طرف کیوں نہیں دیکھتے۔"

"آئیں۔ ہاں۔" قاسم چونک پڑا اور پھر ہی ہی اسٹارٹ ہوگئی اور اس میں اچانک بریک بھی لگ گیا۔ شاید خود ہی اس مضحکہ خیزی کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔

"یہ سب کیا کرتے رہتے ہو۔" سکی نے حیرت سے کہا۔

"کچھ بھی نہیں۔" قاسم جھینپ کر بولا۔ "تم اپنی کتاب پڑھو نا۔"

"نہیں اب میں صرف تمہیں پڑھنا چاہتی ہوں۔"

"چرس پیئو......!" قاسم نے یونہی ہانک دی۔

"ترک کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ تم بھی تو نہیں پیتے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔"

"تمہارے ساتھی کی باتیں میری سمجھ میں آ گئی ہیں۔ واقعی میں اب تک غلط راہ پر چلتی رہی ہوں۔ میں کیسے نروان حاصل کر سکتی ہوں جب کہ چرس نہ ہونے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ نہیں ملتی تو اذیت میں مبتلا رہتی ہوں اور یہ بلا میں نے ہی تو اپنے گلے لگائی ہے۔ چرس وقتی طور پر دکھوں سے آزاد کر دیتی ہے۔ دکھوں سے مستقل طور پر نجات نہیں دلا دیتی۔ جوگیوں اور سادھوؤں کے افکار نے مجھے بہکا دیا تھا۔ تمہارے ساتھی نے آنکھیں کھول دی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ دکھوں سے اُسی وقت نجات مل سکتی ہے جب سارے انسان اپنے دکھ آپس میں بانٹ لیں۔ صرف یہی ہے نجات کا راستہ!"

"وہ تو پاگل ہے......بکواس کرتا ہے۔ تم خوب چرس پیئو۔ چاہے جتنی مہنگی ملے میں تمہیں پلاؤں گا۔"

"آخر کیوں؟"

"ارے انسانی ہمدردی بھی تو کوئی چیز ہے اور کسی کام نہیں آ سکتا تو چرس ہی پلاؤں غریبوں محتاجوں کو۔"

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ جتنا وہ عقل مند ہے اُتنے ہی تم گھامڑ ہو۔"

"جو جی چاہے کہو! میں تو مرتے دم تک تمہیں چرس پلاتا رہوں گا۔ تمہیں چرس پینے کی ملازمت دے دوں گا اپنے دفتر میں۔"

"ملازمت......!"

"ہاں......ہاں......سیکریٹری فار چرس نگ! تنخواہ الگ۔ چرس مفت۔"

"ہنسی آ جائے گی مجھے۔"

"آ جانے دو۔ میں نے تہیہ کر لیا ہے۔"

"کیا میں تمہیں اتنی اچھی لگتی ہوں۔"

"یہ تو میں نے نہیں کہا۔" قاسم نے کہا اور دل میں بولا۔ "سالی مونگ کی دال نہ ہنستی ہے نہ مسکراتی ہے۔"

"پھر کیوں میرے لئے اتنی زحمت مول لو گے۔"

"میں زحمت ہی مول لینے کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ میرا مقدر۔" قاسم نے کہا اور اردو میں بڑبڑایا۔ "نہ جانے سالا قہاں جا کر مر غیا ہے......وبال میرے سر چھوڑ غیا۔"

"اور کیا کہہ رہے ہو۔" سکی نے پوچھا۔

"اپنی زبان میں شعر پڑھ رہا تھا۔" قاسم بوکھلا کر بولا۔

"کیا تھا اس شعر کا مطلب......انگلش میں بتاؤ۔"

قاسم کے دیوتا کوچ کر گئے۔ شعر پڑھا ہوتا تو مطلب بھی بتانے کی کوشش کرتا۔ لیکن اب جوبات زبان سے نکل گئی تھی۔ اُسے بہرحال نبھانا تھا۔ لہٰذا ہکلانا شروع کر دیا۔ "اے مخص......کک کیا تو پتھر کا ہے......کہ نہ ہنستا ہے اور نہ مسکراتا ہے......اگر تو واقعی پتھر کا ہے تو آ میں تجھ سے اپنا سر ٹکرا کر پاش پاش کر دوں۔"

سکی نے بہت زور سے قہقہہ لگایا اور قاسم بوکھلا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ویسے اُسے حیرت بھی تھی کہ آخر اُس نے اتنے بامعنی جملے اس طرح کیسے موزوں کر لئے۔

"تمہاری شکایت بجا ہے!" سکی سنجیدگی اختیار کر کے بولی۔ "اچھا اب میں تمہاری خاطر خود کو بدلنے کی کوشش کروں گی۔"

"مم......میری خاطر......!" قاسم ہکلایا۔

"ہاں تمہاری خاطر......زندگی میں پہلی بار مجھے محسوس ہوا ہے کہ آدمی بنیادی طور پر دیوتا تھا۔ لیکن مختلف قسم کے فلسفوں نے اُسے درندہ بنا دیا ہے۔"

"بڑی خوشی ہوئی یہ معلوم کر کے۔" قاسم رواروی میں بولا۔

اتنے میں کسی نے دروازے پر دستک دی اور دونوں چونک کر ادھر متوجہ ہو گئے۔

"قون ہے......!" قاسم نے ہانک لگائی۔

"قراقا خان......!" باہر سے آواز آئی۔

"آ جاؤ......کنڈی نہیں لگی ہوئی ہے۔" قاسم بُرا سا منہ بنا کر بولا۔

حمید دروازہ کھول کر اندر آیا اور باری باری سے دونوں کو دیکھ کر بولا۔ ''کیا ہو رہا تھا۔''

''کچھ بھی نہیں۔'' قاسم جھینپ کر بولا۔ ''حمید بھائی ملے۔''

''فون پر بات ہوئی تھی۔ ابھی وہاں سے روانگی ہی نہیں ہوئی۔''

''لیقن تم نے میری روانگی قرادی۔''

''کیا مطلب......؟''

''اے یہ لونڈیا سیریس ہوغئی ہے...... مجھے نہیں چاہئے۔ مونگ کی دال۔''

''سیریس ہوگئی ہے۔'' حمید نے حیرت سے کہا۔ ''میں نہیں سمجھا۔''

''قہتی ہے تمہاری خاطر میں خود کو بدلنے کی قوشش کروں گی۔''

حمید نے سیٹی بجانے کے سے انداز میں ہونٹ سکوڑے اور پرتشویش نظروں سے سکی کو دیکھنے لگا۔

''اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو۔ اس نے کیا کہا ہے۔'' سکی نے پوچھا۔

''کہہ رہا ہے کہ زندگی میں پہلی بار ایک بھرپور عورت نظر آئی ہے۔''

''ابے...... اغے...... الاقسم اچھا نہیں ہوگا۔'' قاسم گڑبڑا کر بولا۔ لیکن وہ اُس کی طرف دیکھ کر بڑے دلآویز انداز میں مسکرائی تھی۔

قاسم نے حمید کا نام لے لے کر سلواتیں سنانی شروع کیں۔ ''سالے نے پتا نہیں قس پاگل کو میرے پیچھے لغا دیا ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو۔ انگلش میں کہو۔'' سکی خواہ مخواہ ہنس کر بولی۔

''نہیں کہے گا شرماتا ہے مجھ سے سنو۔'' حمید نے کہا۔

''سالے کوئی اُوٹ پٹانگ بات قی تو گلا دبا دوں غا۔''

''یہ سمجھتا ہے کہ میں تم پر عاشق ہوگیا ہوں۔'' حمید نے کہا۔

''دیکھو...... دیکھو...... پھر وہی حرامی پن۔'' قاسم غرایا۔

''مسٹر قاسم اپنی زبان کو لگام دیجئے۔''

''ما بھی چاہتا ہوں۔'' قاسم مسمسی صورت بنا کر بولا۔ ''اردو میں زبان میرے قابو میں نہیں رہتی۔''

''انگریز کے بچے ہو۔'' حمید نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔

''نہیں میں بڑے جالم آدمی کا بچہ ہوں مجھے ماف قر دو۔ میرا باپ بہت جالم ہے۔ اب بی اُس کے سامنے بیٹھا سوچتا رہتا ہوں کہ قہیں قوئی غلط بات زبان سے نہ نکل جائے بس زبان سالی کا قباڑا ہوغیا۔''

''اچھا اچھا...... میں سمجھ گیا۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے مسٹر قاسم! لیکن اس ہوٹل کو تو چھوڑنا ہی پڑے گا۔''

''مم...... میں تیار ہوں۔ ابھی اور اسی وقت چھوڑ دو......!''

قاسم نے کہا اور اُٹھ کر سامان سمیٹنے لگا۔

''یہ کیا کر رہا ہے۔'' سکی نے پوچھا۔

''میں نے اس کی غلط فہمی رفع کر دی ہے کہ میں تم پر عاشق ہوگیا ہوں۔ لہٰذا خوش ہو کر اب ہمیں کسی آرام دہ اور اچھے ہوٹل میں لے جائے گا اور ہم وہیں قیام کریں گے۔''

''یہاں کیا بُرے ہیں لیکن یہ سن کر خوشی ہوئی کہ یہ میرے بارے میں اتنا سنجیدہ ہے۔''

سکی نے کہا اور قاسم ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑا کر رہ گیا۔

''میں سمجھ گئی...... یہ نہیں چاہتا کہ تم اس کے جذبات کی ترجمانی کرو...... بڑا سنسنی خیز تجربہ ہے میرے لئے...... میرے ملک کے نوجوان تو سب کچھ منہ پر پھینک مارتے ہیں۔ اس کے شرمیلے پن کا جادو مجھ پر مسلط ہوتا جا رہا ہے۔''

''اب بتایئے جناب قاسم صاحب۔'' حمید نے چہکار کر کہا۔

''قاسم صاحب سالے کی ایسی کی تیسی۔ کیوں میرا قباڑا کرتے ہو۔ ارے اس کی صورت دیکھ قر میری آنکھوں میں کفن ناچنے لگتا ہے۔''

''میں کیا کر سکتا ہوں...... ویسے کیا پہلے کبھی کوئی لڑکی تم پر عاشق نہیں ہوئی۔''

''جان نہ جلاؤ...... ورنہ بچ بچ ہاتھ پیر توڑ قر رکھ دوں گا۔''

''اچھا چلو اُٹھو...... یہیں نہیں بیٹھے رہنا۔ اب کسی اچھے ہوٹل میں قیام کریں گے۔''

''قیوں...... یہاں کیا بُرائی ہے۔''

''ابھی ابھی کیپٹن حمید نے فون پر بتایا ہے کہ تم کس قسم کی لڑکیاں پسند کرتے ہو۔''

"لڑکیاں جائیں جہنم میں۔ میں تمہارے ساتھ کہیں بھی نہ جاؤں غا۔"

"کیوں نہیں جاؤ گے۔"

"میں نہیں جانتا کہ تم قون ہو۔"

"سچ سچ قرا قا خان ہوں قو خان کی طرح بناسپتی نہیں ہوں۔"

"اب یہ قھونے بیٹا......خود ہی تو مجھے قو خان بنایا تھا۔"

"بس مسٹر قاسم زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کیجئے میں جارہا ہوں۔ آپ جائیں اور آپ کا کام۔"

"ارے......ارے......ٹھہرو......میں اقیلے نہیں رہوں غا۔

حمید دروازے کے قریب رک کر بولا۔ "اب آپ اکیلے نہیں ہیں یہ لڑکی آپ کی سرپرست بن جانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔"

"کیا بات ہے۔" سکی اُٹھتی ہوئی بولی۔ "کیا تم دونوں آپس میں جھگڑا کر رہے ہو۔"

ناصر خان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ کیونکہ فریدی نے رہی سہی اُمید پر بھی پانی پھیر دیا تھا کہ داور کے کمرے سے لئے گئے نشانات انگشت بھی اُن نشانات سے مختلف نہیں ہیں جو شہباز نے داور کی گاڑی کے اسٹیئرنگ سے حاصل کئے تھے۔

"تو پھر آپ بھی اُسے مجرم سمجھ رہے ہیں۔" ناصر نے نحیف سی آواز میں کہا۔

"صرف مشتبہ..... جرم ثابت ہوئے بغیر کسی کو بھی مجرم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ویسے کیا داور نے آپ دونوں کے درمیان ہونے والے جھگڑے کو بہت زیادہ اہمیت دی تھی۔"

"ہرگز نہیں۔ وہ تو سن کر ہنسنے لگا تھا اور کہا تھا کہ آدمی اسی لئے بوڑھا ہوتا ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر لڑتا جھگڑتا رہے اور مجھے اس کا یہ ریمارک لفظ بلفظ یاد ہے کہ شیر افگن صاحب دل کے بُرے نہیں ہیں۔ بس کمزور اعصاب کی بناء پر جلد طیش میں آجاتے ہیں۔"

"بہرحال اب یہ بے حد ضروری ہوگیا ہے کہ اُس کا پتہ لگ جائے جیسے ہی مجھے علم ہوا

آپ کو آگاہ کردوں گا۔ اگر سچ مچ وہ اس جرم میں ملوث ہے تو آپ دیکھیں گے کہ میں اُسے کس طرح قانون کے حوالے کرتا ہوں۔"

"مجھے یقین ہے آپ ایسا ہی کریں گے۔"

شمشاد محل سے نکل کر فریدی شیر افگن کی کوٹھی کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس کی بیوہ کو پہلے ہی مطلع کردیا تھا کہ وہ کس وقت پہنچ رہا ہے۔

نذرہ خاتون شیر افگن کی بیوہ اس وقت بھی ایسی ہی لگ رہی تھی جیسے کچھ دیر پہلے روتی رہی ہو۔ فریدی کے استفسار پر اُس نے بتایا کہ ناصر خان سے شیر افگن کا جھگڑا ضرور ہوا تھا لیکن بعد میں وہ اپنے رویئے پر سخت شرمندہ نظر آتا تھا اور اس نے کھل کر یہ بات کہی تھی کہ اس سے زیادتی سرزد ہوئی ہے۔ محض شبہے کی بناء پر براہِ راست الزام نہ رکھ دینا چاہئے تھا۔

"بات ناصر خان ہی نے بڑھائی تھی۔" اُس کے بیٹے نادر نے کہا جو اُس کی کرسی کے پیچھے کھڑا اُسے پُرتشویش نظروں سے دیکھے جارہا تھا۔ خاصا قوی ہیکل جوان تھا۔ جبڑے بھاری تھے اور آنکھوں کی بناوٹ بھی سخت گیر طبیعت کی طرف اشارہ کرتی تھی۔

"تم خاموش رہو۔" نذرہ خاتون نے کہا۔ "ناصر خاں بھی بُرے آدمی نہیں ہیں۔ اگر وہ الزام پر بھڑکے تو اسے تقاضۂ بشریت کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن میں تصور بھی نہیں کرسکتی کہ اس قتل میں ان کا ہاتھ بھی ہوگا۔"

"کسی پر شبہ ہے آپ کو۔"

"جی نہیں! وہ فطرۃً جھگڑالو آدمی نہیں تھے۔ اس لئے کسی سے دشمنی نہیں تھی۔"

"میں نے سنا ہے کہ وہ کسی ایسے مرض میں مبتلا تھے کہ اچانک چلنے پھرنے سے معذور ہوجاتے تھے۔"

"جی ہاں۔"

"اور اس کے باوجود بھی آپ لوگوں نے اُنہیں تنہا سفر کرنے دیا۔"

"وہ تنہا تو نہیں گئے تھے۔"

اس جواب پر فریدی نے نادر کو چونکتے دیکھا اور فوراً ہی اُس پر سے نظر ہٹالی۔

"کون تھا اُن کے ساتھ؟" فریدی نے سوال کیا۔

"انہوں نے مجھے اُس کا نام نہیں بتایا تھا۔ بس یہ کہا تھا کہ وہ دارالحکومت ہی کا ایک کاروباری آدمی ہے اور اس سے کچے چمڑے کا لین دین رہتا ہے۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اُن کے ساتھ پھر شکوہ آباد آئے گا۔"

"آپ نے مجھ سے تو ذکر نہیں کیا تھا۔" نادر بولا۔

"کیا یہ ضروری تھا......؟" نذرہ خاتون نے اُس سے سوال کیا۔

"جی نہیں...میرا یہ مطلب تھا کہ......!"

"خاموش کھڑے رہو......دخل اندازی کی ضرورت نہیں۔"

فریدی نے محسوس کیا کہ وہ اپنے بیٹے کو شائد پسند نہیں کرتی۔ دفعتاً فریدی نے نادر سے سوال کیا۔ "آپ ایئر فورس میں ہیں۔"

"ہوں نہیں بلکہ تھا۔ ونگ کمانڈر سے جھگڑا ہوگیا تھا۔ اس لئے اُس نے بعض فرضی معاملات میں پھنسا کر برخواست کرادیا۔ لیکن کیا آپ نے یہ سوال اس لئے کیا ہے کہ قاتل نے فرار کے لئے پیراشوٹ استعمال کیا تھا۔"

"آپ ان کی روانگی کے بعد کہاں کہاں رہے۔"

"اوہ...... یہ تو براہِ راست الزام والی بات ہوئی۔"

"میرے سوال کا جواب دیجئے۔"

"میں یہیں شکوہ آباد میں رہا ہوں۔ ایک گھنٹے کے لئے بھی باہر نہیں گیا۔ واضح ثبوت پیش کرسکوں گا۔"

"لیفٹیننٹ داور کیسا آدمی ہے؟"

اس سوال پر نادر نے اپنے شانے سکوڑے اور پھر انہیں ڈھیلا چھوڑ کر بولا۔ "میں تو ہر ایک کو اچھا سمجھتا ہوں کرنل صاحب۔"

"نہیں! وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔" نذرہ خاتون نے کہا۔ میں تصور بھی نہیں کرسکتی۔ وہ بیچارہ تو دوسرے ہی دن اُن سے اپنے باپ کے روئیے پر معافی مانگنے آیا تھا۔

"آپ نے اس کا تذکرہ بھی مجھ سے نہیں کیا۔" نادر بولا۔

"ضرورت نہیں سمجھی تھی۔" نذرہ خاتون نے سخت لہجے میں کہا۔

"میرا خیال ہے کہ یہاں میری موجودگی بھی ضروری نہیں ہے۔" نادر نے کہا اور پیر پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ اپنے بیٹے سے ناراض ہیں۔" فریدی نے کہا۔

"میں اُس سے نفرت کرتی ہوں۔"

"اُوہ......!" فریدی نے حیرت ظاہر کی۔

"اور اس لئے نفرت کرتی ہوں کہ وہ بھی اُس سے سخت متنفر تھے۔ انہوں نے اس کے لئے کیا نہیں کیا۔ لیکن یہ باپ تو کیا سمجھتا، کبھی ایک ہمدرد انسان کی حیثیت سے بھی اُن کی قدر نہیں کی۔"

"بڑی عجیب بات ہے۔"

"ایک آنسو بھی تو اس کی آنکھ سے نہیں ٹپکا تھا۔ اگر آپ اس کے اور اُن کے تعلقات کے بارے میں مزید معلوم کرنا چاہتے ہوں تو ہماری ملازم شیر گل سے پوچھیئے۔"

"تو آپ کو یقین ہے کہ نادر صاحب اس دوران میں یہیں رہے ہیں۔"

"میں نہیں جانتی۔ وہ یہاں رہتا ہی کب ہے۔"

"پھر کہاں رہتے ہیں۔"

"یہ بھی شیر گل ہی سے پوچھ لیجئے گا۔"

"کیا ان کا آپس میں جھگڑا بھی ہوتا تھا۔"

"نہیں......اس کے باوجود بھی دونوں کے درمیان تناؤ رہتا تھا۔"

"آخر کس بناء پر۔"

"وہ اسے ایک شریف آدمی دیکھنا چاہتے تھے۔"

"ہاں......آپ داور کے بارے میں بتا رہی تھیں کہ وہ معافی مانگنے آیا تھا۔"

"جی ہاں......وہ داور کو بہت پسند کرتے تھے۔ بچپن ہی سے وہ اُن سے مانوس تھا اور اپنے گھر والوں سے چھپ چھپ کر یہاں آیا کرتا تھا۔ دراصل انہیں باغبانی کا شوق تھا اور داور کو بھی اس سے لگاؤ تھا۔ وہ اُن سے پودوں کی پیوند کاری سیکھتا تھا۔ گھر والوں سے چھپ کر اس لئے آتا تھا کہ وہ بڑے لوگ ہیں اور اُن کی دانست میں یہ ایک گھٹیا کام ہے جو نچلے

ہی طبقے والوں کے لئے موزوں ہے۔‘‘

’’وہ غالباً چھٹی پر ہے ان دنوں۔‘‘

’’جی ہاں......اس دوران میں کئی بار آچکا ہے۔ میرا مطلب ہے اُنکی روانگی سے قبل۔‘‘

’’تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں۔ اب اجازت دیجئے۔‘‘ فریدی اُٹھتا ہوا بولا۔ ’’ہاں یہ شیر گل کہاں ملے گا۔‘‘

’’کمپاؤنڈ کے پھاٹک سے ملحق کوٹھری میں رہتا ہے۔ کئی دنوں سے بیمار ہے۔ اُسے حادثے اس گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ آٹھ سال کی عمر سے ہمارے ساتھ ہے۔ وہ اُسے بیٹوں کی طرح عزیز رکھتے تھے۔‘‘

’’گویا جوان آدمی ہے۔‘‘

’’جی ہاں......زیادہ سے زیادہ بیس سال کا ہوگا۔‘‘

فریدی وہاں سے اُٹھ کر شیر گل کی کوٹھری کی طرف آیا۔ وہ دروازے کے سامنے ہی چارپائی پر بیٹھا کھانس رہا تھا۔ فریدی کو دیکھ کر اُٹھ گیا۔

’’فرمایئے جناب۔‘‘ اُس نے بڑے ادب سے کہتے ہوئے چارپائی چھوڑ دی۔

’’نادر صاحب کہاں ہیں۔‘‘

’’جی.....ابھی تو آئے تھے......چلے بھی گئے۔ آپ اندر سے دریافت فرمالیجئے جناب۔‘‘

’’بیگم صاحبہ نے اس سلسلے میں تمہارا نام لیا تھا۔‘‘

’’مم......میرا نام۔‘‘

’’میں دراصل تمہارے مالک کے قتل کی تفتیش کے سلسلے میں دارالحکومت سے آیا ہوں۔‘‘

دفعتاً فریدی نے محسوس کیا کہ اس حوالے پر اُس کے چہرے پر مردنی چھا گئی ہے۔

’’کیا تم اس سلسلے میں میری مدد کرسکو گے۔‘‘

’’یہاں تو آپ کو بٹھانے کے لئے کچھ نہیں ہے۔‘‘

’’اس کی پرواہ نہ کرو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے مالک نے یہ سفر تنہا نہیں کیا تھا۔ کون تھا اُن کے ساتھ۔‘‘

’’ہاں......انہیں بھی معلوم نہیں۔‘‘

’’صاحب ایسے ہی تھے جس معاملے کو ظاہر نہ کرنا چاہتے اُس کی کسی کو ہوا بھی نہیں لگ سکتی تھی۔‘‘

’’جانے سے قبل ان کا کسی سے جھگڑا ہوا تھا۔‘‘

’’جی ہاں......خان ناصر سے تکرار ہوگئی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اُن کے ملازموں نے ہمارے تین مویشی چرالئے ہیں۔‘‘

’’اس پر خان ناصر کا لڑکا داور برہم ہوگیا تھا۔‘‘

’’سوال ہی نہیں پیدا ہوتا جناب۔ خان داور تو ان کا باپ کی طرح احترام کرتے تھے۔ کسی نے آپ کو غلط راستے پر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔‘‘

’’میں نے پوچھا تھا نادر صاحب سے کہاں ملاقات ہوسکے گی۔‘‘

’’اُن کا کوئی ایک ٹھکانا نہیں ہے۔ قریباً دو سال سے وہ اس حویلی کی چھت کے نیچے نہیں سوئے۔‘‘

’’کرتے کیا ہیں۔ ہوائی فوج سے تو چھٹی ہوگئی تھی۔‘‘

’’میں نہیں جانتا کیا کرتے ہیں۔‘‘

’’شیر افگن سے کیسے تعلقات تھے۔‘‘

’’بیگم صاحبہ سے معلوم فرمائیں جناب۔‘‘

’’انہوں نے کہا ہے شیر گل مجھ سے زیادہ بہتر طور پر بتا سکے گا۔‘‘

شیر گل طویل سانس لے کر رہ گیا۔ چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

’’بس ایسے ہی تعلقات تھے کہ اُن کے قتل کی خبر سن کر بُرا سا منہ بنایا تھا اور بولے تھے ڈیڑھ بالشت کا آدمی نوگزی طوائفیں تلاش کرتا پھرے گا تو اور کیا ہوگا۔ مارے گئے ہوں گے کسی بھڑوے کے ہاتھوں اور پھر مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے رہے تھے کہ صاحب عیاشی کی خاطر شکوہ آباد سے باہر جاتے رہتے ہیں۔‘‘

’’ہوں......اور وہ خود اس دوران میں یہیں رہا تھا۔‘‘

’’میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ یہاں تو کبھی کبھار آتے ہیں۔‘‘

’’یہ بات اُنہوں نے کب کہی تھی۔‘‘

"کل شام کو۔"

"پرسوں بھی یہیں تھا۔"

"میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔"

"اس کی تصدیق کہاں سے ہو سکے گی کہ شیر افگن صاحب کی روانگی کے بعد سے وہ یہیں رہا ہے۔"

"پروفیسر ملیٹھی......اوہ پروفیسر خلجی ہیں ایک صاحب......نادر میاں کا زیادہ تر وقت اُنہی کے ہاں گزرتا ہے، ان کی صاحبزادی کے ساتھ۔ بہت دنوں سے وہ لوگ اُس بوٹی کی تلاش میں ہیں جس سے سونا بن جاتا ہے۔"

فریدی کی پیشانی پر سلوٹیں اُبھر آئیں اور شیر گل کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ "ان کی صاحبزادی اور نادر میاں کے بڑے چرچے ہیں شکوہ آباد میں۔ میرے صاحب کو نادر میاں کی یہی باتیں پسند نہیں تھیں۔"

"دونوں کے درمیان اس سلسلے میں جھگڑے بھی ہوتے رہے ہوں گے۔"

"جی نہیں! میرے صاحب نے کبھی کوئی بات اُن کے منہ پر نہیں ڈالی۔ لیکن شدت سے متنفر تھے۔ ارے وہ تو سوتیلے باپ تھے۔ خود بیگم صاحبہ اُن کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں ہیں۔"

"تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ ان کا قاتل کس طرح فرار ہوا تھا۔"

"جی ہاں! میں نے اخبارات میں تفصیل دیکھی تھی۔"

"پیراشوٹ کا استعمال وہی کر سکتے ہیں۔ جنہوں نے اس کی باقاعدہ طور پر ٹریننگ لی ہو۔"

"میں سمجھ رہا ہوں آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ میں پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں پھر بھی پڑھنے کا شوق ہے اور کچھ نہ کچھ پڑھتا ہی رہتا ہوں۔ نادر میاں اپنی ماں کی موت سے پہلے صاحب کی املاک پر قابض نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا وہ ایسی حماقت کیوں کرنے لگے۔ یا پھر وہ اتنے ہی سنگدل ہوں گے کہ کچھ دنوں کے بعد ماں کو بھی زہر دے دیں اور پھر صاحب کے ایک سوتیلے بھائی بھی تو ہیں۔ انکی موجودگی میں بیگم صاحبہ کو صرف اتنا ہی ملے گا جتنا ان کا حق ہے۔"

"ظاہر ہے۔" فریدی سر ہلا کر بولا۔

"اور ان کے حصے کا ہرگز اتنا نہیں ہو سکتا جس کیلئے نادر میاں ایسا کوئی قدم اُٹھائیں۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔ تم بہت ذہین ہو۔"

"مجھے بھی نادر میاں اچھے نہیں لگتے۔ لیکن میں خدا لگتی کہوں گا۔"

"غالباً پندرہ دن پہلے یہاں کچھ دھماکے ہوئے تھے۔"

"جی ہاں۔ ہوئے تو تھے۔"

"میرا خیال ہے کہ کچھ لوگ زخمی بھی ہوئے تھے۔"

"نہیں جناب......زخمی تو کوئی نہیں ہوا۔ کچھ پتا ہی نہ چل سکا کہ دھماکے کرنے والے کیا چاہتے تھے۔"

"کیوں؟"

"وہ ساری عمارتیں خالی تھیں جن میں دھماکے ہوئے تھے؟"

"بڑی عجیب بات ہے؟" فریدی نے پرتشویش لہجے میں کہا۔ "لیکن گرفتاریاں تو ہوئی تھیں؟"

"جی ہاں۔" شیر گل نے بُرا سا منہ بنا کر کہا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"شیر افگن صاحب نے داور کے باپ کی توہین کی تھی۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اپنا غم و غصہ ظاہر نہیں ہونے دیتے اور اپنی اسی فطرت کی آڑ میں بڑے سے بڑا جرم کر جاتے ہیں۔"

"جی ہاں، ہر طرح کے لوگ ہیں دنیا میں۔ لیکن نہ جانے کیوں میں داور صاحب کے بارے میں ایسا نہیں سوچ سکتا۔"

"کوئی خاص وجہ۔"

"آٹھ سال کی عمر سے اُن کو دیکھتا آ رہا ہوں۔ اُن کے ظاہر و باطن میں کبھی کوئی نمایاں فرق محسوس نہیں کیا۔"

"پچھلی بار وہ یہاں کب آیا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ اس بار تو نہیں آئے۔ لیکن نہیں ٹھہریئے......جی ہاں صرف ایک بار آئے تھے۔ اس کے دوسرے دن......میرا مطلب ہے کہ جب صاحب کا ان کے باپ سے

جھگڑا ہوا تھا اُس کے دوسرے دن اور میری موجودگی ہی میں اپنے باپ کے رویئے پر شرمندگی ظاہر کی تھی۔‘‘

’’بڑی غیر فطری سی بات ہے۔‘‘ فریدی نے کہا۔

’’اب آپ جو چاہیں تصور فرمائیں۔ میں نے تو جو دیکھا تھا عرض کر رہا ہوں۔‘‘

’’اچھا تو پھر کسی ایسے دشمن کی نشاندہی کرو جو تمہاری دانست میں اس حد تک جاسکتا ہو۔‘‘

’’ان کا کوئی ایسا دشمن نہیں تھا۔‘‘

’’ہوسکتا ہے ناصر خان نے اس سلسلے میں کسی اور سے مدد لی ہو۔ شکوہ آباد میں صرف یہی دو عدد ٹرینڈ افراد تو نہ ہوں گے۔‘‘

’’اسکے بارے میں کیا عرض کرسکتا ہوں۔ ویسے ناصر خان بہت زیادہ بھڑک اُٹھے تھے۔‘‘

’’کوئی ایسا آدمی جو ٹرینڈ بھی ہو اور ناصر خان سے قریب بھی۔‘‘

’’میں ایسے کسی آدمی کو نہیں جانتا جناب۔‘‘

’’بہت شکریہ شیر گل۔ تم سے بڑی مدد ملی ہے۔‘‘

’’میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں جناب۔‘‘

فریدی نے اپنی گاڑی پھاٹک کے باہر کھڑی کی تھی۔ وہاں سے اپنے ہوٹل واپس آیا اور فون پر ایس پی شہباز کے نمبر ڈائیل کئے۔ دوسری طرف سے فوراً ہی جواب ملا۔

’’میں کئی بار رنگ کر چکا ہوں۔‘‘ شہباز کی آواز آئی۔ ’’تازہ ترین اطلاع ہے کہ داور زری کوہ میں پہاڑی بکروں کا شکار کھیل رہا ہے۔ آپ خود دیکھیں گے یا میں اپنے آدمی بھیجوں۔‘‘

’’میں خود ہی دیکھ لوں گا، ویسے اگر آپ کا بھی کوئی آدمی ساتھ ہو تو بہتر ہوگا۔‘‘

’’بڑی خوشی سے۔ اس کے علاوہ بھی کوئی اور خدمت ہو تو۔‘‘

’’بہت بہت شکریہ...... اتنا ہی کافی ہے۔ آپ تین بجے کے قریب اپنے آدمی کو یہیں بھیج دیجئے گا۔‘‘

’’بہت بہتر۔‘‘

سلسلہ منقطع کرکے فریدی نے کسی اور کے نمبر ڈائیل کئے تھے۔ دوسری طرف سے نسوانی آواز آئی۔

’’پروفیسر خلجی سے ملنا ہے۔‘‘ فریدی نے کہا۔

’’کون صاحب ہیں۔‘‘

’’کرنل فریدی۔‘‘

’’توقف فرمایئے۔‘‘

فریدی انتظار کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد پوچھا گیا۔ ’’کون کرنل فریدی۔‘‘

’’یہ پروفیسر خلجی ہی کی آواز تھی۔ بلکہ ایسا ہی لگا تھا جیسے کوئی بلی میاؤں میاؤں کرتے کرتے آدمی کی طرح بولنے لگی ہو۔‘‘

’’اُوہ، پروفیسر مزاج بخیر۔‘‘

’’بخیر و خیر کچھ نہیں۔ میں نے پوچھا تھا کون کرنل فریدی۔‘‘

’’احمد کمال فریدی۔ ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی تو نہیں ہیں۔‘‘

’’شکل دیکھے بغیر یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے نام یاد نہیں رہتے۔‘‘

’’تو پھر میں آجاؤں شکل دکھانے۔‘‘

’’اس وقت فرصت نہیں ہے۔ بکری کی جوئیں نکال رہا ہوں۔‘‘

’’کب فرصت ہوگی۔‘‘

’’اس کے بعد۔‘‘

’’اور یہ بعد کب ہوگا۔‘‘

’’تم جھکی ہو کیا......؟‘‘ پروفیسر نے غصیلے لہجے میں کہا۔

’’شکل دیکھ کر ہی فیصلہ کرسکو گے۔‘‘

’’اچھا تو آجاؤ۔ میں بکری سے معذرت طلب کرلوں گا۔‘‘

’’کیا عمر ہے بکری کی......!‘‘

’’یہی دو ڈھائی سال۔‘‘

’’بہت اچھا...... میں آرہا ہوں۔‘‘

فریدی نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ گھنٹی بجی اور اُس نے پھر ریسیور اُٹھایا۔

’’بی تھرٹین۔‘‘ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ’’گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے یونٹ اُٹھا

کر دیکھ لیجئے گا۔ بی الیون اُس شخص کا تعاقب کر رہا ہے جس نے گاڑی میں کوئی گڑبڑ کی تھی۔‘‘

’’شکریہ بی تھرٹین۔‘‘ کہہ کر فریدی نے ریسیور رکھ دیا۔ اُس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنے کمرے سے نکل کر ڈائننگ ہال میں آیا۔ کافی پی اور سگار سلگا کر اُٹھ گیا۔

’’گاڑی کے قریب آیا۔ بونٹ اُٹھا کر دیکھا۔ سلف اسٹارٹر کے کھوکھلے پر میکنیک شیل والا ایک چھوٹا سا بم چپکا ہوا تھا اور اُسے ایک تار کے ذریعے اسٹارٹر کے تار سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی ایک زبردست دھماکہ ہوتا اور پھر گاڑی رہتی اور نہ اسٹارٹ کرنے والا۔

فریدی نے سگار زمین پر ڈال کر جوتے سے رگڑ دیا اور اسٹارٹر سے بم الگ کرنے لگا اور پھر ذرا ہی سی دیر میں اُسے ناکارہ کر کے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا تھا۔

اور اب لینڈ رور پروفیسر خلجی کے ٹھکانے کی جانب رواں دواں تھی۔ سگار فریدی کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

تھوڑی دیر بعد اس نے ڈیش بورڈ پر ایک بٹن دبایا۔ سائیں سائیں کی آوازیں آنے لگیں اور اُس نے اونچی آواز میں کہا۔ ’’ہیلو...... بی الیون...... بی الیون...... ہارڈ اسٹون کالنگ۔‘‘

’’بی الیون سر۔‘‘ ڈیش بورڈ سے آواز آئی۔

’’کیا تعاقب جاری ہے۔‘‘

’’مجھے افسوس ہے جناب کہ وہ مجھے دھوکا دے گیا۔ بازار زرگراں میں ایک جگہ اُس نے گاڑی روکی تھی اور اُتر کر ایک دوکان میں داخل ہوا تھا۔ پھر سراغ نہیں مل سکا۔ گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا ہے۔‘‘

’’فکر نہ کرو۔ دیکھا جائے گا۔‘‘ فریدی نے کہا اور دوسرا بٹن دبا کر ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔

پروفیسر خلجی کا بے ہنگم سا بنگلہ ایک ویران سے ٹیلے پر واقع تھا۔ بنگلے تک پہنچنے کیلئے پروفیسر نے ایک چکر دار سڑک بنوائی تھی جس پر ایک وقت میں صرف ایک ہی گاڑی چل سکتی تھی۔

پروفیسر سچ مچ ایک بکری کی جوئیں تلاش کرتا ہی دکھائی دیا۔ عمارت کے باہر ایک درخت کے نیچے بکری کو دبوچے بیٹھا تھا۔ خاصا لحیم شحیم آدمی تھا۔ بال بکھرے ہوئے آنکھوں میں وحشت اور ہونٹوں میں عجیب طرح کا کھنچاؤ پایا جاتا تھا۔ فریدی پر نظر پڑتے ہی بکری کو چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

زور سے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ’’اوہو تو ناریل صاحب ہیں۔‘‘

’’مجھے یقین تھا کہ تم مجھے بھولے نہ ہو گے۔‘‘

’’سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔‘‘ وہ جھپٹ کر مصافحہ کرتا ہوا بولا۔ ’’بکریوں کی جوئیں بھی میری پیدا کردہ ہیں خاص قسم کی جوئیں ایک خاص قسم کی بوٹی کھلا کر پیدا کی ہیں۔‘‘

’’ان جوؤں کا کیا کرو گے۔‘‘

’’ساری دنیا کی بکریوں میں پھیلاؤں گا اور پھر وہ دوا بازاروں میں بھیجوں گا جس سے ان جوؤں کا خاتمہ ہو سکے گا۔‘‘

’’خیال اچھا ہے۔‘‘

’’اس سے بھی زیادہ اچھے خیالات میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔‘‘

’’کیا تم مجھے اندر لے جا کر بٹھاؤ گے بھی نہیں۔‘‘

’’ارے ہاں...... وہ تو میں بھول ہی گیا۔ مہمانوں کو بٹھاتے بھی ہیں۔ آؤ...... آؤ۔‘‘

ڈرائینگ روم کیا تھا اچھا خاصا باغیچہ تھا۔ جگہ جگہ گملے رکھے ہوئے تھے جن میں بھانت بھانت کے پودے لگے ہوئے تھے اور دیواروں پر طرح طرح کی بیلیں رینگ رہی تھیں۔

’’تم میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہیں ہوئی پروفیسر۔‘‘ فریدی نے کہا۔

’’اور کیا تم میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے ناریل صاحب۔‘‘

’’نہیں مجھ میں بھی نہیں ہوئی۔‘‘

’’ہاں...... اب مجھے کہنا چاہئے کہ تشریف رکھئے جناب۔‘‘ فریدی ایک صوفے پر سے کسی قسم کی گھاس کا چھوٹا سا گٹھرا ہٹا کر بیٹھتا ہوا بولا۔

’’کیا تکلیف ہے تمہیں۔‘‘

’’ایک قتل ہو گیا ہے۔ دارالحکومت میں۔ یہیں کا باشندہ تھا۔ شیر افگن۔‘‘

''ہاں تھا تو......پھر میں کیا کروں۔''

''میں نے سنا ہے کہ اُس کی بیوی کا بیٹا نادر تمہارے گہرے دوستوں میں سے ہے۔''

''ہاں ہے تو......اُسے بھی جڑی بوٹیوں سے دلچسپی ہے۔''

''کیا وہ پچھلے ایک ہفتے سے اب تک یہیں رہا ہے۔''

''یہاں کیوں رہتا۔ کیا یہ اُس کے باپ کا گھر ہے۔''

''نہیں میرے باپ کا گھر ہے اس لئے وہ یہاں رہ سکتا ہے۔'' دفعتاً بائیں جانب سے ایک چیختی ہوئی سی نسوانی آواز آئی۔

فریدی اُٹھ گیا۔ شاید یہ پروفیسر کی بیٹی رضوانہ تھی۔ بہت چھوٹی سی تھی۔ جب فریدی نے اسے دیکھا تھا۔ اب تو پہاڑ ہوگئی تھی۔ باپ ہی کا سا ڈیل ڈول پایا تھا۔ خطوط دلآویز تھے۔ لیکن آنکھوں میں باپ ہی کی سی آنکھوں کی وحشت پائی جاتی تھی۔ بڑے بڑے بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے اور اُس نے ہپی لڑکیوں سی وضع اختیار کر رکھی تھی۔

''یہ...... یہ بابونہ ہے۔'' پروفیسر نے تعارف کرایا ''اور مسٹر ناریل......انہوں نے اپنا نام فون پر کچھ اور بتایا تھا لیکن میں انہیں ناریل کے نام سے یاد رکھتا ہوں۔''

''اور رضوانہ کو بابونہ بنا دیا ہے۔'' فریدی مسکرا کر بولا۔

''شائد میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔'' رضوانہ بولی۔

''بہت چھوٹی سی تھیں تم جب مجھے ایک ماہ کے لئے جڑی بوٹیوں سے دلچسپی ہوگئی تھی اور میں پروفیسر کے ساتھ یہاں کے جنگلوں میں بھٹکتا پھرتا تھا۔''

''آپ شائد نادر کے بارے میں کچھ پوچھ رہے تھے۔ مجھ سے پوچھئے وہ میرا دوست ہے۔''

پروفیسر ایک طویل سانس لے کر دھم سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

''میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ پچھلے ہفتے سے اب تک وہ کہاں کہاں رہا ہے۔''

''پچھلے ہفتے سے اب تک ہر رات اُس نے یہیں گزاری ہے۔ لیکن ڈیڈی کو اس کا علم نہیں۔ رات کو اُس کے لئے لائبریری میں پلنگ ڈلوایا جاتا ہے اور وہ رات گئے تک کتابوں میں کھویا رہتا ہے۔''

''مجھے کیوں علم نہیں ہے۔'' پروفیسر زور سے چیخا۔

''ضروری نہیں ہے کہ اس وسیع کائنات میں واقع ہونے والی ہر بات کا علم آپ کو ہو۔ آپ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ آپ کا دل اس وقت کس رفتار سے دھڑک رہا ہے۔''

''تم نے دیکھا'' دفعتاً پروفیسر خوش ہو کر بولا۔ ''بابونہ کتنی عقلمند ہے۔''

''تمہاری ہی بیٹی ہے۔'' فریدی نے مسکرا کر کہا اور چند لمحے خاموش رہ کر بولا ''ہاں تو وہ لائبریری میں سوتا ہے۔''

''جی ہاں اور اُس نے شیر افگن کے قتل کی خبر سنتے ہی کہہ دیا تھا کہ اُس پر ضرور شبہ کیا جائے گا۔''

''اوہو......لیکن شبہے کی بھی کوئی معقول وجہ ہوتی ہے۔''

''قاتل کے فرار کا طریقہ۔ اُس نے پیراشوٹ استعمال کیا تھا اور وہ ٹرینڈ قسم کا پیراٹروپر ہے۔''

''لیکن اگر یہ ثابت ہوجائے کہ وہ اس دوران میں شکوہ آباد سے باہر نہیں گیا تو شبہے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

''آپ دارالحکومت سے آئے ہیں اور آپ نے فون پر اپنا نام کرنل فریدی بتایا تھا۔''

''جی ہاں۔''

''ایس پی شہباز کے آدمی بھی یہاں آکر اُس کے بارے میں پوچھ گچھ کر چکے ہیں۔''

''نادر صاحب اس وقت کہاں ہیں میں ان سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔''

''اس وقت پتا نہیں کہاں ہوگا۔ لیکن شام تک ضرور آئے گا۔ رات یہیں بسر کرتا ہے۔ دراصل ہم دونوں ایک خاص قسم کی بوٹی کی تلاش میں ہیں۔''

''وہ تمہیں کبھی نہیں ملے گی۔ اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔'' پروفیسر سخت لہجے میں بولا۔

''کس بوٹی کا ذکر ہے۔'' فریدی نے پوچھا۔

''سوفی بوٹی کا جس سے سونا بن جاتا ہے۔'' پروفیسر بولا اور بُرا سا منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''چیتے کی کھال والی جلد کی قلمی کتاب میں اُس کا ذکر موجود ہے۔'' رضوانہ نے کہا۔

''بکواس ہے! بادشاہوں کو خوش کرنے کے لئے بعض چالاک قسم کے پڑھے لکھے لوگ

اس قسم کی ہوائیاں چھوڑ دیا کرتے تھے۔"

"نادر کا ذریعہ معاش کیا ہے؟" فریدی نے رضوانہ سے سوال کیا۔

"میں نہیں جانتی۔لیکن اس کی جیب کبھی خالی نہیں دیکھی۔"

فریدی نے جیب سے سگار نکالا ہی تھا کہ پروفیسر ہاتھ اُٹھا کر بولا۔"یہاں نہیں! بعض پودے تمباکو کا دھواں برداشت نہیں کر سکتے۔"

"آپ میرے کمرے میں چلئے۔" رضوانہ بولی۔

"کیوں نہ لائبریری میں چلیں۔ میں بھی وہ قلمی نسخہ دیکھنا چاہتا ہوں جس کا ذکر ابھی آپ نے کیا تھا۔"

"ضرور ضرور۔"

فریدی اُٹھ گیا۔ پروفیسر جہاں تھا وہیں بیٹھا رہا۔ اُس نے اس پر اعتراض بھی نہیں کیا تھا کہ رضوانہ اُسے لائبریری میں لے جارہی ہے۔

لائبریری بھی کباڑ خانہ ہی ثابت ہوئی۔ الماریوں پر گرد کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ آج پھر پلنگ یہیں چھوڑ گیا۔" رضوانہ پیر پٹخ کر دھاڑی۔ "کتنی بار کہا ہے کہ صبح پلنگ یہاں سے ہٹا دیا کرو۔ آپ دیکھ رہے ہیں بستر تک نہیں لپیٹا۔ میں تنگ آ گئی ہوں اس شخص سے۔ یہ دیکھئے تین تین ایش ٹرے رکھے ہوئے ہیں لیکن سگریٹ کے ٹوٹے فرش ہی پر پھینکتا ہے۔"

فریدی نے سگریٹ کا ایک ٹوٹا اُٹھایا اور اُسے ناک کے قریب لے گیا۔ رضوانہ زور سے ہنس پڑی اور بولی۔ "نہیں وہ چرس نہیں پیتا۔ یہ میرا شوق ہے۔ میں چرس پیتی ہوں۔"

"پروفیسر کے علم میں ہے۔"

"جی ہاں......وہ جانتے ہیں۔"

"ہاں تو یہ نادر کا بستر ہے۔"

"جی ہاں......آپ سگار سلگا لیجئے۔"

"شکریہ......میرا خیال ہے کہ پروفیسر نادر کو پسند نہیں کرتے۔"

"میرے علاوہ شاید ہی کوئی اُسے پسند کرتا ہو۔ بات دراصل یہ ہے کہ میری حد تک وہ بے حد تک سعادت مند ہے۔ جب بھی مجھے غصہ آتا ہے پیٹ کر رکھ دیتی ہوں۔ خاموشی سے

پٹتا رہتا ہے اور پھر آنسو بھری آنکھوں سے دیکھتا ہوا خاموشی سے رخصت ہو جاتا ہے۔"

"شاید مامتا کو ترسا ہوا ہے بیچارہ۔" فریدی نے مغموم لہجے میں کہا۔

"بالکل یہی بات ہے۔ ماں نے دوسری شادی کر لی تھی۔"

"مجھے علم ہے۔" فریدی نے کہا اور تیز نظروں سے لائبریری کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر بولا۔

"ذرا دکھائیے تو......وہ کتاب۔"

رضوانہ ایک الماری کی طرف بڑھی اور اسے کھول کر کتابوں کی قطاروں پر نظر دوڑاتی رہی پھر مایوسانہ انداز میں بولی۔"شاید نادر ہی نے کہیں اور رکھ دی ہے۔ ہم اس کتاب کی بہت حفاظت کرتے ہیں۔ اس میں ایسی بوٹیوں کا ذکر بھی ہے جو مُردوں میں جان ڈال دیتی ہیں۔"

"جب بھی ملے ضرور دکھائیے گا۔ اچھا اب اجازت دیجئے۔"

"پھر کبھی تشریف لائیے گا۔ لیکن ڈیڈی آپ کو ناریل کیوں کہتے ہیں۔"

"خدا ہی جانے آپ کو بھی تو بابونہ کہتے ہیں۔"

"اور خود ملیٹھی کہلاتے ہیں۔" وہ زور سے ہنس پڑی۔

واپسی پر فریدی کو ڈرائینگ روم ہی سے گزرنا پڑا تھا۔ رضوانہ وہیں رہ گئی تھی اور پروفیسر اُس کے ساتھ باہر چلا آیا تھا۔

"مجھے یہ لڑکی سخت ناپسند ہے۔" پروفیسر نے فریدی کی گاڑی کے قریب پہنچ کر کہا۔

"لیکن میں اُسے گولی نہیں مار سکتا۔"

"ارے پروفیسر! ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ آہستہ آہستہ عقل آجائے گی۔ اچھا خدا حافظ۔ جلد ہی پھر ملاقات ہوگی اور ہم جڑی بوٹیوں پر باتیں کریں گے۔"

اُس کی گاڑی پھر شہر کی طرف جارہی تھی۔ شہباز کے آدمی کو ساتھ لے کر زری کوہ کی طرف بھی تو جانا تھا۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ ناکارہ کیا ہوا بم اب بھی پچھلی سیٹ پر پڑا ہوا تھا۔

پھر وہ تینوں اُس بھیڑ میں ضم ہوگئے۔ قریباً ڈھائی درجن ہپی رہے ہوں گے۔ ان میں دیسی بدیسی عورت مرد سبھی شامل تھے اور آغا طاہر نے ان چھ افراد کی نشاندہی بھی کردی تھی جو کچی افیون اور ہیروئن کا تبادلہ کرتے تھے۔

حمید نے قاسم کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ ان لوگوں پر اپنی دولتمندی کا اظہار ہرگز نہ ہونے دے۔

''اپنی کمپنی کے علاوہ اور کسی کے سامنے زبان نہ کھولنا۔'' حمید نے مزید مشورہ دیا۔

''آخر قیوں؟''

''پول کھل جائے گا کہ ہم بنے ہوئے ہیں۔ میری دی ہوئی سگرٹیں پھونکتے رہو، ان کے دھوئیں میں چرس کی بو شامل ہوگی۔ لیکن چرس کے اثرات سے پاک ہیں۔''

''اگر دھواں حلق سے اُتر گیا تو میں کھانستے کھانستے مرجاؤں گا۔''

''کوشش کرو کہ حلق سے نیچے نہ اترنے پائے۔''

''ابے میں تو قہتا ہوں ختم قرو یہ چکر۔ اس سکی پکی کی وجہ سے عورتوں سے جی بھر غیا ہے۔''

''میرا تو نہیں بھرا ہے۔''

''آخر حمید بھائی کب آئیں غے۔''

''یار وہ بات نہ پوچھو جس کا جواب میرے پاس نہ ہو۔''

''اگر تم دونوں آپس میں بھی انگلش میں گفتگو کیا کرو تو کیا حرج ہے۔'' سکی بول پڑی۔

''عادت نہیں ہے کوشش کریں گے۔'' حمید نے کہا اور قاسم سے انگلش میں بولا۔ ''تم دونوں مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔''

''شکریہ۔'' سکی مسکرائی اور پیار بھری نظروں سے قاسم کی طرف دیکھنے لگی۔

''ابے قرا قا خان تم خود ہی اس سے محوبت قیوں نہیں قرلیتے۔'' قاسم نے اردو میں کہا۔

''محبت کی نہیں جاتی ہوجاتی ہے۔ اسے تم سے محبت ہوگئی ہے۔''

''ہوا قرے میرے ٹھینگے سے مجھے تو نہیں ہوئی۔''

''آخر کیا بُرائی ہے بیچاری میں۔ اگر اس نے مجھ سے محبت کی ہوتی تو میں اسے ملکہ ہفت اقلیم بنا دیتا۔''

''قرالو اور بنا دو۔ کسی نے روکا ہے قیا۔''

''محبت زبردستی نہیں کرائی جاتی۔''

''تم لوگ پھر آپس میں اپنی ہی زبان بولنے لگے اور میں بیوقوفوں کی طرح بیٹھی ہوئی ہوں۔'' سکی نے کہا۔ ''اب وہ کتابیں نہیں پڑھتی تھی، چرس کے سگریٹ بھی کم سے کم پیتی تھی۔''

ہپیوں کا قافلہ شام ہوتے ہی ایک جگہ رک گیا تھا اور ان چھ ہپیوں نے جگہ جگہ نائلین کی چھولداریاں نصب کردی تھیں جو اسمگلروں کے کارپرداز تھے۔

ایک چھولداری ان تینوں کے حصے میں بھی آئی تھی۔ لیکن وہ سب ابھی کھلے آسمان ہی کے نیچے بیٹھے ہوئے دھواں اڑا رہے تھے۔ دفعتاً اُن چھ کارپردازوں میں سے ایک ان تینوں کے پاس آ بیٹھا۔ دراصل قاسم کا ڈیل ڈول ہر ایک کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

''تم لوگ کہاں سے آئے ہو۔'' ہپی نے پوچھا۔

''امریکہ سے۔'' حمید نے جواب دیا۔ ''مہا گرو کرن جی کے چیلے ہیں۔''

''تم دونوں تو ادھر ہی کے جان پڑتے ہو۔''

''ہاں ہم دونوں امریکہ میں تعلیم حاصل کررہے تھے کہ ایک دن مہا گرو کرن جی سے ملاقات ہوگئی اور پھر ہماری دنیا ہی بدل گئی۔''

''لڑکی تو بڑی زوردار ہے تمہارے ساتھ۔''

''اُس کی محبوبہ ہے۔'' حمید نے قاسم کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''فاقے کرلیتا ہے لیکن اُسے پڑی سے نہیں اُترنے دیتا۔''

''شکوہ آباد سے واپس آ کر کہاں جاؤ گے۔''

''جہاں لہر لے جائے۔ اب تو ساری دنیا اپنی ہے۔''

''سگریٹ ہو تو نکالو......!''

حمید نے اپنے چہرے پر کرب کے آثار پیدا کرکے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چرس

بھری سگریٹ نکال کر اس کے حوالے کر دی۔

"اپنے ساتھی سے کہو گیٹار پر کچھ سنائے۔" اُس نے سگریٹ سلگا کر دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔

"وہ بہت تھکا ہوا ہے۔" حمید نے کہا۔ "مجھ سے سن لو۔"

حمید نے ہاتھ بڑھا کر گیٹار اٹھایا اور جرک اینڈ شیک بجانے لگا۔ وہ سب چونکے تھے اور اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ کئی لڑکیوں نے اُٹھ کر تھرکنا شروع کر دیا تھا۔

پھر آہستہ آہستہ سبھی اس طرف آ گئے اور ان تینوں کے گرد حلقہ بنا کر تھرکنے لگے۔

ہپی اُٹھ کر کھسک گیا تھا۔ سکی نے قاسم سے کہا۔ "تم بھی اُٹھو۔"

وہ تو پہلے ہی بیٹھے بیٹھے تھرک رہی تھی۔

"ابے یہ تم نے قیا شروع قر دیا۔" قاسم حمید کو آنکھیں دکھا کر بولا۔ "اس طرح تو میرا باپ بھی نہیں ہل سکتا۔"

لیکن حمید اپنی دھن میں مست زخمہ زنی کرتا رہا۔

"اُٹھو نا۔" سکی قاسم کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوئی بولی۔

"ارے باپ رے مر غیا۔" کراہتا ہوا اُٹھا اور بے ہنگم پنے سے ہل ہل کر قرا قاخان کی ایسی کی تیسی کرنے لگا۔

ادھر حمید نے میوزک کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ "قوخان قوخان، قق قوخان......!" الاپنا شروع کر دیا۔

"سالے جیندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

اتنے میں دو لڑکیاں حمید کی طرف جھپٹیں اور ایک نے کہا۔ "گیٹار اسے دو۔ یہ بجائے گی۔ تم میرے ساتھ ناچو۔"

حمید نے بڑی سعادت مندی سے اس کا کہنا مان لیا۔ بس ذرا سی دیر کے لئے میوزک بند ہوا تھا اور سب لڑکھڑانے لگے تھے۔ لڑکی نے پھر گیٹار سنبھال لیا۔ ادھر حمید کی پارٹنر بے حد جوشیلی ثابت ہو رہی تھی۔ بار بار اُس سے ٹکرا جاتی تھی اور زور سے قہقہہ لگاتی۔ خاصی جاندار تھی اور ہنستے وقت گالوں میں گڑھے پڑ جاتے تھے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں

چمک رہی تھیں۔

حمید نے بھی وہ اچھل کود مچائی کہ خود اُسے بھی اپنے اوپر حیرت ہونے لگی۔

"تم بہت پھرتیلے ہو۔" ہم رقص بولی۔

"قرا قاخان نام ہے...... تم کون ہو۔"

"میں میگی ہوں...... میرا پارٹنر بیمار ہو گیا ہے۔ اُس کے لئے کچھ مدد کر دو۔"

"ضرور...... ضرور...... بڑی خوشی سے ابھی کر دوں گا مدد۔"

"وہ مر ہی جائے تو بہتر ہے۔ اب اُس میں کچھ نہیں رہا۔"

"تم تو زندگی سے بھرپور ہو۔" حمید نے کہا۔

"میں زیادہ نہیں پیتی۔ میں تو دنیا دیکھنے نکلی ہوں۔ تمہارا ساتھی دیو معلوم ہوتا ہے...... ارے لو...... وہ تو بیٹھ ہی گیا۔"

"پہاڑ ہے۔ اپنی پارٹنر کے کہنے سے کھڑا ہو گیا تھا۔"

ادھر قاسم دھڑ سے لیٹ بھی گیا۔ ساتھ ہی کہتا جا رہا تھا۔ "الا میاں بکے ماف قردو۔ اب ایسی گلتی نہیں ہوغی...... ارے باپ رے۔ یہ پیٹ میں قیا چیز اینٹھ رہی ہے۔"

"ارے ارے یہ تمہیں کیا ہو گیا۔" سکی اُس پر جھکتی ہوئی بولی۔

"میرے پیٹ میں کچھ ہو گیا ہے۔" قاسم کراہتا ہوا بولا۔ "مجھے ناچنے کودنے کی عادت نہیں ہے۔"

"معافی چاہتی ہوں جان...... مجھے معاف کر دو۔ اس کا دھیان ہی نہیں رہا تھا مجھے۔"

"سالی جان بھی جلائے غی۔" قاسم اردو میں بڑبڑایا۔

"اُٹھو...... اُٹھ جاؤ...... چلو کہیں دور چل کر بیٹھتے ہیں۔"

"پیٹ کے اندر والی چیز سیدھی ہو جائے تو اُٹھو۔"

"کیا ہے پیٹ میں۔"

"بھینس کا بچہ۔" قاسم جھنجھلا کر بولا۔

"میں کہتی ہوں جان مجھے معاف کر دو غصہ نہ کرو۔"

"اچھا اچھا چپ رہو تھوڑی دیر۔"

وہ اس کے پاس ہی بیٹھ کر اُسے پُرتشویش نظروں سے دیکھنے لگی۔ قاسم دل ہی دل میں قراقا خان اور حمید دونوں کو گالیاں دینے لگا۔ پھر اُس کی نظر حمید کی ہم رقص پر پڑی اور وہ بُرا سا منہ بنا کر بڑبڑایا۔ ”خدا قرے وہ تمہیں ہیضہ ہی کرادے۔“

”کیا کہہ رہے ہو۔“ سکی نے پوچھا۔

”کچھ کہہ نہیں رہا، ہائے ہائے کررہا ہوں۔“ قاسم جھلا کر بولا۔

”میری وجہ سے تمہیں بڑی تکلیف پہنچی۔“

دفعتاً گیٹار بند ہو گیا اور حمید کی ہم رقص ہنستی ہوئی بیٹھ گئی اور حمید نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔

”مزہ آ گیا۔ بڑی روکھی پھیکی گزر رہی تھی۔“ میگی نے کہا۔ ”چرس ہماری زندہ دلی بھی پی گئی ہے۔“

”یہ سمجھتی ہو تو ترک ہی کردو نا۔“

”میں صرف دنیا دیکھنے نکلی تھی۔ اُس کی صحبت میں پینے لگی۔ اُس کے پھیپھڑے تو جواب دے چکے ہیں۔ ہر وقت کھانستا رہتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ کچھ مدد کردو۔“

حمید نے دس دس کے پانچ نوٹ نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

”زندہ دل ہی نہیں فیاض بھی ہو۔ اندھیرا پھیلنے دو۔ میں آ جاؤں گی۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔ میں صرف زندہ دل ہوں اور فیاضی کا معاوضہ کبھی طلب نہیں کیا۔“

”نروان کی تلاش میں ہو۔“

”نہیں......نروان خود مجھے کہیں تلاش کرتا پھر رہا ہوگا۔ اب جاؤ اور اپنے پارٹنر کی دیکھ بھال کرو۔“

وہ مزید شکریہ ادا کرکے اُس کے پاس سے ہٹ گئی۔ حمید قاسم کے پاس آیا۔ وہ اب بھی اُسی طرح لیٹا کراہے جارہا تھا۔

”ارے......ارے......یہ کیا ہو رہا ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”اسے نفرت قرار رہا ہوں اپنے سے۔“

”اسے پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔“ سکی بولی۔ ”کہتا ہے پیٹ میں کوئی چیز اینٹھ رہی ہے۔“

”زندہ چھپکلیاں کھا گیا ہوگا۔“

”اُو......!“ قاسم نے زوردار اوبکائی لی اور اُٹھ بیٹھا۔ سکی اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔

”میں کسی کو قے کرتے نہیں دیکھ سکتی۔ تم اسے سنبھالو۔“ سکی نے کہا اور دوڑتی ہوئی اپنی چھولداری کی طرف چلی گئی۔

قاسم سچ مچ قے کرنے لگا تھا۔ دور دور تک اُس کے ڈکرانے کی آوازیں گونج رہی تھیں اور وہ سب وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے اور حمید قاسم کے پیچھے بیٹھا اُس کی گدی سہلا رہا تھا۔

”اغے......اُوغ......خدا تمہیں غارت کرے۔“

”میں نے کیا کیا ہے۔“

”چپ راؤ......سالے۔“

”بڑی مشکل سے قاسم نے اپنی طبیعت پر قابو پایا تھا۔ حمید اُسے سہارا دے کر چھولداری تک لایا اور ایک کنارے لٹا دیا۔“

”اب کیا ہوگا۔“ سکی گھبرائے ہوئے انداز میں بولی۔

”کچھ بھی نہیں۔ مرا تو نہیں جارہا۔“ حمید نے کہا۔

”ابے مروتم۔“ قاسم ہاتھ ہلا کر بولا۔ ”سالے گیٹار بجارہے تھے۔“

اور حمید کو گیٹار کا خیال آ گیا۔ کہاں گیا گیٹار......اوہ کہیں وہ لڑکی تو نہیں پار کر لے گئی۔ چھولداری سے نکل کر دوسری چھولداریوں کی طرف چل پڑا۔ گیٹار وصول ہی کرنا تھا۔ اول درجے کے چور ہوتے تھے۔ اگر کوئی چیز ان کے قبضے میں چلی جائے تو پھر اُس کی واگزاری کارے دارد۔

بہرحال حمید گیٹار سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتا تھا۔ فی الحال وہی تو ایک دل بہلانے والی چیز تھی۔ میگی سے پہلے ملاقات ہوئی اور حمید نے اُس سے گیٹار کے بارے میں استفسار کیا۔

”اوہ شاید ہلدا لے گئی۔ وہی جو بجا رہی تھی۔ تمہیں فوراً ہی اُس سے لے لینا چاہئے تھا۔“ میگی نے کہا۔ ”اس نے اپنا گیٹار فروخت کردیا تھا۔ شاید ہی واپس کرے۔ اس کا ساتھی خطرناک آدمی ہے۔“

”تم اس کی فکر نہ کرو کہ وہ کتنا خطرناک ہے۔ بس تم مجھے ان لوگوں تک پہنچا دو۔“

"ویسے ہوسکتا ہے کہ اُس کا ساتھی کسی معقول رقم کے عوض تمہارا گیٹار واپس کرادے۔"

"دیکھا جائے گا۔ تم آگے تو بڑھو۔"

وہ اُسے اُس جگہ لے آئی جہاں کئی ہپی آگ روشن کیئے ہوئے اُس کے گرد بیٹھے تھے۔ اُن میں دو ہپی کارپردازوں میں سے بھی تھے۔ ہلدا گیٹار کو گود میں رکھے اس طرح سہلا رہی تھی جیسے کسی شیرخوار بچے کو سہلانے کی کوشش کر رہی ہو۔ حمید اُس کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہوگیا۔

"کیا ہے......؟" اس نے تنک کر پوچھا۔

"میرا گیٹار واپس کرو۔"

"یہ تو اب میرا ہے۔" وہ ہنس پڑی۔

"بھلا وہ کس طرح۔"

"اس طرح کہ میرے قبضے میں......!"

"واپس نہیں ملے گا...... جاؤ۔" ایک سفید فام ہپی ہاتھ ہلا کر بولا۔

کارپرداز ہپیوں میں سے ایک بولا۔ "جاؤ یار...... بات نہ بڑھاؤ۔"

"اس میں بات بڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اپنا گیٹار واپس مانگ رہا ہوں۔"

"دیا کیوں تھا؟"

"اس کی ساتھی لڑکی نے میرے ساتھ ناچنے کی فرمائش کی تھی اور گیٹار یہ مجھ سے لے کر بجانے لگی تھی۔"

"تمہیں نہیں دینا چاہئے تھا۔"

"میں وصول کرلوں گا۔ روہیلہ پٹھان ہوں۔"

"جھگڑا کرو گے۔"

"یقیناً...... اور مجھے اُمید ہے کہ تم دونوں ان کا ساتھ نہیں دو گے کیونکہ تم بھی پٹھان معلوم ہوتے ہو۔"

اُس نے اپنے ساتھی کو اُٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔ ہلدا کا ساتھی حقارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ حمید کو دیکھے جا رہا تھا۔

"میں آخری بار کہہ رہا ہوں کہ گیٹار واپس کردو۔"

"ہمت ہو تو لے لو۔" ہلدا کا ساتھی اُٹھتا ہوا بولا۔ حمید اس طرح جھکا جیسے ہلدا سے گیٹار چھین لے گا دوسرے ہی لمحے میں غیرملکی ہپی نے اُس پر چھلانگ لگائی۔ لیکن حمید گیٹار کے لئے تو نہیں جھکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دوسرے لمحے میں کیا ہونے والا ہے۔ لہٰذا بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ کر ہپی کی پیشانی پر زوردار ٹھوکر رسید کی۔ وہ تیورا کر ڈھیر ہوگیا۔ دوسرے ہپی بھی اُٹھ کھڑے ہوئے لیکن الاؤ کی روشنی میں انہوں نے ایک لمبے پھل والے چاقو کی چمک دیکھی۔

حمید چاقو لہرا کر بولا۔ "اسے تو ایک گھنٹے سے پہلے ہوش نہیں آئے گا۔ اگر تم میں سے کوئی موت کا مزا چکھنا چاہتا ہو تو آگے بڑھے۔ لیکن وہ جہاں تھے وہیں کھڑے رہے۔"

ہلدا چیخ چیخ کر حمید کو گالیاں دے رہی تھی۔ پھر اُس نے گیٹار اُس پر کھینچ مارا۔ حمید غافل نہیں تھا۔ اس نے نہایت آسانی سے اُسے بائیں ہاتھ سے روک کر پکڑ لیا۔ پھر اُس نے بڑی خوشدلی سے "شب بخیر" کہا اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔ میگی اور دونوں کارپرداز ہپی جو دور کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے جھپٹ کر حمید کی طرف آئے۔

"یار واقعی بات کے پکے ہو......!" ان میں سے ایک بولا۔

"اگر غصہ نہ آجائے تو بے حد شریف اور امن پسند آدمی ہوں۔"

"چلو...... چلو...... یہاں سے چلو۔" میگی اُس کا بازو پکڑ کر بولی۔

حمید اُس کے ساتھ چل پڑا۔

"بہت اچھا ہوا۔ اُس کا غرور توڑ دیا تم نے۔" میگی نے کہا۔ "ہر ایک سے چھین جھپٹ کرتا رہتا تھا۔ میرے پارٹنر کو ایک بار مارا بھی تھا۔"

حمید کچھ نہ بولا۔ وہ کہتی رہی۔ "میں تو ڈر رہی تھی کہ کہیں پٹ نہ جاؤ۔ شکاگو میں اس نے تین قتل کیئے تھے۔ فخریہ بتایا کرتا ہے۔"

"میں ہر وقت مرنے کے لئے تیار رہتا ہوں اس لئے کم ہی مار کھاتا ہوں۔"

"آؤ کچھ دیر ادھر بیٹھیں۔" وہ ایک ویران جگہ پر رکتی ہوئی بولی۔

"ضرور ضرور۔" حمید نے کہا۔ اُس کے داہنے ہاتھ میں اب بھی کھلا ہوا چاقو تھا اور

بائیں میں گیبار۔

وہ وہیں بیٹھ گئے اور حمید نے چاقو بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔

''تمہارا اسٹائل بہت شاندار تھا۔'' میگی بولی۔

''اسٹائیل دکھانے کا موقع ہی کہاں ملا۔ وہ بیہوش ہو گیا تھا اور دوسرے اپنی جگہ سے ملے بھی نہیں تھے۔''

''تم پہلی بار ہمارے شریک ہوئے ہو۔''

''تو کیا تم بہت دنوں سے اُدھر کے ٹرپ کر رہی ہو۔''

''ہاں...... چھ ماہ ہو گئے۔ ہر پندرھویں دن اُدھر جاتے ہیں۔''

''پکڑ دھکڑ نہیں ہوتی۔''

''نہیں......بس پھر ادھر ہی دھکیل دیئے جاتے ہیں۔''

''ہم تینوں کے علاوہ تم میں اور کوئی نیا آدمی نہیں ہے۔''

''ہیں کیوں نہیں۔ تمہارے علاوہ بھی پانچ آدمی اور ہیں۔''

''کیا اُدھر بہت سستی چرس ملتی ہے۔''

''ہمیں تو مفت ملتی ہے اور پیسے بھی ملتے ہیں۔''

''کون دیتا ہے۔''

''وہ چھ آدمی ہیں۔ ان میں سے جو ہٹ گئے تھے اُن ہی چھ میں شامل ہیں۔ وہ ہمیں اُدھر لے جاتے ہیں۔ چرس بھی دیتے ہیں اور پیسے بھی دیتے ہیں۔''

''بڑی عجیب بات ہے۔ انہوں نے ہم سے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔''

''ہر ایک سے نہیں کرتے۔ دوسرے اپنے پیسوں ہی سے خریدتے ہیں۔ مثلاً نئے آدمی جیسے تم تینوں ہو اور وہ پانچ آدمی یہ اپنے پیسوں ہی سے خریدیں گے۔''

''لیکن وہ چھ آدمی ایسا کیوں کرتے ہیں۔ انہیں اس سے کیا فائدہ پہنچتا ہے۔''

''ہمیں اس سے کیا سروکار۔ ہم اس کے بارے میں سوچتے ہی نہیں۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ پہلے ہم بھی خود ہی خریدنے کے قابل تھے۔ لیکن جب مفلس ہو گئے تو انہوں نے سہارا دیا۔''

''اُوہ...... مجھے بھی اس سے کیا سروکار...... مجھے تو سستی چرس چاہئے۔''

''جب مفلس ہو جانا تو انہیں بتا دینا وہ تم پر بھی عنایت کریں گے۔''

''حمید کچھ نہ بولا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ مزید معلومات کس طرح حاصل کرے۔ اس قسم کے سوالات نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے مقصد کا اظہار ہو جائے۔ وہ بڑی معصومیت سے بات کر رہی تھی۔ لیکن کیا اُسے مقصد کا علم نہ رہا ہوگا۔''

تھوڑی دیر بعد اُس نے کھنکار کر کہا۔ ''ہم اتنی خریدیں گے کہ ہمارا کم از کم ایک ماہ بخوبی گزر جائے کیونکہ ہم آگے بڑھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہمارے ساتھ جو لڑکی ہے دراصل اسکالر ہے اور آثار قدیمہ اس کا موضوع ہے اور میں ہپی ازم پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔ شائد دوسری بار تم ہم لوگوں کو اپنے قافلے میں نہ دیکھو۔''

''کتابیں لکھنے والے چاقو باز نہیں ہوتے۔ تم پتا نہیں کیا چیز ہو۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''فوج سے نکالا ہوا ہوں۔ مزید تعلیم حاصل کرنے امریکا چلا گیا تھا وہاں مہا گرو کرن جی سے ملاقات ہوگئی اور اس حال کو پہنچ گیا۔''

''مگر تم تنہا ہو۔''

''نہیں تو......وہ دونوں بھی ہیں۔''

''تمہاری کوئی پارٹنر نہیں ہے۔''

''جب پیدا ہوگی تو سیدھی میرے پاس چلی آئے گی۔''

''تم ہپی نہیں معلوم ہوتے۔''

''میں نے حصول علم کیلئے یہ دھج اختیار کی ہے۔ زندگی کی دشواریوں سے نہیں بھاگا ہوں۔''

''ایسے ہی لگتے ہو۔ اگر میرا پارٹنر بیمار نہ ہوتا تو میں تمہارے لئے اُسے چھوڑ دیتی۔ ایسے حالات میں اُس کا دل نہیں دکھانا چاہتی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ جلد ہی مر جائے گا۔''

حمید خاموش ہی رہا۔

''لیکن وہ لڑکی تو بہت بور معلوم ہوتی ہے۔'' میگی نے کچھ دیر بعد کہا۔

''میں نے تمہیں بتایا نا کہ لکھنے پڑھنے والی لڑکی ہے۔''

''بہر حال ہوشیاری سے سونا۔ وہ سب تم لوگوں کو بہت مالدار سمجھتے ہیں اور تم ایک کو زخمی

بھی کر چکے ہو۔"

مشورے کا شکریہ۔ میں خیال رکھوں گا۔ اچھا اب چلوں۔ میرے ساتھی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

"میں اُس رقم کا معاوضہ ادا کرنے کو تیار ہوں۔"

"میں نے اس نیت سے نہیں دی تھی...... جاؤ آرام کرو۔"

حمید اُٹھ کر آگے بڑھ گیا۔ میگی وہیں بیٹھی رہ گئی تھی۔

زری کوہ کی شکار گاہ شکوہ آباد سے سترہ اٹھارہ میل رہی ہوگی۔ کسی قدر اونچائی پر بھی واقع تھی اس لئے راستہ چکر دار تھا۔ فریدی خود ہی لینڈ رور ڈرائیو کر رہا تھا۔ سڑک سنسان نہیں تھی۔ اُس کے پیچھے خاصا ٹریفک تھا جس میں لوڈنگ ٹرکس کی تعداد زیادہ تھی۔

شہباز کا بھیجا ہوا آدمی انسپکٹر یوسف زئی فریدی کے قریب ہی اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

"شکار میں وہ تنہا تو نہ ہوگا۔" فریدی نے کہا۔

"زری کوہ کے خان عبدالرحمٰن کا لڑکا سلیم اُس کے دوستوں میں سے ہے جناب۔ وہی اُسے شکار کھلا رہا ہوگا۔"

"اب دیکھنا یہ ہوگا کہ وہ کتنے دنوں سے ان لوگوں کے ساتھ مقیم ہے۔"

"اُس نے معاملہ پکا کر لیا ہوگا جناب۔ بیوقوف آدمی نہیں ہے اور خان عبدالرحمٰن تو حکومت اور تخت کے بڑے مخالفوں میں سے ہے۔"

"خان شہباز نے اُس کے لئے کچھ نہیں کہا۔"

"کارروائی اُنہی کے خلاف ہوسکتی ہے جناب جو کھل کر سامنے آجائیں۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔"

"اب بائیں طرف موڑ لیجئے جناب۔ ادھر ہی سے ہم خان عبدالرحمٰن کی حویلی تک پہنچ سکیں گے۔" انسپکٹر یوسف زئی نے کہا۔ فریدی نے اس کے مشورے پر عمل کیا۔ اس سڑک پر بھی اکا دُکا گاڑیاں دکھائی دیتی تھیں۔

"شیر افگن کا رجحان کس سیاسی پارٹی کی طرف تھا۔" فریدی نے انسپکٹر یوسف زئی سے سوال کیا۔

"مجھے علم نہیں جناب...... ویسے اسکا شمار یہاں کی قابل ذکر شخصیتوں میں کبھی نہیں رہا۔"

"خان شہباز سے اُس کے تعلقات کیسے تھے۔"

"انہیں اُس سے کسی قسم کے بھی تعلقات رکھنے کی کیا ضرورت ہوسکتی تھی جناب؟"

"میں نے یونہی سوال کیا تھا۔"

"میں نے کبھی اُسے ایس پی صاحب کے ساتھ نہیں دیکھا۔"

"لیکن شاید شکوہ آباد سے روانگی سے قبل وہ اُن سے ملا تھا۔"

"مجھے اس کا علم نہیں جناب۔"

دفعتاً بائیں جانب سے ایک فائر ہوا اور لینڈ رور اچھل کر رہ گئی۔ شائد اس کا کوئی ٹائر نشانہ بنایا گیا تھا۔

اگر فریدی جیسا جاگتے ذہن کا آدمی ڈرائیو نہ کر رہا ہوتا تو گاڑی یقیناً اُلٹ گئی ہوتی۔ فریدی نے بڑی پھرتی سے دوسری طرف کا دروازہ کھولا اور انسپکٹر یوسف زئی کو باہر دھکیلتا ہوا خود بھی نیچے کود گیا۔

ایک فائر پھر ہوا اور گولی اُس کے اوپر سے گزر گئی۔

"دد...... دیکھا آپ نے۔" یوسف زئی ہانپتا ہوا بولا۔

"ادھر اُس چٹان کے پیچھے جلدی کرو۔"

فائر پھر ہوا۔ فریدی نے بھی بغلی ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا تھا لیکن ابھی تک فائر نہیں کیا تھا۔ جلد سے جلد ایسی جگہ پہنچنا چاہتا تھا جہاں سے سچویشن کو ہینڈل کر سکتا۔

یوسف زئی نے بتائی ہوئی جگہ پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی اور اس نے بھی ریوالور نکال لیا تھا۔

فریدی بھی اُس کے قریب پہنچ گیا۔ اچانک اس جگہ سے ہٹ کر تیسرا فائر ہوا۔ فائر کرنے والا اُن سے زیادہ اونچائی پر تھا۔ اس بار انسپکٹر یوسف زئی بال بال بچا۔

سڑک پر کسی گاڑی کی آواز سنائی دی اور بیک وقت کئی فائر ہوئے جن کا جواب اس

جگہ سے دیا گیا جہاں سے ان دونوں پر تیسرا فائر ہوا تھا۔ اس بار فریدی کے ریوالور سے بھی شعلہ نکلا۔

کئی دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ اُدھر سے پھر فائر ہوا ہی تھا کہ فریدی کا ریوالور بھی اُسی سمت چل گیا اور پھر ایک طویل کراہ سنائی دی۔ پھر سناٹا چھا گیا۔

دفعتاً سڑک کی جانب سے آواز آئی۔ ''آپ نے اُسے مار لیا ہے جناب۔''

یوسف زئی حیرت سے فریدی کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا تم مجھے اتنا ہی احمق سمجھتے تھے۔'' فریدی مسکرا کر بولا۔

''میں نہیں سمجھا جناب۔''

''آؤ......فریدی سڑک کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ لینڈ روور کے قریب ایک لوڈنگ ٹرک کھڑا دکھائی دیا اور ایک آدمی دوسری طرف والی چٹان پر چڑھتا دکھائی دیا۔ دو مسلح آدمی اور بھی تھے جو لوڈنگ ٹرک کے قریب کھڑے ہوئے تھے۔

کچھ گاڑیاں اور رکی تھیں لیکن ٹرک کے قریب کھڑے ہوئے آدمیوں میں سے ایک نے ہاتھ ہلا کر سخت لہجے میں کہا۔ ''چلتے رہو...... پولیس! یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

گاڑیاں اپنی اپنی سمتوں میں بڑھ گئیں۔ فریدی نے یوسف زئی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اُسی چٹان پر چڑھنے لگا۔ چٹان کی دوسری طرف ایک آدمی چاروں خانے چت پڑا ہوا نظر آیا جس کی بائیں کنپٹی سے خون بہہ بہہ کر آس پاس پھیل رہا تھا۔

یوسف زئی حیرت سے آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر تھوک نگل کر رہ گیا۔

''شاید تم اُسے پہچانتے ہو۔'' فریدی نے یوسف زئی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔

''جج...... جی...... میں نہیں سمجھا۔'' یوسف زئی بہت زیادہ بدحواس نظر آ رہا تھا۔ دوسرا آدمی خاموش کھڑا تھا۔

''تم نیچے جاؤ۔'' فریدی نے اُس سے کہا اور اُس نے خاموشی سے تعمیل کی۔

''اُن گولیوں میں سے کوئی تمہیں بھی چاٹ سکتی تھی۔''

''جج...... جی ہاں...... بال بال بچا ہوں۔ وہ تیسرا فائر...... میرے قریب ہی سے چٹان کا ٹکڑا اڑا تھا۔''

''اور اب تمہاری زندگی اور زیادہ خطرے میں ہے کیونکہ تم عینی شاہد بن چکے ہو۔''

یوسف زئی تھوک نگل کر رہ گیا۔

''کیا تم اسے پہچانتے ہو۔''

''مم......میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

''کیا سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''یہ ایس پی صاحب کا بہت ہی خاص آدمی تھا۔''

''فورس کا کوئی آدمی۔''

''جی نہیں......لیکن ایس پی صاحب اس سے بہت ہی خاص قسم کے کام لیتے تھے۔ تم اسے پہچانتے ہو لہٰذا اب تمہاری زندگی بھی خطرے میں ہے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں کرنل صاحب......لیکن اب ہوگا کیا۔''

''تم نے اسے نہیں دیکھا تھا۔'' فریدی مسکرا کر بولا۔ ''کسی نامعلوم آدمی نے فائرنگ کی تھی اور فرار ہو گیا تھا۔''

''جی میں سمجھ گیا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ کرنل صاحب۔''

فریدی چٹان کے سرے کی طرف بڑھ کر اونچی آواز میں بولا۔ ''تم میری گاڑی کا وہیل تبدیل کرو اور تم دونوں اوپر آؤ۔''

وہ پھر لاش کے قریب آ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''فی الحال شہباز میرا مسئلہ نہیں ہے اس لئے ابھی اس معاملے کو نہیں اُٹھاؤں گا۔''

''میں سمجھا جناب۔'' یوسف زئی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ ابھی تک خود پر قابو نہیں پا سکا تھا۔

''میں یہاں شیر افگن کے قاتل کی تلاش میں آیا ہوں۔ لہٰذا بظاہر میری مصروفیت اسی حد تک رہے گی......فریدی نے کہا اور لاش کی طرف ہاتھ اُٹھا کر ''اس کا مطلب تو تمہاری سمجھ میں آ ہی گیا ہوگا۔''

''میرے حواس بجا نہیں ہیں جناب۔''

''خیر میں سمجھا دوں گا۔'' فریدی نے کہا اور اُن دونوں کی طرف متوجہ ہو گیا جنہیں

طلب کیا تھا۔

''اس لاش کو یہیں کہیں ایسی جگہ چھپا دو کہ تلاش کرنے پر مل سکے۔ جہاں چھپاؤ وہاں سے یہاں تک اسی کے خون کے دھبے اس طرح ڈالتے جانا جس سے معلوم ہو کہ یہ خود گھسٹتا ہوا وہاں تک پہنچا ہو اور ختم ہو گیا ہو۔''

''بہت بہتر جناب۔''

''آؤ چلیں۔'' فریدی اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ سڑک پر تیسرا آدمی اسپئیر وہیل کے بولٹ کس رہا تھا۔

''اب کہاں چلیں گے جناب۔''

''خان عبدالرحمٰن کی حویلی۔''

بولٹ کس کر اُس نے وہیل کیپ چڑھا دیا اور فریدی نے اُس سے کہا۔ ''تم یہیں ٹھہرنا، اُدھر وہ دونوں کام کر رہے ہیں۔ اُس کے بعد تم وہیں پہنچ کر ٹھہرنا جہاں ٹھہرنا تھا۔''

پھر فریدی نے یوسف زئی کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد لینڈ روور پھر حرکت میں آ گئی اور فریدی نے کہا۔

''اس کا یہ مطلب ہوا کہ داور شیر افگن کا قاتل نہیں ہے۔ اصل قاتل سے شہباز واقف ہے اور اس کا جرم داور کے سر تھوپنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر ہم دونوں مار ڈالے جاتے تب بھی یہی کہا جاتا کہ داور نے ہمیں اپنے راستے سے ہٹا دیا اور اگر یہ مرنے والا ہمیں ختم کئے بغیر فرار ہو جاتا ہے تو ہم بھی یہی سوچتے کہ داور ہی رہا ہوگا۔''

''جی ہاں...... بالکل یہی سوچتے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن جناب داور کی انگلیوں کے نشانات ہوٹل کے اس کمرے میں ملے تھے جہاں قتل ہوا تھا۔''

''اصل معمہ یہی ہے۔ اس کے حل ہوتے ہی قاتل میری گرفت میں ہوگا۔ خاصی پلاننگ کی گئی ہے اس قتل کے سلسلے میں۔''

''بہر حال آج معلوم ہوا کہ شہباز کسی کا بھی نہیں ہے، جناب میں بال بال بچا ہوں۔ یقین نہیں آتا کہ زندہ ہوں۔''

''اس حملے سے ایک بات اور قبل از وقت واضح ہو گئی۔''

''وہ کیا جناب۔''

''داور یہاں موجود نہیں ہے۔''

''جی ہاں، قطعی ورنہ اس ڈرامے کی ضرورت ہی نہ تھی۔''

کچھ دیر خاموشی رہی پھر یوسف زئی نے کہا۔ ''ہم سب بے بس ہیں اُس کے ہاتھوں۔ سیاسی وجوہ کی بناء پر اُسے جو چھوٹ ملی ہوئی ہے اُس سے بے تحاشا فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ کلیجہ خون ہو جاتا ہے جب ہمیں اپنے ہی بھائیوں، دوستوں، حتیٰ کہ محسنوں تک کے خلاف کارروائی کرنی پڑتی ہے۔ اس کے خلاف کہیں کوئی شنوائی نہیں ہے۔''

اس معاملے کو بھی دیکھا جائے گا۔ اوپر والے اصل حالات سے آگاہ نہیں ہیں۔''

''آخر یہ سب کچھ کب تک ہوتا رہے گا۔''

''جب تک اس نظام کی بنیادی خامیاں دور نہ کر دی جائیں گی۔ ان کی طرف سے کوئی بھی دھیان نہیں دیتا۔ بس جمہوریت کے ڈھول پیٹے جاتے ہیں۔ شاید کوئی بھی نہیں جانتا کہ جمہوریت کس چڑیا کا نام ہے یا پھر اس کی طرف سے مصلحتاً آنکھیں ہی بند کر لی گئی ہیں۔ بنیادی چیز آدمی کو اپنے مقام کا عرفان ہے جب تک آدمی اپنا مقام نہیں پہچانے گا کسی نظام کو ڈھنگ سے نہیں چلا سکے گا۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا اب اُس کا سامنا کس طرح کروں گا۔ کیا اُس ردعمل پر قابو پاسکوں گا جو اس کا سامنا ہوتے ہی ہوگا۔''

''بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے انسپکٹر'' فریدی طویل سانس لے کر بولا۔ ''بس اسے ذہن میں رکھو کہ ہم نے مفرور کا تعاقب نہیں کیا تھا۔ فائرنگ بند ہوتے ہی حویلی کی طرف بھاگ لئے تھے۔''

''بہت بہتر جناب...... میں کوشش کروں گا کہ اپنے رویئے کو نیچرل رکھ سکوں۔''

''نہ رکھ سکے تو کم از کم یہ رنگ تو دے ہی سکو گے کہ اس واقعے نے تمہیں ہلا کر رکھ دیا ہے اور تمہارے اعصاب قابو میں نہیں ہیں۔''

''یہ تو بہت آسانی سے ہو جائے گا جناب۔''

''بس تو پھر یہی رویہ اختیار کرنا۔''

’’آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے جناب۔‘‘

’’نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ بس اب اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔ شیر افگن کے قاتل پر ہاتھ پڑتے ہی شہباز کا بھی تختہ الٹ جائے گا۔‘‘

حویلی کے قریب پہنچ کر فریدی نے گاڑی روک دی اور اپنا کارڈ اندر بھجوایا۔ خان عبدالرحمٰن اُسے ریسیو کرنے خود ہی حویلی کے باہر آ گیا تھا۔ انہیں اندر لے گیا۔ فریدی نے اپنی آمد کی غرض وغایت سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’داور پر ایک قتل کا شبہ کیا جا رہا ہے۔‘‘

’’کس کے قتل کا شبہ کیا جا رہا ہے۔‘‘ خان عبدالرحمٰن نے پوچھا۔

’’شکوہ آباد کے شیر افگن کے قتل کا۔‘‘

’’اوہ...... میں نے اخبارات میں اُس کے بارے میں پڑھا تھا لیکن داور پر کیوں شبہ کیا جا رہا ہے۔ وہ کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔ جی ہاں...... وہ یہاں آیا تھا لیکن اس قتل سے پہلے کی بات ہے۔ میرے بیٹے کا دوست ہے۔ دو دن قیام کر کے چلا گیا تھا۔‘‘

’’کہاں چلا گیا تھا؟‘‘

’’مجھے تو علم نہیں۔ شاید سلیم جانتا ہو۔ ٹھہریئے میں اُسے بلواتا ہوں۔‘‘

’’میں بالکل تنہائی میں اُن سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’تو چلئے میرے ساتھ۔ وہ اپنے کمرے میں ہوگا۔‘‘

فریدی نے یوسف زئی کو وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور خان عبدالرحمٰن کیساتھ ہولیا۔

سلیم اپنے کمرے ہی میں موجود تھا۔

’’یہ کرنل فریدی ہیں۔‘‘ عبدالرحمٰن نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ’’تم سے تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔‘‘

’’ضرور ضرور جناب تشریف رکھئے...... یقین نہیں آتا کہ آپ یہاں تشریف لائے ہیں۔‘‘

’’آپ کے کیسوں کا ذکر بڑے پیار سے کرتا ہے۔‘‘ خان عبدالرحمٰن نے کہا اور انہیں وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔

’’مجھے داور سے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنی ہیں۔‘‘ فریدی نے کہا۔

’’داور کے متعلق؟‘‘ سلیم نے چونک کر پوچھا۔

’’ہاں۔ وہ آپ کے دوستوں میں سے ہے۔‘‘

’’جی ہاں۔‘‘

’’وہ یہاں سے کہاں گیا تھا۔‘‘

’’یہ تو نہیں بتایا تھا۔‘‘

’’دوران قیام میں کس قسم کی گفتگو کرتا رہا تھا۔‘‘

’’آپ یقین نہ کریں گے لیکن زیادہ تر آپ ہی سے متعلق گفتگو ہوتی تھی۔‘‘

’’مجھ سے متعلق۔‘‘

’’جی ہاں...... اُس کا خیال تھا کہ شکوہ آباد کو آپ کے علاوہ اور کوئی شہباز سے نجات نہیں دلا سکتا۔‘‘

’’بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔‘‘

کیا آپ کو علم نہیں ہے کہ شہباز ہم پر کیسے مظالم ڈھا رہا ہے۔‘‘

’’ہے تو......!‘‘

’’بس داور کا کہنا تھا کہ شہباز کی ایک رگ میرے ہاتھ آ گئی ہے اور میں اُسے کرنل فریدی تک ضرور پہنچاؤں گا۔‘‘

’’ذرا تفصیل سے بتایئے۔‘‘

’’تفصیل تو اُس نے خود مجھے بھی نہیں بتائی تھی۔‘‘

’’اور کیا کہتا تھا۔‘‘

’’بس یہی کہ میری اسکیم مکمل ہوگئی ہے جلد ہی دارالحکومت کی طرف قدم اُٹھ جائے گا۔‘‘

’’لیکن آپ جانتے ہیں کہ کیا ہرا ہے!‘‘ فریدی نے پرتشویش لہجے میں کہا۔

’’جی نہیں۔ اُس کے بعد کی مجھے خبر نہیں۔‘‘

’’وہ شیر افگن کے قتل میں ملوث ہوگیا ہے۔‘‘

’’نہیں......!‘‘ سلیم اچھل پڑا۔

’’جی ہاں...... ہوٹل کے اس کمرے میں جہاں شیر افگن کا قتل ہوا تھا داور کی انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔‘‘

"میں تصور بھی نہیں کرسکتا۔ نہیں جناب ہرگز نہیں۔ شیر افگن صاحب کا نام تو وہ بڑے احترام سے لیتا تھا۔ انہیں اپنا اُستاد کہتا تھا۔ کہتا تھا کہ مجھے شیر افگن ہی نے آدمی بنایا ہے۔"

"غالباً آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ قاتل فرار کس طرح ہوا تھا۔"

"میرے خدا..... پیرا شوٹ..... نہیں نہیں..... ایسا نہیں ہوسکتا۔"

"فی الحال تو یہی ہوا ہے۔ شہباز کو بھی داور ہی کی تلاش ہے۔"

"یقین کیجئے داور کے خلاف کیس بنایا جارہا ہے۔ کاش مجھے علم ہوتا کہ شہباز کی کون سی رگ اُس کے ہاتھ آگئی تھی۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ اُس پر قتل کا الزام آنے والا ہے تو کسی نہ کسی طرح اُسے سب کچھ اُگل دینے پر مجبور کردیتا۔ اُوہ..... دیکھئے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ داور اور شیر افگن ایک ساتھ ہی دارالحکومت گئے ہوں۔"

"وہ تو ثبوت موجود ہے کہ دونوں کسی نہ کسی وقت وہاں یکجا ضرور ہوئے تھے۔"

"آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔" سلیم بولا۔ "میں یہ کہہ رہا تھا شیر افگن اسے ساتھ ہی لے گیا ہو۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے سلیم صاحب! مقتول کے کمرے میں بہرحال اُس کی انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔"

"آپ پھر نہیں سمجھے..... کیا یہ ممکن نہیں کہ دونوں متحد ہوکر ایک ہی مقصد کے حصول کے لئے دارالحکومت گئے ہوں اور وہاں کسی اور نے شیر افگن کو قتل کردیا ہو۔"

"لیکن داور کہاں غائب ہوگیا۔"

"شہباز احمق تو نہیں ہے۔ اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہے۔ ہوسکتا ہے اُسے علم ہوگیا ہو کہ داور اُس کے کسی راز سے واقف ہوگیا ہے جسے وہ اس کے خلاف ثبوت کے طور پر استعمال کرسکے۔ میں دراصل یہ کہنا چاہتا تھا کہ جو بات داور نے مجھے نہیں بتائی تھی اسے شیر افگن سے بھی پوشیدہ رکھا ہو۔ اُن دونوں کے ایسے ہی تعلقات تھے۔ بچپن ہی سے وہ شیر افگن سے بہت مانوس تھا اور اُسے اپنا آئیڈیل بھی کہتا تھا۔"

"بات پھر بھی نہیں بنتی سلیم بھائی۔"

دفعتاً سلیم بوکھلا کر کھڑا ہوگیا اور مضطربانہ انداز میں بولا۔ "کہیں داور بھی ٹھکانے نہ لگا

دیا گیا ہو۔ اگر وہ دونوں ساتھ گئے تھے تو شیر افگن کے کمرے میں اس کی انگلیوں کے نشانات کا پایا جانا بعید از قیاس نہیں ہوسکتا۔"

"لیکن شیر افگن اس کمرے میں تنہا مقیم تھا۔" فریدی نے کہا۔

"کسی احتیاط کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ دونوں ایک دوسرے سے دور دور بھی رہ سکتے تھے لیکن اُن کی ساری احتیاطی تدبیریں اس فرد کی وجہ سے بیکار ہوگئی ہوں جس کی نظر پہلے ہی سے اُن پر رہی تھی۔"

"آپ کا یہ مفروضہ خاصا جاندار ہے اور اس انکشاف کے بعد سے کہ وہ شہباز کے خلاف کوئی ثبوت مجھ تک پہنچانا چاہتا تھا اس کیس نے کم از کم میرے ذہن میں ایک نیا رخ اختیار کرلیا ہے۔"

"جلد کچھ کیجئے کرنل صاحب۔" سلیم مضطربانہ انداز میں بولا۔ "خدا کرے داور زندہ ہو۔ وہ بھی مار ڈالا گیا ہے تو اُس کی بے گناہی کا ثبوت کون دے سکے گا۔ مفرور قاتل کی حیثیت سے پولیس کے ریکارڈ میں دفن ہوجائے گا۔"

"آپ بہت ذہین ہیں۔"

"لیکن کیا فائدہ میں اس کے لئے کچھ بھی تو نہیں کرسکتا۔"

"مجھے یہ اطلاع شہباز ہی سے ملی تھی کہ داور زری کوہ میں پہاڑی بکروں کا شکار کھیل رہا ہے۔"

"خداوند..... تب تو مجھے داور کی زندگی کی طرف سے مایوس ہی ہوجانا چاہئے۔ ان مردودوں نے اُسے مار کر اس کی لاش بھی غائب کردی۔"

"نتائج اخذ کرنے میں جلدی نہ کیجئے..... یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ خود ہی روپوش ہوگیا ہو۔ اپنی زندگی کے تحفظ کے لئے۔"

"جی ہاں..... یہ بھی ممکن ہے۔ میں اس سلسلے میں اگر کسی کام آسکتا ہوں تو حاضر ہوں۔"

"وہ آپ لوگوں پر بھی الزام رکھ سکتا ہے کہ آپ نے داور کو کہیں چھپا دیا ہے۔ اس طرف سے غافل نہ رہئے گا۔ یہاں اُس نے کچھ ایسے افراد پہلے ہی سے پکے کرلئے ہوں گے جنہوں نے داور کو آپ کے ساتھ زری کوہ میں دیکھا ہو۔ ورنہ وہ مجھے یہاں اس طرح نہ بھیجتا۔"

"بابا کی اُس سے پرانی رنجشیں چلی آ رہی ہیں اور وہ بہت دنوں سے ہماری تاک میں ہے۔ خیر ہمیں اس کی پرواہ نہیں ہے۔"

"پھر بھی بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ویسے میں نے صاف لفظوں میں اُسے آگاہ کردیا ہے کہ جب تک میں اس کیس کی تفتیش کر رہا ہوں وہ کسی معاملے میں دخل اندازی نہیں کرسکتا۔"

فریدی اُسے حیران وششدر چھوڑ کر دیوان خانے میں آیا جہاں انسپکٹر یوسف زئی اس کا منتظر تھا۔

"کہئے کرنل صاحب کچھ معلوم ہوا۔" خان عبدالرحمٰن نے پوچھا۔

"جی نہیں...... لیکن سلیم صاحب سے اس مسئلے پر خاصی معلومات افزاء باتیں ہوئی ہیں۔ اب اجازت دیجئے۔"

میری خواہش تھی کہ آپ رات کا کھانا ہمارے ہی ساتھ کھاتے۔

"پھر کبھی...... اس وقت تو اجازت ہی دیجئے۔"

واپسی کے سفر میں رات ہوگئی تھی۔ وہ جگہ ویران نظر آئی جہاں اُن پر فائرنگ ہوئی تھی۔ یوسف زئی اب بھی مضطرب دکھائی دیتا تھا۔ فریدی نے اس سے کہا۔

"اب آپ اس معاملے پر ازسرنو غور کیجئے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگیا کہ شہباز آپ لوگوں کو کس طرح استعمال کر رہا ہے۔"

"جی ہاں۔ پوری طرح میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔"

"لہٰذا داور، شیر افگن اور شہباز کے مثلث پر اس واقعے کی روشنی میں دوبارہ نظر ڈالئے شاید کوئی کام کا نکتہ ہاتھ آجائے۔"

"اس سلسلے میں اتنا ہی جانتا ہوں جتنا آپ کو پہلے بتا چکا ہوں۔ وہ بہت کم آدمیوں پر اعتماد کرتا ہے۔ خاص قسم کے کام فورس کے افراد سے نہیں لیتا۔ آپ وہ لاش دیکھ ہی چکے ہیں۔"

"کیا وہ پہلے بھی کبھی داور کے چکر میں رہا ہے۔"

"مجھے علم نہیں۔"

"کیا لیفٹیننٹ نادر شجاع شہباز کے دوستوں میں سے ہے۔"

"میں نے کبھی دونوں کو ایک ساتھ نہیں دیکھا اور نہ کبھی نادر صاحب دفتر ہی میں دکھائی دیئے۔ یہ بات میں یقینی حد تک کہہ رہا ہوں۔"

"اس سلسلے میں اپنے طور پر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کیجئے گا۔"

"بہت بہتر۔"

شکوہ آباد پہنچ کر فریدی نے شہباز کو زری کوہ کے سفر کی کہانی سنائی اور شہباز بہت زیادہ پرجوش نظر آنے لگا اور میز پر گھونسہ مار کر بولا۔ "میرا دعویٰ ہے کہ خان عبدالرحمٰن نے اُسے چھپا رکھا ہے اور وہ حرکت اُسی کے آدمیوں کی ہوگی۔ وہ ایک سرکش قبیلے کا سردار ہے۔ آپ فکر نہ کیجئے۔ میں زری کوہ کو الٹ پلٹ کر رکھ دونگا اور اس فائرنگ کے ذمہ دار جلد ہی آپ کے سامنے پیش کردیئے جائیں گے۔ اس وقت فرار ہوگئے ہیں تو کیا ہوا۔ ایک ایک پر میری نظر ہے۔"

"نہیں۔" فریدی ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ "فی الحال سکوت اختیار کیجئے۔ میں اس معاملے کو اپنے طور پر نپٹاؤں گا۔"

"خدا کی پناہ...... اگر آپ دونوں کو کوئی گزند پہنچتا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ میرے علاقے میں فورس پر کوئی حملہ آور ہو...... ناممکن۔ قطعی ناممکن۔ اس کا بچ جانا۔"

"فی الحال آپ میری خاطر صبر کیجئے۔"

"میں اس سلسلے میں آپ کی مرضی کے خلاف ایک قدم بھی نہیں اُٹھانا چاہتا۔"

"شکریہ خان شہباز۔"

پروفیسر خلجی غصے میں آپے سے باہر ہو رہا تھا اور رضوانہ دور کھڑی ہنس رہی تھی۔

"آخر تو کتنی سیاہی ملے گی میرے چہرے پر۔" وہ زور سے چیخا۔

"کہاں...... اتنے تو گورے چٹے نظر آ رہے ہیں۔" رضوانہ اٹھلا کر بولی۔

"آخر تو نے یہ جھوٹ کیوں بولا کہ نادر اپنی راتیں یہیں لائبریری میں گزارتا ہے۔"

"تو کیا میں اس پر شیر افگن کے قتل کا الزام آجانے دیتی۔"

"جہنم میں جائے وہ...... ہم کیوں ہمدردی کریں۔"

''صرف آپ کو اُس سے ہمدردی نہ ہوگی۔ مجھے تو ہے۔''

''تجھے اُس سے ہمدردی ہے۔ اُس سے جس نے ہمیں اس حال کو پہنچا دیا ہے۔''

''تم پھر بہکنے لگے ڈیڈی...... کیا تمہیں اپنی زندگی پیاری نہیں ہے۔''

''اوہ خداوند میں کیا کروں۔'' پروفیسر دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچنے لگا۔

''ہاں یہ مناسب ہے۔'' رضوانہ سنجیدگی سے بولی۔''اس طرح دل کا غبار بھی نکل جائے گا اور تمہیں کوئی گزند بھی نہیں پہنچے گا۔''

''تو کیسی بیٹی ہے خبیث۔'' پروفیسر حلق پھاڑ کر چیخا۔

''دوسری بیٹیوں سے کسی قدر مختلف۔''

''سیدھی جہنم میں جائے گی۔''

''جہنم کا کچھ نہ کچھ مصرف تو ہونا ہی چاہئے۔ آخر بنائی کس لئے گئی ہے۔''

''تجھ سے تو شیطان بھی پناہ مانگتا ہوگا۔''

''میں شیطان سے آدم وحوا کا انتقام لے رہی ہوں۔''

ٹھیک اسی وقت نادر شجاع کمرے میں داخل ہوا اور انہیں اس حال میں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ ادھر پروفیسر ایسا نظر آنے لگا جیسے غبارے سے ہوا نکل گئی ہو۔ غصے کی وجہ سے خدوخال میں جو تیکھا پن پیدا ہوا تھا یکلخت ڈھیلا پڑ گیا۔

''کیا قصہ ہے۔'' نادر نے پوچھا۔

''وہ کرنل فریدی آیا تھا۔ تمہارے بارے میں پوچھ گچھ کر رہا تھا۔''

نادر نے پروفیسر کو گھور کر دیکھا اور پروفیسر جلدی سے بولا۔

''میں نے اپنی زبان قطعی بند رکھی تھی۔ اسی سے باتیں ہوئی تھیں۔''

''کیا باتیں ہوئی تھیں۔'' نادر نے رضوانہ سے پوچھا اور رضوانہ اُسے بتانے لگی کہ کس طرح اُس نے اُس کی موجودگی شکوہ آباد میں ثابت کر دی تھی۔

''میرے ہاتھ صاف ہیں۔ میں نے اُسے نہیں قتل کیا۔''

''لیکن مشتبہ ہو۔ اگر قتل والی شب یہاں تمہاری موجودگی ثابت نہیں کی جائے گی تو دھر لئے جاؤ گے۔'' رضوانہ نے کہا۔

''میں شکوہ آباد ہی میں رہا ہوں، اُس وقت سے جب وہ دارالحکومت گیا تھا۔''

''لیکن مجھے تو پورے چھ دن بعد دکھائی دیئے تھے۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''اچھی بات ہے۔'' رضوانہ غصیلے لہجے میں بولی۔''تو ثابت کرو...... یہاں اپنی موجودگی۔''

''میں جہاں بھی رہا ہوں تنہا رہا ہوں اس لئے کسی قدر دشواری ضرور پیش آئے گی۔ لیکن تم اچھی طرح جانتی ہو کہ کرنل فریدی میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ پروفیسر کیوں گرم ہو رہے تھے۔''

وہ پروفیسر کو گھورنے لگا اور پروفیسر کی حالت پہلے سے بھی زیادہ خراب نظر آنے لگی۔ آنکھوں کی وحشت تک غائب ہوگئی تھی اور اُس کی جگہ خوف نے لے لی تھی۔

''کچھ نہیں تک...... کچھ نہیں۔ ایک گھریلو معاملہ تھا۔'' وہ بدقت بولا۔

''نہیں گھریلو معاملہ نہیں تھا۔ انہیں اس پر اعتراض تھا کہ تم اپنی راتیں لائبریری میں کیوں گزارتے رہتے ہو۔''

''یہ تو کوئی ایسی بات نہیں جس پر غصہ کیا جائے۔''

''بالکل نہیں...... بالکل نہیں۔'' پروفیسر جلدی سے بولا۔

''چلو چھوڑو......آؤ میرے ساتھ۔'' رضوانہ ہاتھ ہلا کر بولی۔

پروفیسر اُنہیں بے بسی سے دیکھتا رہا۔ رضوانہ اسے لائبریری میں لائی اور بولی۔''یہ رہا تمہارا بستر......اور یہ سگریٹ کے ٹوٹے بکھرے پڑے ہوئے ہیں۔''

''لیکن تم نے یہ سب کچھ اتنی جلدی کیسے کر لیا تھا۔''

''اُسکی کال میں نے ہی ریسیو کی تھی۔ نام معلوم ہوتے ہی فوراً تمہارا خیال آیا کہ شاید تمہارے ہی بارے میں پوچھ گچھ کرنے آ رہا ہے۔ بس میں نے جلدی جلدی یہ انتظام کر لیا۔''

''تم واقعی بہت تیز ہو...... پہلے وہ گھر گیا تھا وہیں سے معلوم ہوا کہ میں اپنا زیادہ تر وقت یہاں گزارتا ہوں۔ لیکن رضوانہ کہیں پروفیسر آؤٹ نہ ہو جائیں۔''

''فکر نہ کرو...... اُنہیں ہینڈل کرنا جانتی ہوں۔''

''اسی لئے میں کہتا ہوں کہ جلد از جلد ہماری شادی ہو جانی چاہئے۔''

''بکواس مت کرو۔ مجھے لفظ شادی سے نفرت ہے!''

''خیر یہ بعد کی باتیں ہیں۔ بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''فکر نہ کرو...... میں پوری طرح ہوشیار ہوں۔''

''پتا نہیں کس طرح یہ بات آؤٹ ہوگئی۔''

''آؤٹ ہوگئی۔'' رضوانہ نے حیرت سے دہرایا۔

''ہاں کچھ لوگوں کو اس کا علم ہوگیا ہے۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا یہاں ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی تیسرا نہیں ہے۔ ڈیڈی پر میں کڑی نظر رکھتی ہوں۔''

''انہیں یہ باور کراتی ہو کہ میرے ساتھ ہی ان کی گردن بھی کٹ جائے گی؟''

''میں نے اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ انہیں بس میرے اور تمہارے تعلقات پر اعتراض ہے۔''

''اسی لئے تو کہتا ہوں کہ شادی۔''

''بس بکواس بند کرو ورنہ دو چار ہاتھ جھاڑ دوں گی۔''

''جاننے والوں کے درمیان بھی چہ میگوئیاں ہوتی ہیں۔''

''ہونے دو۔''

''آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔''

''شوہر بن جانے کے بعد تم میرے ہاتھوں سے پٹ نہ سکو گے۔ تمہاری انا مجروح ہوگی۔''

''قطعی نہیں ہوگی۔ سب کے سامنے تو مارتی نہیں ہو۔'' وہ مسمسی صورت بنا کر بولا اور رضوانہ بیساختہ ہنس پڑی پھر بولی۔ ''اول درجے کے مکار ہو۔''

''جو کچھ بھی ہوں۔ تمہارا ہوں۔ قسم ہے جو کبھی کسی اور کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا بھی ہوں۔''

''اگر دیکھو بھی تو کیا فرق پڑے گا۔''

''یعنی تم کسی دوسری عورت کو برداشت کرلو گی۔''

''یقیناً بشرطیکہ میرا حق ملکیت برقرار رہے۔ تم مجھ سے اسی طرح پٹتے رہو۔''

''پتا نہیں یہ مار پیٹ تمہیں اتنی پسند کیوں ہے۔''

''میں خود بھی نہیں جانتی۔ جب بھی کبھی غصے میں ایک آدھ جھاڑ دیتی ہوں گھنٹوں ذہن

پرسرور سا طاری رہتا ہے۔''

''خیر......خیر......اب کام کی بات کرو۔''

''کوئی خاص بات ہے؟'' رضوانہ نے سوال کیا۔

''ہاں......اس بار بات کیسے بنے گی۔ میرا خیال ہے کہ کرنل فریدی کو علم ہوگیا ہے۔''

''یہ میری ذمہ داری ہے۔ تم خواہ مخواہ بور ہو رہے ہو۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ تنہا نہیں آیا۔ اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں۔''

فریدی ایک بار پھر نذرہ خاتون سے ملا۔ شیر افگن سے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ آج بھی نذرہ خاتون کی آنکھیں متورم نظر آرہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے زیادہ تر روتی ہی رہتی ہو۔

''کیا شیر افگن صاحب بہت غصہ ور آدمی تھے؟'' اس نے نذرہ خاتون سے سوال کیا۔

''جی نہیں! بہت ٹھنڈے دماغ کے آدمی تھے۔ شاذ و نادر غصہ آتا تھا۔''

''لیکن ناصر خان والے معاملے سے معلوم ہوتا ہے......!''

''محض اتفاق تھا کرنل صاحب! ورنہ وہ تو کبھی اونچی آواز میں گفتگو بھی نہیں کرتے تھے۔ وہ فرشتہ تھے۔ البتہ اپنے بعض معمولات میں دخل اندازی پسند نہیں کرتے تھے۔ ایسے مواقع پر کسی قدر جھنجھلاہٹ کا اظہار بھی ہوتا رہتا تھا، مثلاً اگر وہ اپنی ڈائری لکھ رہے ہوں اور کوئی انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرے تو جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ ضرور ہوتا تھا۔''

''اوہ تو وہ ڈائری لکھنے کی بھی عادی تھے۔''

''جی ہاں پابندی سے لکھتے تھے۔''

''لیکن وہاں ان کے سامان میں کوئی ڈائری نہیں ملی تھی۔ حالانکہ ڈائری لکھنے والے کم از کم سفر میں ڈائری ضرور ساتھ رکھتے ہیں۔''

''میں ان کے بارے میں کیا عرض کرسکتی ہوں۔''

''ڈائری رکھتے کہاں تھے۔ میرا خیال ہے کہ کئی ڈائریاں ان کے پاس ہوں گی۔ اگر

لکھنے کے عادی تھے۔"

"جی ہاں......درجنوں ہیں۔ لائبریری میں ڈائریوں کیلئے ایک الماری مخصوص ہے۔"

"کیا میں ان پر ایک نظر ڈال سکوں گا۔"

"کیوں نہیں۔ آیئے میرے ساتھ۔"

وہ اُسے لائبریری میں لائی اور جہاں تھی حیرت زدگی کے عالم میں وہیں کھڑی رہ گئی۔ الماریوں کی ساری کتابیں فرش پر بکھری پڑی تھیں۔

"یہ کیا ہوا اور کس نے کیا؟" وہ فریدی کی طرف مڑ کر بولی۔

"ڈائریوں والی الماری۔"

نذرہ خاتون نے ایک الماری کی طرف اشارہ کیا لیکن وہ بھی خالی نظر آئی۔ اس کے بعد فریدی نے ساری کتابیں الٹ پلٹ ڈالی تھیں۔ لیکن اُن میں ایک بھی ڈائری نہ مل سکی۔

"آپ کو یقین ہے کہ اس الماری میں درجنوں ڈائریاں تھیں۔"

"میں یہاں رہتی ہوں کرنل صاحب، مجھے یقین کیوں نہ ہوگا۔"

"آپ یہاں کب سے نہیں آئیں۔"

"اس حادثے کی خبر سننے کے بعد سے پہلی بار آئی ہوں۔ ورنہ اُن کی کتابوں کی دیکھ بھال میں ہی کرتی تھی۔ اس کام کو ملازموں پر نہیں چھوڑا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے ہوا......ڈائریاں کہاں گئیں۔"

فریدی خاموش ہی رہا۔ اُس کے بعد گھر کے سارے ملازم طلب کر لئے گئے تھے لیکن سب نے اس سے لاعلمی ظاہر کی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہوا...... اور اس کا ذمہ دار کون ہے۔" نذرہ خاتون نے کہا۔

"ضرور ان ڈائریوں میں سے کسی میں کوئی ایسا مواد تھا جو ان معاملات پر روشنی ڈال سکتا۔"

"معاملات...... کیسے معاملات......!"

"بہتیرے معاملات ہیں۔ کیا آپ کو علم ہے کہ شیر افگن صاحب مجھ سے ملنے گئے تھے۔"

"جی نہیں! میں نہیں جانتی۔" نذرہ خاتون کے لہجے میں حیرت تھی۔

"میں آپ کو جو کچھ بھی بتانے جا رہا ہوں اُسے آپ کو اپنی ہی ذات تک محدود رکھنا پڑے گا۔"

"ایسا ہی ہوگا......آپ مطمئن رہئے۔"

فریدی نے وہ ساری گفتگو دہرا دی جو شیر افگن اور اس کے درمیان ہوئی تھی۔ نذرہ خاتون حیرت سے منہ کھولے سنتی رہی پھر بولی۔ "میری سمجھ میں تو خاک بھی نہیں آیا۔"

"انہوں نے اُس نامعلوم آدمی کا جو ہیولیٰ بیان کیا تھا نادر صاحب پر پورا اترتا ہے۔"

"لیکن وہ نادر کی آواز بھی پہچان سکتے تھے اور چلنے کا انداز بھی اُن کے لئے نیا نہ ہوتا۔ آخر یہ سب کیا ہے۔ باہر کے معاملات پر وہ مجھ سے کبھی گفتگو نہیں کرتے تھے۔"

"فی الحال اس پر غور فرمائیے کہ یہ حرکت کس کی ہو سکتی ہے۔" فریدی نے لائبریری کی ابتر حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں کھل کر بات کروں گی۔" نذرہ خاتون نے طویل سانس لے کر کہا۔

"میں یہی چاہتا ہوں۔"

"وہ دونوں ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتے تھے، اس سے آپ جو نتیجہ اخذ کرنا چاہیں کرلیں۔"

"کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی آپ کی لاعلمی میں بھی کسی طرح کوٹھی میں داخل ہو جائے۔"

"جی ہاں......ایک چور دروازہ بھی ہے اور نادر اس سے واقف ہے۔"

"میں آپ کا بے حد مشکور ہوں خاتون۔"

"میں اُنکے قاتل کو پھانسی کے تختے پر دیکھنا چاہتی ہوں۔ خواہ وہ میرا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔"

"لیکن محترمہ قتل کی وجوہات ہوتی ہیں۔ یہ قتل فوری اشتعال کے تحت ہوا ہوتا تو سمجھا جا سکتا تھا کہ شیر افگن صاحب کے خلاف نادر کی نفرت بروئے کار آئی ہے۔ قتل کی وجہ مالی منفعت بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ ابھی آپ زندہ ہیں اور پھر اگر شیر افگن صاحب کے بھائی نے بھی اپنا حق طلب کر لیا تو آپ ہی کے حصے میں کتنا آئے گا۔ اب تیسرا پہلو باقی رہتا ہے۔ نادر صاحب اسی صورت میں انہیں قتل کر سکتے تھے جب کہ خود انہیں اُن کی ذات سے کوئی خطرہ لاحق رہا ہو۔"

"میں سمجھ رہی ہوں۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔" نذرہ خاتون نے طویل سانس لے کر کہا۔ میں کبھی اس قدر کھل کر بات نہ کرسکتی۔ اگر اُن کی ڈائریاں اس طرح غائب نہ ہوگئی ہوتیں۔ میں نے کبھی کبھی اُنہیں بے خیالی میں بڑبڑاتے سنا تھا۔ نادر اگر تو پھنس گیا تو شہباز تیری طرف سے نظریں پھیر لے گا اور صرف تیری گردن کٹے گی۔"

"اوہ......!" فریدی طویل سانس لے کر رہ گیا۔

"میری موجودگی کا احساس ہوتے ہی وہ خاموش ہوجاتے میں کچھ پوچھنے کی کوشش کرتی تو گول مول جواب دے کرٹال جاتے۔"

"آپ نے کبھی کریدنے کی کوشش نہیں کی۔" فریدی نے پوچھا۔

"نہیں جناب! میں ان کا اسی طرح احترام کرتی تھی جس طرح کوئی پجارن کسی دیوتا کا کرسکتی ہے۔ مجھے نہیں یاد پڑتا کہ کبھی کسی بات پر اُن سے الجھی ہوں۔ جو کچھ وہ خود سے بتانا چاہتے بتا دیتے۔ میں کریدا نہیں کرتی تھی۔ لیکن ڈائریوں کے اس طرح غائب ہوجانے کی بناء پر سوچتی ہوں کہ ضرور انہوں نے نادر کے بارے میں کچھ لکھا ہوگا۔ ورنہ وہ الماری ہی میں ہوتیں اور مجھے یقین کامل ہے کہ یہ حرکت نادر کے علاوہ اور کسی کی نہیں ہوسکتی۔"

"ذرا پھر تو بتایئے گا کہ وہ بے خیالی میں کیا بڑبڑاتے تھے۔" فریدی نے اپنی نوٹ بک کے صفحات پلٹتے ہوئے کہا۔

نادر اگر تو پھنس گیا تو شہباز تیری طرف سے نظریں پھیر لے گا اور صرف تیری گردن کٹے گی۔" نذرخاتون نے بھرائی ہوئی آواز میں دہرایا۔

فریدی نے یہ جملے نوٹ کیے اور ڈائری بند کرتا ہوا بولا۔ "تو گویا اس قتل کا محرک شہباز بھی ہوسکتا ہے۔"

"کوئی بھی ہو۔ خدارا جلد میرے کلیجے میں ٹھنڈک ڈالیئے۔"

"بہت جلد خاتون۔" فریدی اُٹھتا ہوا بولا۔ "فی الحال صبر سے کام لیجیے۔"

کوٹھی سے نکل کر گاڑی کی طرف آیا اور اُسے اچھی طرح چیک کرلینے کے بعد پولیس اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگیا۔

تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہوا۔ سوئچ آن کرنے پر کسی کی آواز

آئی۔ "ہارڈ اسٹون...... ہارڈ اسٹون...... بی الیون کالنگ۔"

"ہارڈ اسٹون......!" فریدی نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"سب کچھ ہماری توقعات کے مطابق ہوا ہے جناب۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔ "پانچ مقامی آدمیوں نے لاش تلاش کرکے ایک جگہ دفن کردی ہے۔ جگہ ہمارے نوٹس میں ہے اور اُن پانچوں کی قیام گاہوں سے بھی آگاہی ہوگئی ہے۔ کوئی اہم لوگ نہیں۔ وہیں کے کسان قسم کے لوگ ہیں...... اُوور......!"

"مرنے والے کے بارے میں کیا معلوم ہوا۔"

"یہاں کے مشہور بدمعاشوں میں شمار ہوتا تھا۔ شمشیر گل نام تھا۔"

"اس کے دوسرے ساتھیوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرو۔ ایسے ساتھی جو اس کا ہاتھ بٹاتے رہے ہوں...... اُوور......!"

"بہت بہتر جناب۔"

"اُوور اینڈ آل۔" کہہ کر فریدی نے ماؤتھ پیس ڈیش بورڈ کے خانے میں رکھ دیا۔

حمید نے ان دونوں کو بتایا کہ کس طرح اُس نے دوبارہ گیٹار حاصل کیا ہے اور سکی بہت زیادہ بدحواس نظر آنے لگی۔

"تم نے بہت بُرا کیا۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "ان لوگوں سے جھگڑا مول لینا اچھا نہیں ہوتا۔ ان میں سے بعض اول درجے کے بدمعاش ہوتے ہیں۔ مفرور قیدی اور قاتل...... بال بڑھا کر اپنا حلیہ تبدیل کرتے ہیں اور ہپیوں میں شامل ہوجاتے ہیں۔"

"بہرحال ہمیں ہوشیار رہنا ہے۔" حمید نے کہا۔

"آخر تم نے بات بڑھائی ہی کیوں...... کتنا قیمتی تھا گیٹار۔"

"دو پیسے کا تھا۔" قاسم جھلا کر بولا۔ "بہت اچھا کیا۔ ذرا کوئی ادھر آنکھ اُٹھا کر تو دیکھے ایک ایک کی گردن مروڑ دوں گا۔"

"تم صرف دو ہو۔"

''ہمیں دو ہزار سمجھو۔'' قاسم نے اکڑ کر کہا۔''اگر انہوں نے گڑبڑ کی تو مارے جائیں گے۔''

''پتا نہیں تم دونوں کس قسم کے لوگ ہو۔''

''ہم بھی اول درجے کے بدمعاش ہیں تم فکر نہ کرو۔'' حمید نے کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ بات وہیں ختم نہ ہوگئی ہوگی۔'' سکی بولی۔

''مجھے تم سے زیادہ یقین ہے کہ ابھی مزید جھگڑا ہوگا۔'' حمید نے کہا۔

''یار مارو غولی...... مجھے بھوخ لگی ہوئی ہے۔ پیٹ میں جو کچھ تھا سب نکل غیا۔''

''اب قیا قروں۔'' قاسم نے اردو میں کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ اس سفر میں تم مجھے کھا جاؤ گے۔''

''نہیں بتاؤ قیا قروں......کھانا تھوڑا ہے۔''

''میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ لوگ کہہ رہے تھے کہ کل صبح ایک گاؤں سے گزریں گے وہاں تمہارے لئے بھیڑیں خریدنے کی کوشش کروں گا۔ پورا گلہ چاہئے تمہارے لئے۔ لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ لوگ بھیڑیں ساتھ رکھنے دیں۔''

''پھر تم لوگوں نے اپنی زبان شروع کردی۔ میں بور ہو رہی ہوں۔'' سکی نے کہا۔

''اللہ قرے تم مر ہی جاؤ...... پیچھا چھوڑے۔'' قاسم بھنا کر بولا۔

''مجھ سے جھگڑا کر رہا ہے کہ تمہاری وجہ سے میری محبوبہ خوفزدہ ہوگئی ہے۔'' حمید نے انگلش میں کہا۔

''ہائے محبوبہ کہا ہے مجھ کو۔'' سکی ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

''آخر براہِ راست مجھ سے کیوں نہیں کہتا۔ کتنی خواہش ہے کہ اسکی زبان سے کچھ سنوں۔''

''غالیاں سنو گی غالیاں۔'' قاسم اردو میں بولا۔''مونگ کی دال تم پیدا ہی قیوں ہوئی تھیں روکھی پھیکی۔ ابے حمید سالے تم نے کس جنجال میں پھنسوا دیا ہے۔''

''کوئی ان میں سے پکڑ لاؤں۔''

''بس بس اس مونگ قی دال نے میرا جی بھر دیا ہے۔''

''اب کیا کہہ رہا ہے۔'' سکی نے پوچھا۔

''تمہارے حسن کی تعریف کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ اس کے بغیر تو اب میں زندہ ہی نہیں

رہ سکوں گا۔''

''اُوہ......میرے خدا میں قیا قروں۔'' قاسم جھلاہٹ میں اپنے بال نوچنے لگا۔

''ارے ارے یہ کیا کرنے لگا۔'' سکی نے حیرت سے کہا۔

''کہتا ہے کہ اسے سب کچھ کیوں بتاتے جا رہے ہو......غصہ کر رہا ہے۔''

''تم آخر اتنے شرمیلے کیوں ہو جان۔'' سکی ہنس کر بولی۔

قاسم دوسری طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔

''بچوں کی طرح نخرے بھی کرتے ہو۔'' وہ ہنس پڑی۔

''ابے یہ میں نخرے قر رہا ہوں۔'' قاسم دہاڑتا ہوا کھڑا ہوگیا اور حمید نے سکی سے کہا ''شائد پھر اس کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔''

''مم......میں قے کرتے نہیں دیکھ سکوں گی۔'' سکی نے کہا اور چھولداری سے نکل گئی۔

''اسی طرح دپھا ہوجاؤ سالی۔'' قاسم بیٹھتا ہوا بولا۔ پھر بڑبڑانے لگا۔''ایسی بھی قیا عورت جسے دیکھ دیکھ کر وہ چپاتی بیغم یاد آتی رہیں۔''

''ہائیں ہائیں۔'' حمید بولا۔''یہ چپاتی بیغم کون ہیں۔''

''ہی ہی ہی......بس یونہی جبان سے نقل غیا......میں روٹی کو چپاتی بیغم کہتا ہوں۔''

''بس روٹی کے علاوہ اور رکھا ہی کیا ہے تمہاری زندگی میں۔ لیکن تم نے یہ سچ بات نہیں کہی۔''

''قیا مطلب......؟''

''حمید صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ تم اپنی بیوی کو چپاتی بیگم کہتے ہو۔''

''سالے نہیں تو......اور قیا قیا بتایا تھا۔''

''یہ بھی بتایا کہ شادی کی پہلی رات تم بُری طرح بوکھلائے ہوئے تھے اور بیوی کو پلنگ سمیت اُٹھا لیا تھا۔ وہ بیچاری چیخ مار کر بیہوش ہوگئی اور پھر اس نے تمہیں اپنے قریب نہیں آنے دیا تھا۔''

''زندہ دپھن قر دوں غا سالے قو...... ملے تو۔''

''لیکن یہ لڑکی تو اچھی خاصی ہے۔''

''کیا اچھی خاصی ہے۔ سالی میں ہڈیوں کے علاوہ اور کیا رکھا ہے۔'' قاسم بگڑ کر بولا۔

"بگڑی ہوتی تو کیا تم اُسے تل کر کھاتے۔"

دفعتاً اُنہوں نے سکی کی چیخ سنی اور حمید اچھل کر چھولداری سے باہر بھاگا۔

"ٹھہرو...... میں بھی آرہا ہوں۔ سالوں نے گڑبڑ کر ہی ڈالی۔" قاسم بھی اُٹھتا ہوا بولا۔

سکی پھر چیخی اور اس بار حمید کو سمت کا اندازہ ہوگیا۔ چاقو نکال کر اسی طرف جھپٹا۔

"گھبرانا نہیں میں بھی آرہا ہوں۔" قاسم نے للکار کر کہا۔

اور پھر حمید ٹھیک اُسی جگہ پہنچا جہاں سے تین چار ہپی سکی کو اُٹھا لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

حمید نے ایک پر چھلانگ لگائی اور وہ چیخ کر الٹ گیا۔ چاقو کا وار اُس کے شانے پر لگا تھا۔ انہوں نے بوکھلا کر سکی کو چھوڑ دیا اور پیچھے ہٹ گئے۔

"ایق تو بھی جندہ نہ چھوڑوں غا......!" قاسم بھی دہاڑتا ہوا پہنچ گیا۔

اور سکی دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔

"ہی ہی ہی ہی......اس تی نہیں ہوئی......اُسے چھوڑو گدگدی لگ رہی ہے......ہی ہی ہی۔"

"تم ہنس رہے ہو جان۔" وہ ہانپتی ہوئی بولی۔

"ارے ہاں۔" قاسم نے انگلش میں کہا۔ "ہی ہی ہی......اس طرح لپٹنے سے گدگدی لگتی ہے ہی ہی ہی۔"

ادھر حمید نے ایک کو اور گرالیا تھا۔ تیسرا بھاگنے ہی لگا تھا کہ حمید نے کسی کو کہتے سنا۔

"انہیں گھیرو۔ جانے نہ پائیں۔ سرکاری آدمی لگتے ہیں۔ یہ شاید اُنہی چھ کارپردازوں میں سے کوئی تھا۔"

حمید نے بڑی پھرتی سے چاقو بند کر کے ریوالور نکال لیا اور تیزی سے پیچھے ہٹتا ہوا قاسم سے بولا۔ "بائیں جانب نیچے اُتر چلو۔ اگر ان کے ہاتھ آگئے تو مارے جائیں گے۔"

دوسری طرف سے کئی آدمی دوڑ کر ادھر ہی آتے نظر آئے اور حمید نے پلٹ کر ایک فائر جھونک مارا۔ قاسم شاید ذہنی طور پر پوری طرح بیدار ہوگیا تھا۔ اس لئے حمید کی ہدایت پر عمل کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ حمید ان دونوں کے پیچھے تھا۔ دفعتاً دوسری طرف سے بھی ایک

فائر ہوا اور حمید نے ایک جگہ پوزیشن لے لی۔ ساتھ ہی ان سے کہا۔ "تم دونوں چلتے رہو......رکنا مت......میں انہیں روکتا ہوں۔"

اس نے پھر فائر کیا۔ ادھر سے بیک وقت کئی فائر ہوئے لیکن حمید محفوظ رہا۔

ایسی جگہ جم گیا تھا کہ وہ لوگ قریب آئے بغیر قاسم اور سکی کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس نے پے در پے فائر کئے۔

ادھر سکی منمنا رہی تھی۔ "دیکھو میں نہ کہتی تھی کہ یہ ضرور ہوگا۔"

"یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ تم کیوں فکر کرتی ہو۔ اگر چلا نہ جارہا ہو تو میری پیٹھ پر آجاؤ۔"

"نہیں ٹھیک ہے۔ میں چل رہی ہوں۔ کہیں گولی نہ لگ جائے۔"

"نہیں لگے گی۔ میرا ساتھی بہت تیز ہے۔ وہ انہیں ادھر نہیں آنے دے گا۔ اس کے پاس بہت کارتوس ہیں۔"

اچانک وہ لڑکھڑائی اور قاسم نے سنبھال لیا۔ مطلع صاف تھا اور تاروں کی چھاؤں میں وہ راستہ بخوبی دیکھ سکتے تھے۔

"اب کیا ہوگا۔" لڑکی نے سسکی لی۔

"سب ٹھیک ہوگا۔ بور ہونے کی ضرورت نہیں۔"

فائروں کی آوازوں سے چٹانیں گونج رہی تھیں اور حمید سوچ رہا تھا کہ یہ کیا ہوگیا۔ ساری اسکیم ہی تلپٹ ہو کر رہ گئی۔ یہاں آنے کا مقصد ہی فوت ہوگیا۔ اسے کیار کے لئے جھگڑا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اب اس وقت یا تو وہ گھیر کر مار لئے جائیں گے یا اُن سے کٹ کر ادھر اُدھر بے مقصد بھٹکتے پھریں گے۔ اس نے کسی کو صاف کہتے سنا تھا کہ انہیں گھیرو۔ سرکاری آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اس حد تک بات بڑھ جانے کے بعد دوبارہ ان میں گھل مل جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

اُدھر ڈھلان کے اختتام پر پہنچ کر قاسم رک گیا اور اونٹ کی طرح منہ اُٹھا کر اوپر دیکھنے لگا۔

"ارے لیٹ جاؤ......یہاں اس طرح کھڑے نہ رہو......ورنہ مارے جاؤ گے۔" سکی نے اُس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "وہ لوگ اونچائی پر ہیں۔ تمہارا ساتھی ہر طرف تو نظر نہ رکھ سکے گا۔"

”اوہاں ٹھیک ہے۔“ قاسم نے کہا اور چت لیٹ گیا۔ اس کے قریب ہی ایک سیدھی چٹان کھڑی تھی اور آگے کا راستہ مسدود ہوگیا تھا۔ سکی بھی اُس کے قریب ہی لیٹ کر سرگوشیاں کرنے لگی۔ ”تمہارا ساتھی اول درجے کا احمق معلوم ہوتا ہے۔“

”پھر میں کیا کروں؟“

تم اس کا ساتھ چھوڑ دو اور ہم کسی طرف نکل چلیں۔

”ارے باپ رے۔“ قاسم اردو میں بڑبڑایا ساتھ ہی اچھلا بھی تھا کیونکہ سکی نے اس کی طرف کروٹ لے کر اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیا تھا۔

”یہ...... یہ کیا کررہی ہو۔ سنو کیسی ٹھائیں ٹھائیں ہو رہی ہے۔“

”چپ چاپ لیٹے رہو۔ آہستہ نہیں بول سکتے۔ تمہاری آواز اُن تک پہنچ جائے گی۔“

ادھر حمید سوچ رہا تھا کہ اب کچھ اور کرنا چاہئے۔ ورنہ خواہ مخواہ کارتوس ضائع ہوتے رہیں گے۔ دوسری طرف فائرنگ کرنے والے اونچائی پر تھے اور دکھائی نہیں دیتے تھے۔ دفعتاً حمید نے فائرنگ بند کردی۔ اُدھر سے مزید کچھ فائر ہوئے اور سناٹا چھا گیا۔ اتنے میں حمید نے پھر پوزیشن میں تبدیلی کی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کا ان لوگوں پر کیا ردعمل ہوتا ہے۔ اُن کی تلاش میں نیچے اترتے ہیں یا پسپائی اختیار کرتے ہیں۔

کئی منٹ گزر گئے لیکن کسی طرف سے بھی کوئی حرکت نہ دکھائی دی۔ رات پہلے ہی کی طرح سائیں سائیں کرنے لگی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ذرا دیر پہلے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ حمید آہستہ آہستہ اوپر کی طرف رینگنے لگا۔ ایسا ہی معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی چھپکلی کسی دیوار پر چڑھ رہی ہو۔ ریوالور کے خالی چیمبر دوبارہ بھر لئے تھے۔

اور پھر ذرا ہی سی دیر میں اُس پر یہ بات منکشف ہوگئی تھی کہ وہ پسپا نہیں ہوئے تھے۔ اگر ذرا سا بھی چوکتا تو مارلیا گیا تھا۔ ایک پتھر کی اوٹ سے اس نے اُن کے ہیولے دیکھ لئے۔ آٹھ دس رہے ہوں گے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر اوندھے پڑے نظر آئے۔ شاید وہ خود اُس کے منتظر تھے۔ وہ انہیں صاف دیکھ رہا تھا۔ چار عدد بالکل اس کی زد میں تھے۔ اُن سے پیچھا چھڑانے کی یہی ایک تدبیر سمجھ میں آئی کہ نشانہ لے لے کر فائرنگ شروع کردے۔ وہ چاروں صاف زد پر تھے۔ پہلے ہی ہلے میں اچھل اچھل کر دور جا پڑے اور بقیہ اُٹھ کر بھاگے

ہی تھے کہ ان میں سے دو اور گرے اور حمید نے تیزی سے ریوالور پھر لوڈ کیا اور ٹریگر دباتا چلا گیا۔ حالانکہ اب کوئی بھی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ زخمی ہوجانے والے وہیں پڑے تڑپ رہے تھے اور چیخ رہے تھے۔

حمید تیزی سے پلٹا اور نیچے اُترنے لگا۔ اب شاید ہی کوئی ادھر آنے کی ہمت کرسکتا۔

کچھ ہی دور چلا ہوگا کہ قاسم کی آواز سنائی دی۔ اردو میں کہہ رہا تھا۔ ”دیکھو اس کی نہیں ہوتی...... ہی ہی ہی ہی...... ارے ارے۔“

”کیا ہو رہا ہے۔“ حمید نے ڈپٹ کر پوچھا اور قاسم کی ”ہی ہی“ رک گئی۔

”کیا ہوا......!“ سکی اُٹھ کر اس کی طرف لپکی۔

”ہوگیا جو کچھ ہونا تھا۔ اب یہاں سے دور نکل چلو۔“

”ہائے کھانا وانا تو وہیں رہ غیا۔“ قاسم بھی کراہ کر اُٹھ بیٹھا۔

”رقم تو ہے نا جیب میں۔ بہت کھانا مل جائے گا۔ چلو جلدی کرو۔“

کچھ دور چلنے کے بعد قاسم بولا۔ ”بھئی میں تو اس سے کہہ رہا تھا کہ نہیں چلا جاتا تو میری پیٹھ پر آجاؤ۔“

”ہائیں...... اچانک یہ عنایت کیوں۔“

”سب ٹھیک ہے۔“

”کیا ٹھیک ہے۔“

”ارے بیچاری مجبور عورت ہے۔ نہیں چلا جاتا ہوغا...... ہی ہی ہی۔“

”مونگ کی دال بھی تو ہے۔“

شہباز بہت زیادہ غصے میں تھا اور فریدی اُسے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے سچ مچ اس کی ذہنی کیفیت کو بڑی اہمیت دے رہا ہو۔ دفعتاً شہباز ٹہلتے ٹہلتے رک کر اس کی طرف مڑا اور بولا۔ ”یہ ٹھیک ہے جناب کہ آپ اس کیس کی تفتیش کررہے ہیں اور مجھے دخل اندازی نہ کرنی چاہئے لیکن آخر کب تک۔“

"بتایئے بھی تو کیا معاملہ ہے۔" فریدی نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"آج پھر زری کوہ میں فورس کے افراد پر فائرنگ ہوئی ہے۔ میں اُسے کسی طرح بھی نظرانداز نہیں کرسکتا۔"

"تو پھر آپ نے کوئی کارروائی کی۔"

"جی نہیں! میں نے سوچا کہ آپ کے علم میں لائے بغیر مجھے کچھ نہ کرنا چاہیئے۔ میرا دعویٰ ہے کہ داور خان کو خان عبدالرحمٰن ہی نے چھپا رکھا ہے۔"

"تب تو اوّل درجے کا احمق ہے کہ خواہ مخواہ چھیڑ چھاڑ کرکے آپ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا رہا ہے۔"

"میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ بے حد سرکش لوگ ہیں۔ آپ کو بھی اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔"

"تو پھر آپ کیا کریں گے۔"

"جوابی کارروائی...... مجھے اس سے سروکار نہیں کہ داور وہاں چھپا ہوا ہے یا نہیں۔"

"ٹھیک ہے...... اس طرح آپ جوابی کارروائی کرسکتے ہیں۔ میں یہاں آپ کے فرائض کی ادائیگی میں رکاوٹ بننے تو نہیں آیا۔"

"پھر بھی آپ کے علم میں لانا ضروری تھا۔ مجھے خوشی ہوگی اگر آپ اس کارروائی کے دوران میں ہمارے ساتھ رہیں۔"

"میں آپ کی یہ خواہش ضرور پوری کروں گا۔" فریدی مسکرا کر بولا۔

"میرے مظالم کی داستانیں آپ نے بھی سنی ہوں گی لہٰذا میں آپ کو دکھانا چاہتا ہوں کہ میرا سابقہ کیسے لوگوں سے ہے۔"

"اوہ...... ہاں یہ تو بتایئے کہ آپ نے نادر کی شکوہ آباد میں موجودگی کی تصدیق کہاں کہاں سے کی تھی۔"

"ظاہر ہے وہیں سے جہاں وہ زیادہ تر رہتا ہے۔"

"پروفیسر خلجی کی طرف اشارہ ہے شاید۔"

"جی ہاں...... وہ بہت دنوں سے اپنی راتیں وہیں بسر کر رہا ہے۔"

"بڑی عجیب بات ہے۔"

"میں نہیں سمجھا۔" شہباز اُسے غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

"پروفیسر نے اُسے کیسے گوارا کرلیا ہے۔"

"اوہ......دونوں باپ بیٹی پاگل ہیں۔"

"لیکن پاگلوں کی شہادت کوئی قانونی حیثیت نہیں رکھتی۔"

"میرا مطلب تھا سنکی ہیں۔"

فریدی کچھ نہ بولا۔ شہباز نے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نادر پر اتنا زور کیوں دے رہے ہیں۔ جب کہ داور کی انگلیوں کے نشانات مقتول کے کمرے میں ملے تھے۔"

"داور کا ملنا بہت ضروری ہے اس سے پہلے یہ معمہ حل نہیں ہوسکتا۔"

"پتا نہیں کیوں آپ نے اسے معمہ بنا دیا ہے جب کہ داور کی انگلیوں کے نشانات نے اسے ایک کھلا ہوا کیس بنا دیا ہے۔"

"قاتل کے ڈرامائی فرار نے اُسے معمہ بنایا ہے خان شہباز...... وہ اُسے خاموشی سے قتل کرکے کسی کے علم میں لائے بغیر بھی فرار ہوسکتا تھا۔"

"ہوسکتا ہے گھیر لئے جانے کے خدشے کی بناء پر پیراشوٹ ساتھ لے گیا ہو۔"

"لیکن یقین کیجئے کہ وہ قتل کے بعد خاموشی سے بھی فرار ہوسکتا تھا۔ قتل میرے ایک آدمی کی موجودگی میں ہوا تھا لیکن وہ قاتل کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔"

"میں نہیں سمجھا۔"

"شیرافگن نے مجھے بھی اس اجنبی کی کہانی سنائی تھی اور میں نے اس کی نگرانی شروع کرادی تھی۔"

"تب تو پھر کوئی الجھاؤ ہی ہوگا۔" شہباز طویل سانس لے کر بولا۔ "لیکن آخر داور روپوش کیوں ہوگیا ہے۔"

"یہی تو دیکھنا ہے۔" فریدی نے کہا اور بجھا ہوا سگار سلگانے لگا۔ شہباز کی آنکھوں میں تشویش کے آثار تھے۔

تھوڑی دیر بعد اس نے کہا "میں نے اُن سرکشوں کی کمین گاہ کا پتہ لگالیا ہے۔ آج

وہیں چھاپہ ماریں گے۔"

"جب چلنا ہوگا۔ مجھے اطلاع دے دیجئے گا۔" فریدی نے کہا۔

پھر وہ اُس کے آفس سے نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھا تھا اور ہوٹل کی طرف روانہ ہوگیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ بالکل ایسا ہی لگتا تھا جیسے کسی بچے کی خوش فعلیاں یاد آرہی ہوں۔

بھٹکتے بھٹکتے صبح ہوگئی۔ پتا نہیں کدھر نکل آئے تھے۔ چاروں طرف اونچی نیچی چٹانیں بکھری ہوئی تھیں اور قاسم دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبائے کہہ رہا تھا۔ "یہاں تو گھاس بھی نہیں ہے کہ اُس کا بھی تجربہ قر ڈالتا اور چھینو بیٹا گیار...... پتا نہیں سالا قیسا منحوس گیار تھا۔"

حمید نے سوچا کہ اب اُسے خود کو اُس پر ظاہر کردینا چاہئے۔ ورنہ یہیں کہیں ہاتھ پاؤں پسار کر پڑجائے گا۔ اُس نے بڑے پیار سے اُس کا سر سہلا کر کہا۔ "خود کو یتیم مت سمجھو میں ابھی زندہ ہوں۔" یہ اس کی اصل آواز تھی۔

قاسم تھلتھلا کر رہ گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھنے لگا۔ پھر دانت پیس کر بولا۔

"تو یہ سارا چکد پن تم نے پھیلایا ہے۔"

"بس ہوگئی کرکری! ورنہ میں تو تمہیں لمبی تفریح کرانا چاہتا تھا۔ دیکھو کیسی چاہنے والی لڑکی تلاش کردی ہے...... چاہو تو اس سے شادی بھی کرسکتے ہو۔"

"اُمے نہیں ہی ہی ہی ہی۔"

"میرا خیال ہے کہ اب تم اسے پسند بھی کرنے لگے ہو۔ چرس نوشی ترک کردینے کا وعدہ تو وہ کر ہی چکی ہے۔"

"ہاں...... غنیمت ہے۔" قاسم مسمسی صورت بنا کر بولا۔

"کتنی بار کہوں کہ انگلش میں گفتگو کرو۔" سکی نے جھنجھلا کر کہا۔

"یہ تم سے شادی کرلینے پر آمادہ ہے۔" حمید نے کہا۔

"دیکھو...... پھر وہی کھلے والی بات۔"

"اس کے لئے تو میں جان بھی دے سکتی ہوں۔"

قاسم کے دانت نکل پڑے اور حمید اس تبدیلی پر متحیر رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد قاسم نے کہا۔ "مجھ سے تو اب نہیں چلا جاتا۔ پتا نہیں کہاں جارہے ہیں۔"

"جلد ہی ہمیں کوئی چرواہا ملے گا اور ہم اُس سے بھیڑیں خریدیں گے۔" حمید بولا۔

قاسم نے بچ سے تھوک کی پچکاری ماری۔ بھیڑوں کے نام پر شائد منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ اُس نے کہا۔ "مگر سالے تم نے مجھے دھوکا قیوں دیا تھا۔"

"جب مجھے بھی کوئی مل جاتی تو خود کو ظاہر کردیتا۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آنے پائی۔"

"قبھی نہیں آئے غی...... تم ہو ہی منحوس...... یہی تو میں قہہ رہا تھا کہ آخر ٹھائیں ٹھوئیں قیوں ہونے لگی۔"

قاسم کو چلائے رکھنے میں بڑی دشواری پیش آرہی تھی۔ حمید نے سکی سے کہا کہ وہ بولتی رہے تاکہ قاسم کی بھوک بہلائے رکھنے میں کچھ مدد ملے اور اس نے قاسم کی شان میں شاعری شروع کردی۔ ایسے جذباتی ڈائیلاگ بول رہی تھی کہ قاسم کا معدہ دل کی طرف متوجہ ہوگیا۔

آخر تھوڑی دیر بعد قاسم بولا۔ "مگر یار شادی قیسے ہوسکتی ہے؟"

"ہوسکتی ہے۔" حمید نے کہا۔ "باپ کی پرواہ مت کرو۔ جیسے ہی ان کو معلوم ہوگا کہ امریکن ہے ان کا دم نکل جائے گا کیونکہ کئی امریکی کمپنیوں کے اشتراک سے بھی تو کام کررہے ہیں اور اگر کہیں تم نے کہہ دیا کہ امریکی صدر کی بھانجی بھی لگتی ہے تو سر پر اُٹھائے اُٹھائے پھریں گے اور تم ٹاپتے رہ جاؤ گے۔"

"چوپ بے میرا باپ ایسا نہیں ہے۔"

"تو پھر ڈیڑھ درجن سکریٹریاں کیوں رکھ چھوڑی ہیں۔"

"سبھی رکھتے ہیں۔"

"مکھیاں مارنے کے لئے نہیں رکھتے۔"

"بس بس...... باپ کی بات مت قرو۔"

"میں تو کہہ رہا تھا۔"

"نہیں بس...... جب ہوغا مقدر میں تو شادی بھی ہوجائے غی۔"

"بطور سیکریٹری ہی رکھ لیتا۔"

"قہاں رکھوں گا...... جیب میں؟ وہ سالی چپاتی بغم......!"

"رکھنے کا انتظام بھی کردوں گا۔ اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔"

"الاقسم......!" قاسم خوش ہو کر بولا۔

"یقین کرو...... مجھے بھی یہ لڑکی تمہارے لئے بہت پسند آئی ہے۔"

"بعد میں گھپلا تو نہیں قرو گے۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

بہر حال حمید اور سکی اُسے باتوں میں الجھائے ہوئے چلاتے رہے تھے۔ دفعتاً حمید چلتے چلتے ایک جگہ رک گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہو اور پھر وہ آواز ان دونوں نے بھی سن لی تھی۔ کسی گاڑی کی آواز تھی اور ایک جانب کی اونچائی سے آرہی تھی۔ وہ ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں دبک گئے۔

پھر وہ جیپ انہیں دکھائی دے گئی جس پر انہی کے ملک کی فوج کا نشان بنا ہوا تھا۔

"خدا کی پناہ......!" حمید طویل سانس لے کر بولا۔ "یہ تو اپنی ہی طرف کی سرحد کے محافظ ہیں...... تو کیا ہم نے بارڈر کراس کر لیا ہے۔"

"جرور یہی بات ہے۔" قاسم مسمسی صورت بنا کر بولا۔

تھوڑی سی چڑھائی چڑھ کر وہ اُس سڑک تک پہنچ سکتے تھے جس پر جیپ نظر آئی تھی لیکن حمید نے اُسے مناسب نہ سمجھا۔ اس کی بجائے وہ نیچے ہی نیچے اُس سمت بڑھتے رہے جدھر سے جیپ آتی دکھائی دی تھی اور پھر آگے چل کر چٹانوں کے درمیان گم ہوگئی تھی۔ کچھ دیر بعد قاسم کی بھی تقدیر کھل گئی۔ یعنی بھیڑوں کا ایک گلہ بھی نظر آ گیا۔ دو بھیڑیں خریدی گئیں۔ چاقو تو حمید کے پاس موجود ہی تھا۔ تمباکو نوشوں کے لئے ماچس بھی ضروری ہوتی ہے لہٰذا کسی نہ کسی کے پاس نکل ہی آتی ہے۔ ادھر اُدھر سے خشک لکڑیاں اور خشک گھاس اکٹھا کی گئی اور بس پھر کام بن گیا۔ ایسی جگہ پر تھے کہ آسانی سے دیکھے بھی نہیں جا سکتے تھے۔ ایک بھیڑ ذبح کر دی گئی۔ کھال بھی حمید ہی کو اُتاری پڑی۔ اس کے بعد وہ لمبا لمبا لیٹ گیا اور سکی قاسم کا ہاتھ بٹانے لگی۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہ بوکھلا کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔ انہوں نے

فائروں کی آوازیں سنی تھیں۔

"یہ قیا ہونے لغا......!" قاسم بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "سالے کسی کو کھاتے پیتے نہیں دیکھ سکتے۔"

"یہ کوئی اور معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ ہم اپنے ملک کی حدود میں ہیں۔ آگ بجھا کر اس دراڑ میں چلے جاؤ۔" حمید اُٹھتا ہوا بولا۔ "میں دیکھتا ہوں۔"

وہ آواز کی سمت چڑھائی پر چڑھنے لگا۔ فائروں کی کچھ آوازیں دور کی تھیں اور کچھ قریب ہی کی معلوم ہوتی تھیں۔ وہ بڑی احتیاط سے اوپر چڑھ رہا تھا۔ چٹان کے اختتام پر ایک دراڑ نظر آئی جس کے اندر کا اُجالا کہہ رہا تھا کہ دوسری طرف راستہ مسدود نہ ہوگا۔ اس نے چاروں طرف دیکھ کر دراڑ پر قدم رکھ دیا۔ داہنا ہاتھ بغلی ہولسٹر پر رکھا تھا۔

تھوڑی ہی دور چل کر رک جانا پڑا۔ ایک آدمی اوندھا پڑا نظر آیا جس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ پیر بھی آزاد نہیں تھے۔ جسم میں حرکت پائی جاتی تھی۔ شاید حمید کی آہٹ ہی پر اس نے سر گھمانے کی کوشش کی تھی۔

"تم کون ہو...... اور یہ کیا ہو رہا ہے۔" حمید نے آہستہ سے پوچھا۔

وہ اُسے ویران ویران سی آنکھوں سے دیکھتا رہا پھر ہذیانی انداز میں بولا۔ "خدا کے لئے مجھے بچاؤ...... ورنہ وہ مار ڈالیں گے۔ مجھے ہٹا لے چلو یہاں سے ورنہ ذرا ہی سی دیر میں میرا خاتمہ ہو جائے گا۔"

"وہ کون ہیں۔" حمید نے اُس کے ہاتھوں کی گرہ کھولتے پوچھا۔

"بتا دوں گا...... نہ میں کوئی مجرم ہوں اور نہ...... جلدی کرو۔ وہ قریب ہی ہیں۔"

حمید نے اس کے پیر بھی کھول دیئے اور وہ اُٹھ بیٹھا۔ کھڑا ہوا تو قدم لڑکھڑا رہے تھے اور اُس کا رخ ادھر ہی تھا جدھر سے حمید آیا تھا۔ دراڑ کی طرف سے بدستور فائرنگ کی آوازیں آرہی تھیں۔ دور کی بھی اور قریب کی بھی۔ وہ اُسے سہارا دے کر اُدھر ہی لے چلا جہاں قاسم اور سکی کو چھوڑ آیا تھا۔

اجنبی کہہ رہا تھا۔ "تھوڑی دیر فائرنگ کر کے وہ مجھے گولی مار دیتے۔ میں نے انہیں کہتے سنا تھا۔"

"کس پر فائرنگ کررہے ہیں۔"

"میرے حواس ٹھکانے نہیں ہیں۔ پہلے مجھے کسی محفوظ جگہ لے چلو...... میں سب کچھ بتا دوں گا۔"

قاسم آگ بجھا کر چٹان کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔ ادھ کچا گوشت کھا رہا تھا اور سارے زمانے کو گالیاں دے رہا تھا۔ سکی بیٹھی ہنس رہی تھی۔ حمید نے اجنبی کو انہی کے پاس بٹھا دیا۔ وہ قاسم کو خوفزدہ نظروں سے دیکھے جارہا تھا۔

"ہم امن پسند لوگ ہیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"وہ یہاں بھی پہنچ سکتے ہیں۔"

"ان کے بارے میں کچھ بتاؤ بھی تو۔"

"مم...... یہ میرا سر چکرا رہا ہے...... غشی۔" اس نے بدقت کہا اور آنکھیں بند کرلیں۔ پھر اگر حمید نے جھپٹ کر سنبھالا نہ ہوتا تو سر پیچھے پڑے ہوئے پتھر سے ٹکراتا۔ اُس نے اُسے بہ آہستگی لٹا دیا۔

"اَبے یہ قس کو پکڑ لائے۔" قاسم بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ کنکھیوں سے سکی کی طرف دیکھے جارہا تھا۔ اجنبی جوان العمر اور خوش شکل تھا۔ لیکن شائد کئی دنوں سے شیو کرنا نصیب نہیں ہوا تھا۔

"کوئی مصیبت زدہ ہے۔ کچھ بتانے سے پہلے ہی بے ہوش ہوگیا۔"

"اب اس قو بھی کھلانا پڑے گا۔" قاسم نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

کرنل فریدی اور ایس پی شہباز فورس کے کچھ افراد سمیت فائرنگ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ مخالف سمت سے ہونے والے فائر اچانک رک گئے تھے اور شہباز بولا۔

"احتیاط سے...... وہ مردود شائد اب اپنی پسپائی کا ڈرامہ کررہے ہیں۔"

فریدی کچھ نہ بولا۔ لیکن آگے بڑھتا رہا۔ کسی چیتے کی طرح چوکنا تھا۔ دفعتاً کسی جانب سے مخصوص انداز میں بجائی جانے والی سیٹی کی آواز آئی اور فریدی رک گیا۔ ایس پی شہباز کی

آنکھوں میں پل بھر کے لئے حیرت کے آثار نظر آئے تھے۔

سیٹی کی آواز پھر آئی اور اس بار فریدی نے سمت کا صحیح تعین کرلیا اور اسی جانب بڑھتا ہوا بولا۔ "آیئے۔"

"میں نہیں سمجھا۔" شہباز بولا۔

"میرے آدمیوں نے اُنہیں قابو میں کرلیا ہے۔ اطلاعی اشارہ تھا۔"

شہباز کے چہرے پر بادل سا آکر گزر گیا اور وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے ہوئے فریدی کے ساتھ چلتا رہا۔

اور پھر وہ اُس جگہ جا پہنچے جہاں تین آدمی بندھے پڑے ہوئے تھے اور ان کے قریب ہی رائفلیں پڑی نظر آئیں۔

"اوہ......!" شہباز بولا۔ "یہ تو شکوہ آباد کے مفرور بدمعاش ہیں۔ ہمیں عرصہ سے ان کی تلاش تھی۔"

"جناب عالی۔" ان میں ایک نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی لیکن شہباز ڈپٹ کر بولا۔

"خاموش رہو...... ورنہ گولی ماردوں گا۔"

"اگر یہ شکوہ آباد کے مفرور بدمعاش ہیں تو آپ جانیں۔" فریدی نے لاپروائی سے کہا۔

"لیکن ...... آپ کے وہ آدمی......!" شہباز نے پُرتشویش انداز میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میرے علاوہ اور کسی پر خود کو ظاہر نہیں کرتے۔"

"شاید اسی لئے آپ اب تک زندہ ہیں۔"

فریدی نے شانوں کو جنبش دی اور سگار کا گوشہ توڑنے لگا۔

شہباز نے تینوں قیدیوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ "یہ چار تھے۔ ساتھ ہی فرار ہوئے تھے۔" پھر اُن سے کڑک کر پوچھا۔ "چوتھا کہاں ہے۔"

"غائب ہوگیا جناب عالی......!" ایک بولا۔

"اچھا اچھا...... اب تم پاگل پنے کی باتیں بھی کرو گے۔" شہباز اُنہیں خونخوار نظروں سے گھورتا ہوا بولا اور اپنے آدمیوں سے کہا۔ "ہتھکڑیاں ڈال کر انہیں لے چلو۔"

"مم......مگر...... جناب عالی!"

"خاموش رہو" شہباز دہاڑا۔

فریدی دوسری طرف منہ پھیر کر مسکرا رہا تھا۔ واپسی کے سفر میں شہباز خاموش رہا۔ اپنے پروگرام کے مطابق وہ زری کوہ کے سرکش آدمیوں کی ایک کمین گاہ پر چھاپہ مارنے آیا تھا۔ لیکن اُس کمین گاہ تک پہنچنے سے پہلے ہی ان پر فائرنگ شروع ہوگئی تھی۔ فریدی کو بھی ساتھ لایا تھا۔

شکوہ آباد کی حدود میں داخل ہوکر فریدی نے اس سے کہا۔ "اچھا خان شہباز میں تو اب جا کر آرام کروں گا۔ بہت تھک گیا ہوں۔ آپ اپنے مفروروں کو لے جایئے...... جس غرض سے گئے تھے وہ نہ ہوا۔ یہ لوگ شکوہ آباد کے مفرور ملزم نکلے۔"

"آپ فکر نہ کیجئے۔ میں اب خان عبدالرحمٰن کی حویلی کی تلاشی کا وارنٹ حاصل کروں گا اور آپ بھی میرے ساتھ ہوں گے۔" شہباز نے کہا۔

"ہاں آخری صورت یہی رہ جاتی ہے۔" فریدی بولا۔

خان شہباز لینڈ رور سے اُتر کر اپنی جیپوں کی طرف بڑھ گیا اور فریدی نے ہوٹل کی راہ لی۔ کچھ دور چل کر ڈیش بورڈ کے خانے سے ٹرانسمیٹر کا ماؤتھ پیس نکالا۔

"ہیلو...... بی تھرٹین...... ہارڈ اسٹون کالنگ......ہیلو بی تھرٹین۔"

"بی تھرٹین سر......!" ریسیور سے آواز آئی۔

"وہ کسی چوتھے آدمی کی بھی بات کر رہے تھے جو اُنہیں کے الفاظ میں غائب ہوگیا۔ ہمیں کوئی چوتھا آدمی نہیں دکھائی دیا جناب۔ وہی تینوں فائرنگ کر رہے تھے۔"

"تمہیں پوری طرح یقین ہے کہ اس سلسلے میں تم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔"

"مجھے پوری طرح یقین ہے جناب۔"

"اُوور اینڈ آل۔" کہہ کر فریدی نے سوئچ آف کیا اور ماؤتھ پیس کو ڈیش بورڈ کے خانے میں رکھ دیا۔ وہ سچ مچ آرام کرنا چاہتا تھا کیونکہ دات اُسے شیر افگن کی کوٹھی میں گزارنی تھی۔ اُس کے کاغذات دیکھنا چاہتا تھا۔

شام کی چائے پی کر سو گیا۔ نیند کا سلسلہ دروازے پر ہونے والی دستک نے توڑا تھا۔

گھڑی دیکھی۔ رات کے نو بج گئے تھے۔ اُٹھ کر دروازہ کھولا اور آنے والوں کو دیکھ کر متحیر رہ گیا۔ حمید اور قاسم کے ساتھ دو افراد اور بھی تھے۔ ایک غیر ملکی لڑکی اور ایک ایسا آدمی جس کا پورا چہرہ پٹیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ صرف آنکھوں کی جگہ کھلی نظر آ رہی تھی اور سب سے بڑا اچنبھا یہ تھا کہ حمید اور قاسم اپنی صاف ستھری شکلوں میں تھے۔ ڈاڑھیاں اور بالوں کے جھاڑ جھنکاڑ غائب ہوگئے تھے۔ فریدی نے خاموشی سے پیچھے ہٹ کر انہیں اندر آنے کیلئے راستہ دیا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" اس نے حمید کو گھورتے ہوئے آہستہ سے کہا اور اس آدمی کی طرف دیکھنے لگا جس کا چہرہ پٹیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

"آپ کے لئے تحفہ ہے۔" حمید نے کہا۔

"کیا مطلب......؟"

"پٹیاں کھول کر دیکھ لیجئے۔ آپ پسند فرمائیں گے اور یہ بھی بھول جائیں گے کہ ہم دونوں ہپیوں کے روپ میں کیوں نہیں نظر آ رہے......!"

"تم خود ہی کھولو......!" فریدی بیزاری سے بولا۔

اور حمید آگے بڑھ کر اُس کے چہرے سے پٹیاں کھولنے لگا۔ بندش ایسی ہی تھی جیسے سارا چہرہ زخمی ہوگیا ہو۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں مقیم ہوں۔" فریدی نے پوچھا۔

"اس لڑکی نے شہباز کو فون کر کے آپ کا پتہ معلوم کیا تھا اُس سے کہا تھا کہ آپ کی گرل فرینڈ ہے اور دارالحکومت سے آئی ہے۔"

فریدی ہونٹ بھینچے کھڑا حمید کو گھورتا رہا۔ لیکن جیسے ہی اس شخص کا پورا چہرہ کھلا وہ چونک پڑا اور اس کے چہرے کا تیکھا پن غائب ہوگیا۔

"داور......!" وہ مضطربانہ انداز میں اُس کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

"جی ہاں...... کیپٹن حمید کی عنایت سے بچ گیا ورنہ میری لاش آپ کے سامنے پیش کردی جاتی۔ وہ کچھ دیر فائرنگ کرتے اور پھر مجھے گولی مار کر فرار ہوجاتے اور میں اس حال میں ملتا کہ ایک رائفل میرے ہاتھ میں دبی ہوتی اور گولی کا سوراخ پیشانی پر ہوتا پھر خبر چھپتی کہ شیر افگن کا قاتل پولیس کا مقابلہ کرتا ہوا مارا گیا۔"

رات کے تین بجے تھے اور پروفیسر خلجی کے بنگلے کی بعض کھڑکیاں ابھی تک روشن نظر آرہی تھیں۔ ایک موٹر سائیکل چکردار سڑک پر بنگلے کی جانب بڑھتی دکھائی دیا اور عین صدر دروازے کے سامنے جارکی۔ رضوانہ اُس پر سے اُتری اور دروازے پیٹنے لگی۔ دروازہ کھولنے والا نادر تھا۔ وہ اُسے دھکیلتی ہوئی اندر گھسی اور اُسے دروازہ بند کرنے کو کہتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی۔ نادر پورے لباس میں تھا۔ اوور کوٹ بھی پہن رکھا تھا۔ سر پر فلٹ ہیٹ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کہیں باہر جانے کے لئے تیار ہو رہا ہو۔ لائبریری میں پہنچ کر وہ اُس کی طرف مڑی اور بولی۔ ''یہ پہلا اتفاق ہے کہ وہ لوگ مقررہ وقت پر وہاں نہیں پہنچے۔''

''یہ ناممکن ہے...... قطعی ناممکن۔'' نادر نے اُسے پُر اشتباہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو میں کیا جھوٹ بول رہی ہوں۔'' رضوانہ غرائی۔

''میں یہ نہیں کہتا...... اوہ...... میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہوگی۔ فریدی یہاں پہنچ گیا ہے۔''

''یہاں پہنچنے سے کیا ہوتا ہے۔ اُس طرف تو اسکی پہنچ نہیں ہے۔ اُنہیں اُدھر سے آنا تھا۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے...... مال کہاں ہے۔''

''جہاں ہوتا ہے۔''

''اُسے نکال لاؤ۔''

''تم خود نکال لاؤ۔'' وہ کنجی اُس کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔ ''میں بہت تھک گئی ہوں۔''

''نادر اُس سے کنجی لے کر باہر نکلا اور موٹر سائیکل کی سیٹ کے نیچے قفل کا سوراخ تلاش کرنے لگا۔ کنجی گھما کر سیٹ اُٹھائی ہی تھی کہ کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی اُس پر پڑی اور جس پوزیشن میں تھا اُسی میں رہ گیا۔ گاڑی اُس کی طرف بڑھتی چلی آرہی تھی۔ تیز روشنی میں آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ اُچھل کر روشنی کی زد سے نکل گیا۔

گاڑی قریب ہی رکی اور اُس پر سے پانچ آدمی اُترے۔

''نادر۔ جہاں ہو...... وہیں ٹھہرو۔'' سناٹے میں ایک آواز گونجی۔ لیکن نادر چھلانگ مار کر پھر موٹر سائیکل کے قریب آیا اور اُٹھی ہوئی سیٹ کے نیچے سے کچھ نکالنے لگا۔ ایک فائر ہوا۔ گولی اُس کے پیروں کے قریب پڑی تھی۔ وہ اُچھل کر صدر دروازے کی طرف بھاگا اور اندر گھس کر دروازہ بند کرلیا۔

کرنل فریدی نے موٹر سائیکل کی اُٹھی ہوئی سیٹ کے نیچے ٹارچ کی روشنی ڈالی اور سیاہ رنگ کا ڈبہ نکال لیا اور اُسے اپنے ایک ساتھی کے حوالے کرتا ہوا حمید سے بولا۔ ''دروازہ کھلواؤ...... نہ کھولے تو توڑ دو۔''

''حمید نے آگے بڑھ کر دروازہ پیٹنا شروع کردیا۔ پھر فریدی کے اشارے پر اُس کے تینوں آدمی دروازہ توڑنے کے لئے آگے بڑھے ہی تھے کہ دروازہ کھل گیا اور پروفیسر خلجی کا وحشت زدہ چہرہ نظر آیا...... چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اُنہیں دیکھتا ہوا بولا۔ ''یہ کیا طوفان بدتمیزی ہے اتنی رات گئے۔''

''ہمارے پاس نادر کی گرفتاری کے وارنٹ ہیں۔'' فریدی نے آگے بڑھ کر کہا۔

''تو یہاں کیا کر رہے ہو...... وہ یہاں نہیں ہے۔''

''کیا مجرم کی پشت پناہی کے جرم میں تم بھی گرفتار ہونا چاہتے ہو۔ وہ ابھی ابھی تمہارے بنگلے میں اسی دروازے سے داخل ہوا ہے۔''

''بکواس ہے۔'' پروفیسر کے عقب سے رضوانہ کی آواز آئی۔

''یہ باہر موٹر سائیکل کس کی کھڑی ہے۔'' فریدی نے رضوانہ سے سوال کیا۔

''ہوگی کسی کی۔ میں نہیں جانتی۔''

''اس موٹر سائیکل کی سیٹ کے نیچے سے کم از کم دو پونڈ ہیروئن برآمد ہوئی ہے۔''

''ہوئی ہوگی۔ پتا نہیں کس کی موٹر سائیکل ہے اور کون کھڑی کر گیا ہے۔''

''ہوسکتا ہے پھر اُسی کی ہو جو سیٹ اُٹھا کر ہیروئن کا ڈبہ نکال رہا تھا اور ہمارے للکارنے پر تمہارے بنگلے میں داخل ہوگیا۔''

''اندر آکر تلاشی لے لو...... یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔'' رضوانہ نے کہا۔

''ہم یہی کریں گے۔'' فریدی آگے بڑھتا ہوا بولا۔ پروفیسر اُس کے ساتھ چل رہا تھا

اور بے حد خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔

انہوں نے پوری عمارت چھان ماری۔ فریدی کے دو ساتھی باہر ہی رہ گئے تھے۔ غالباً عمارت کی دوسری جانب سے نکاسی کے راستوں کی نگرانی کر رہے تھے۔

بہرحال نادر کا سراغ نہ مل سکا۔ آخر فریدی پروفیسر کی طرف مڑا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ ''وہ تمہارے بنگلے میں داخل ہوا تھا۔''

''میں تمہاری بات کی تردید کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔'' پروفیسر نے آہستہ سے کہا۔

''ڈیڈی۔'' رضوانہ دھاڑی۔

''کیپٹن حمید اُس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اُسے ہلکی سی چمک کا احساس ہوا اور اُس نے بڑی پھرتی دکھائی ورنہ چھت سے ٹکرانے والی گولی پروفیسر کی کھوپڑی میں پیوست ہوگئی ہوتی۔

اُس نے رضوانہ کا پستول والا ہاتھ اوپر اُٹھا دیا تھا۔ پھر بایاں ہاتھ رضوانہ کی ٹھوڑی پر پڑا اور وہ دوسری طرف الٹ گئی۔ اس کا اعشاریہ دو پانچ کا چمکدار پستول اب حمید کے ہاتھ میں تھا۔

اور پھر فریدی کے اشارے پر رضوانہ کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔

وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پاگل ہوگئی ہو۔ جو کچھ بھی کہہ رہی تھی وہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

پروفیسر دیوار سے ٹکا کھڑا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔

''اس کتیا نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔'' وہ ہانپتا ہوا بولا۔ ''اسے تو خودکشی کر لینی چاہیے تھی لیکن اس نے مجھ پر فائر کیا۔''

وہ چیختی ہوئی پروفیسر پر جھپٹی لیکن حمید نے بازو پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔

''اسے فی الحال کسی کمرے میں بند کر دو۔'' فریدی نے اس سے کہا اور وہ دوسرے آدمی کی مدد سے اُسے دوسرے کمرے میں گھسیٹ لے گیا۔

پروفیسر نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ ''وہ یہیں تہہ خانے میں ہے لیکن اب ادھر سے اُس تک پہنچنا محال ہے۔ ایک راستہ اور بھی ہے جسے میرے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا۔ میں تمہیں وہاں لے چلوں گا۔ میں نے تہہ خانے میں بوٹیوں کا عرق کشید کرنے کے لئے جدید ترین مشینیں لگائی تھی۔ اس مردود نے انہیں ایسی مشینوں میں تبدیل

کر دیا جو ہیروئن بنا سکیں اور شراب بھی کشید کرنے لگا۔ میرے سینے پر خان شہباز کی توپ رکھ دی گئی تھی۔ نادر اسی کا کارپرداز ہے۔ اُس نے اُس دیوانی کتیا کو پھانس کر مجھے اس حال کو پہنچایا ہے۔ میری حیثیت عضو معطل کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ زبانی احتجاج کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دو سال سے میں تہہ خانے میں قدم بھی نہیں رکھ سکا۔ میں نہیں جانتا کہ وہاں اور کیا کیا ہے۔''

''چلو مجھے وہ راستہ بتاؤ۔ تمہیں وعدہ معاف گواہ بناؤں گا۔ تمہارا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔'' فریدی اس کا شانہ تھپک کر بولا۔

وہ خاموشی سے باہر نکل آیا اور ایک جانب سے ٹیلے کی ڈھلان میں اترنے لگا۔

وہیں فریدی کے وہ دو ساتھی بھی ملے جو باہر رہ گئے تھے۔ فریدی انہیں نکاسی کے راستوں کی نگرانی کرنے کی ہدایت دیتا ہوا پروفیسر کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

ٹیلے کے نیچے پہنچ کر پروفیسر رک گیا اور فریدی کی طرف مڑ کر پوچھا ''ٹارچ ہے۔''

فریدی نے ٹارچ روشن کر لی۔ پروفیسر اُس کے ہاتھ سے ٹارچ لے کر بولا۔

''ادھر بہت بڑے بڑے جنگلی چوہے بھی ہیں۔ ہوشیار رہنا۔''

روشنی کا دائرہ ایک بڑے سوراخ پر پڑا تھا جس سے ایک خاصا جسیم آدمی چوہے کی طرح گزر سکتا تھا۔ پروفیسر نے ٹارچ فریدی کو تھماتے ہوئے کہا۔ ''عقب سے روشنی ڈالو اور میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔''

''اندر ہی کے راستے کو کیوں نہ آزمایا جائے۔'' فریدی نے آہستہ سے کہا۔

''قطعی ناممکن ہے۔ اُس نے اندر سے بند کر لیا ہوگا۔ باہر سے راستہ بنانے کے لئے ڈائنا مائیٹ ہی استعمال کرنا پڑے گا۔ اس سوراخ کی لمبائی تین چار فٹ سے زیادہ نہیں ہے۔ اُس کے بعد تم پیروں سے چل سکو گے۔ فکر کیوں کرتے ہو۔ پہلے میں جا رہا ہوں۔''

اس نے اپنے دونوں ہاتھ اور سر سوراخ کے اندر ڈال دیئے اور کسی چھپکلی ہی کی طرح سوراخ میں رینگ گیا۔ فریدی ٹارچ کی روشنی سوراخ میں ڈالتا رہا تھا۔ اس کے بعد اُس نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا اور پروفیسر کے بیان کے مطابق تین یا چار فٹ کے بعد ہی اُس کے پیر زمین سے جا لگے اور وہ سیدھا کھڑا ہوگیا۔ سامنے پتھر کی بنائی ہوئی دیوار تھی جس میں ایک

آہنی دروازہ بھی نظر آیا۔ دیوار میں کئی جگہ سوراخ بھی دکھائی دیئے کئی بڑے بڑے چوہے اُچھل اُچھل کر اُن سوراخوں میں جا گھسے۔

پروفیسر دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شائد بہت عرصے سے نہیں کھولا گیا تھا۔ فریدی نے بھی زور آزمائی کی اور دروازہ کھل گیا۔ عجیب سی بدبو کا بھپکا دروازے سے باہر آیا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئے اور پروفیسر آہستہ سے بولا۔ ”بے آواز چلنے کی کوشش کرو۔ یہاں اسلحہ بھی ضرور ہوگا۔ وہ درندہ ہے۔ انسانی زندگی کی اُس کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ شیر افگن کو اسی نے قتل کیا ہوگا۔ دفعتاً روشنی کا دائرہ انسانی ہڈیوں کے ایک ڈھانچے پر پڑا اور پروفیسر جہاں تھا وہیں رک گیا اور پھر سحر زدگی کے سے عالم میں بولا۔ ”خدا کی قسم میں نہیں جانتا۔ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا...... میرے خدا یہاں یہ سب کیا ہوتا رہا ہے۔“

”مجھے یقین ہے۔“ فریدی اس کا شانہ تھپک کر بولا۔ ”چلو آگے بڑھو۔“

دفعتاً اُنہوں نے کسی کے قدموں کی چاپ سنی اور فریدی پروفیسر کو گھسیٹتا ہوا شراب کے ایک بڑے چوبی پیپے کی اوٹ میں ہو گیا۔

پھر انہیں نادر دکھائی دیا جو اسی طرف چلا آ رہا تھا۔ اُس کے داہنے ہاتھ میں ایک موم شمع تھی اور بائیں ہاتھ میں پستول تھا۔ ان سے تھوڑے ہی فاصلے پر رک کر اُس نے موم شمع اوپر اُٹھائی اور دیوار پر کچھ دیکھنے لگا۔

”اندر والے راستے کی نگرانی کر رہا ہے۔“ پروفیسر نے فریدی کے کان میں کہا۔

”نادر پستول زمین پر ڈال دو۔ تم میرے نشانے پر ہو۔“ دفعتاً فریدی نے اونچی آواز میں کہا اور موم شمع نادر کے ہاتھ سے گر گئی۔ ساتھ ہی اُس نے آواز کی جانب ایک فائر بھی جھونک مارا۔

لیکن اندازے کی غلطی کی بناء پر وہ فائر ضائع ہو چکا تھا۔ فریدی نے اُسے دوسرے فائر کی مہلت نہ دی۔ اُس کے ریوالور سے شعلہ نکلا اور نادر کے گرنے کی آواز اندھیرے میں گونج کر رہ گئی۔ موم شمع گرتے ہی بجھ گئی تھی۔

کوئی ٹھوس چیز فرش پر پھسلتی ہوئی اُن کے قریب ہی آ رکی۔ یہ شاید نادر کا پستول تھا۔

فریدی نے ٹٹول کر اُسے اُٹھا لیا۔ پھر ٹارچ روشن کی۔ نادر تھوڑے ہی فاصلے پر پڑا نظر آیا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور اس طرح پلکیں جھپکا رہا تھا جیسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔

فریدی کی گولی اُس کی داہنی ران میں لگی تھی۔

پروفیسر نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”اب بتاؤ تمیس مار خاں۔ اب دھمکاؤ مجھے۔“

نادر نے اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن فریدی ریوالور سیدھا کرتا ہوا بولا۔ ”چپ چاپ پڑے رہو ورنہ اب کھوپڑی میں سوراخ ہو جائے گا۔“

باہر چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور ایس پی شہباز اپنے آفس میں بیٹھا کھڑکی سے دور کی پہاڑیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ بائیں جانب تینوں قیدی کھڑے تھے۔ وہی قیدی جنہیں فریدی کے آدمیوں نے گرفتار کیا تھا۔ دفعتاً شہباز اُن کی طرف مڑ کر بولا۔ ”جو کچھ میں نے سمجھا دیا ہے اُس کے خلاف نہ ہو۔ ورنہ تمہارے بال بچوں تک کا پتہ نہیں چلے گا۔“

”ایسا ہی ہوگا عالی جاہ۔“ تینوں نے بیک آواز کہا۔ اتنے میں انسپکٹر یوسف زئی نے اندر آ کر اطلاع دی کہ فریدی آ رہا ہے اور اس کے ساتھ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی ہے۔

”آنے دو۔“

شہباز بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ لیکن جیسے ہی وہ آفس میں داخل ہوئے وہ بُری طرح چونک پڑا کیونکہ اُن کے ساتھ ایک آدمی اور بھی تھا۔ فلائٹ لیفٹیننٹ داور۔

”اُوہ...... تو یہ مل گیا۔“ اس کی زبان سے بیساختہ نکلا۔

”جی ہاں...... اور ایک بڑی عجیب کہانی سنائی ہے۔“

”وہ تو سبھی سناتے ہیں۔ آپ لوگ تشریف رکھئے۔“

”یہی تینوں تھے۔“ داور نے قیدیوں کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

”صبر سے کام لو۔“ فریدی بولا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“

”جی...... تو کیا کہانی سنائی ہے اُس نے۔“ شہباز نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"یہ کہانی شیر افگن سے شروع ہوتی ہے۔ اُسے آپ کے اور نادر کے مشترکہ بزنس کا علم ہوگیا تھا۔"

"کون سا مشترکہ بزنس۔" شہباز کا لہجہ مضحکہ اڑانے کا سا تھا۔

"وہ بعد میں بتاؤں گا پہلے آپ کہانی سنئے۔"

"کیا یہ مجھے پھانسنے کی کوئی اسکیم ہے...... میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"میں صرف کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ بنانے بگاڑنے کی بات نہیں ہو رہی۔ ہاں تو بیچارہ شیر افگن جانتا تھا کہ آپ کے خلاف کوئی ثبوت مہیا نہ کر سکے گا لہٰذا اس نے سوچا کہ کوئی ایسی حرکت کی جائے کہ مرکز کی توجہ اس طرف مبذول ہوجائے اور کوئی وہاں سے آ کر یہاں کے حالات کا جائزہ لے۔ لہٰذا اُس نے کئی بڑے دھماکے کئے اس طرح کہ کوئی جانی نقصان نہ ہونے پائے۔ پھر ایک ایسے اجنبی کی کہانی سنانے لگا جس نے اس کی موجودگی میں شہر کو تباہ کردینے کا عہد کیا تھا۔ اس سلسلے میں اُس نے داور کو اپنے اعتماد میں لیا۔ نادر نے کسی طرح اس کی سن گن پالی اور شاید آپ کو مطلع کردیا۔ آپ نے ان دونوں کی نگرانی پر اپنے کچھ آدمی لگادیئے اور اُن کے حالات سے بخوبی آگاہ رہنے کی کوشش کی۔ نادر ہی نے آپ کو یہ اطلاع بھی بہم پہنچائی کہ وہ دونوں دارالحکومت جانے والے ہیں۔ اتفاقاً اسی دوران میں داور کے باپ سے شیر افگن کا جھگڑا ہوگیا۔ بہرحال وہ دونوں الگ الگ ہی دارالحکومت کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک ہی ہوٹل میں قیام کیا لیکن الگ الگ کمروں میں، اور داور نے وہاں اُس سے اُس کے کمرے میں بھی ایک آدھ بار ملاقات کی تھی۔ ان دونوں نے دراصل مجھ سے ملنے کی اسکیم بنائی تھی۔ آپ نے شیر افگن کے قتل کی اسکیم بناڈالی۔ قتل سے قبل والی رات کو داور نے اپنے کمرے میں کھانا طلب کرکے کھایا اور بیہوش ہوگیا۔ دوسری بار آنکھ کھلی تو ہوٹل کے کمرے میں نہیں تھا۔ شیر افگن کا قتل اُس کے سر منڈھنے کے لئے آپ نے اس کا اغواء کرایا۔ اصل قاتل نادر تھا۔ کیس میں کسی قدر الجھاوا پیدا کرنے کے لئے شیر افگن کے سوتیلے بھائی کی اسپورٹس کار بھی استعمال کی گئی۔ دراصل آپ یہ چاہتے تھے کہ میں آپ کی انگلی پکڑ کر شکوہ آباد تک پہنچوں اور آپ یہاں یہ ڈرامہ دکھادیں۔"

"کون سا ڈرامہ۔" ایس پی غصیلے لہجے میں بولا۔

"وہی ڈرامہ جو کل سہ پہر کو زری کوہ میں ہوا تھا۔ یہ تینوں کچھ دیر تک ہم پر فائرنگ کرتے اور پھر داور کو گولی مار کر فرار ہوجاتے اور جب ہم وہاں پہنچتے تو داور کی لاش اس حال میں ملی جس سے صاف ظاہر ہوتا کہ وہ پولیس کا مقابلہ کرتا ہوا مارا گیا۔ قاتل ہونے کی مہر اُس کی پیشانی پر ثبت ہوجاتی اور وہ اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے زندہ نہ رہتا۔"

"کسی جاسوسی ناول کا پلاٹ سنا رہے ہیں کیا......؟" ایس پی زہر خند کے ساتھ بولا۔

"جی ہاں...... جنہیں کل سرحد پار سے آنا تھا وہ آج تک نہیں پہنچ سکے۔"

"کیوں میرا مضحکہ اڑانے کی کوشش کررہے ہیں کرنل صاحب۔ آپ کو اس کے لئے پچھتانا پڑے گا۔"

"ان کے نہ پہنچنے کی وجہ یہ ہے کہ پرسوں رات کو اُدھر ہی کیپٹن حمید نے اُن چھ افراد کا صفایا کردیا تھا جو اصل کارپرداز تھے۔"

"کہے جایئے...... میرے پلے کچھ بھی نہیں پڑ رہا۔"

"مجھے علم ہے کہ شمشیر گل کو کہاں دفن کیا گیا ہے اور وہ پانچوں میری گرفت میں ہیں۔"

شہباز اس بار اُسے قہر آلود نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔ کچھ بولا نہیں...... اُس کی آنکھوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ آہستہ آہستہ ذہنی انتشار میں مبتلا ہوتا جارہا ہے۔ فریدی اُسے بغور دیکھتا ہوا بولا۔ "نادر کو ڈر تھا کہ کہیں شیر افگن نے وہ سارے ثبوت اپنی ڈائری میں درج نہ کردیئے ہوں جو آپ دونوں کے خلاف استعمال کئے جاسکتے۔ اس لئے اُس نے اُس کی ساری ڈائریاں غائب کردیں۔"

"میرے خلاف...... آپ کوئی ثبوت پیش نہ کرسکیں گے۔ بکواس کئے جایئے۔" شہباز ایک دم سے باہر ہوگیا۔

"قریباً دو پونڈ وہ ہیروئن میرے قبضے میں آگئی ہے جو کل اُن لوگوں کے حوالے کی جانے والی تھی۔ لیکن وہ آئے ہی نہیں۔"

"براہِ کرم خاموش ہوجایئے۔ میرا وقت نہ ضائع کیجئے۔ مجھے اور بھی کام ہیں۔"

"فی الحال پہلا کام یہی ہوگا کہ اپنے خلاف سب سے بڑے شاہد نادر کو تلاش کرکے ٹھکانے لگادیں۔ لیکن عرض ہے کہ وہ بھی میرے قبضے میں ہے اور ڈی ایم کی موجودگی میں اپنا

بیان ریکارڈ کرا چکا ہے۔"

دفعتاً شہباز اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے ریوالور نکال لیا تھا۔ انہیں کور کرتا ہوا بولا۔ "تم میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑوں گا۔"

لیکن دوسرے ہی لمحے میں بائیں جانب سے فائر ہوا اور اُس کا ریوالور اچھل کر دور جا پڑا۔

انسپکٹر یوسف زئی کے سروس ریوالور کی نال سے دھوئیں کی پتلی سی لکیر نکل کر فضا میں بل کھا رہی تھی۔

شہباز اپنا زخمی ہاتھ دوسرے ہاتھ سے دباتے ہوئے دھاڑا۔ "ذلیل... کمینے... نمک حرام۔"

"شائد اسی وقت کے لئے شمشیر گل کی گولیوں سے بچ گیا تھا۔" یوسف زئی نے سرد لہجے میں کہا اور پھر ڈی ایم کے حکم سے خان شہباز کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔

قاسم نے حمید کو اس زور سے بھینچا کہ اُس کی پسلیاں کڑکڑا گئیں۔

"ارے ارے...... یہ کیا کر رہا ہے چھوڑ مجھے۔" حمید بلبلا اُٹھا۔

"ہائے ہائے حمید بھائی مجا آ غیا۔"

قاسم اُسے چھوڑتا ہوا بولا۔ "ابے یار قہتی ہے کہ تم سے زیادہ خبصورت آدمی آج تک نظر سے نہیں گزرا۔"

"خبط صورت کہا ہوگا۔"

"یہ قیا ہوتا ہے۔"

"بالکل چغد ہوتا ہے۔"

"جاؤ سالے تم یونہی زجبات پر ٹھنڈا پانی ڈال دیتے ہو۔"

"زجبات نہیں جذبات۔"

"ہوتا ہو غا کچھ...... ٹھینگے سے۔"

"اس کے لئے کیا سوچا ہے۔"

"تم نے سوچا ہے کہ میں نے سوچا ہے۔"

"میں نے کیا سوچا ہے۔"

"تمہی تو قہہ رہے تھے کہ انتظام قر دو غے رکھنے کا کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔"

"وہ کیا کہتی ہے۔"

"قہتی ہے کہ یہیں کی پیشنٹی دلا دو۔ تمہیں چھوڑ کر قہیں نہ جاؤں غی۔"

"ذرا چپاتی بیغم کا ذکر کر کے دیکھو پھر میں دیکھوں گا کہ کیسے نہیں جاتی۔"

"پھر شروع قر دیا۔ دیکھو اچھا نہیں ہو گا۔"

"اس سلسلے میں کرنل صاحب سے مشورہ کروں گا۔"

"اے جاؤ وہ تو یونہی دیکھ دیکھ کر جلے جا رہے ہیں۔"

"کچھ کہہ رہے تھے کیا؟"

"جی ہاں...... پھر مار رہے تھے جو کچھ اللہ نے دے دیا ہے اُس پر قناعت کرو ورنہ ساری جندگی پچھتاتے رہو گے۔ تو قیا دے دیا ہے اللہ نے...... آخر قس لئے دے دیا ہے اللہ نے۔ شہد لگا کر چاٹوں۔"

"یہ بھی کر کے دیکھ لو...... خیال بُرا نہیں ہے۔"

"جان سے مار دوں غا۔" قاسم مٹھیاں بھینچ کر اُس کی طرف لپکا اور وہ ہنستا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

پھر وہ فریدی کے کمرے کے سامنے رکا تھا۔ دروازے پر دستک دی۔ اندر سے اجازت ملنے پر دروازے کا ہینڈل گھمایا۔

فریدی تنہا نہیں تھا۔ لیفٹیننٹ داور اور اُس کا باپ ناصر خان بھی موجود تھے۔

"آیئے...... آیئے۔" داور حمید کو دیکھ کر اُٹھتا ہوا بولا۔ "میرے نجات دہندہ تو حقیقتاً آپ ہیں۔"

"نہیں بھائی۔" حمید نے مسکرا کر کہا۔ "سب کچھ اللہ کی طرف سے ہوا تھا۔ نہ مجھ سے ایک حماقت سرزد ہوتی اور نہ میں اس طرح بھٹکتا ہوا اُدھر آ نکلتا جہاں یہ معرکہ درپیش تھا۔"

"میری زیادہ تر کامیابیاں اسی کی حماقتوں کی مرہونِ منت ہوتی ہیں۔" فریدی بولا۔

''میری جان تو آپ ہی نے بچائی تھی۔'' خان ناصر نے کہا۔

''وہ بھی محض اتفاق تھا۔ یہی کہنا چاہئے کہ اللہ آپ کو زندہ رکھنا چاہتا تھا۔''

''اور آپ سے ملتے ہی مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس فرعون کے دن پورے ہوئے۔''

''ان ساری کامیابیوں کا سہرہ دراصل مرحوم شیر افگن کے سر ہے۔ انہوں نے بہت بڑا خطرہ مول لے کر مرکز کو اس طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اوپر والوں نے شہباز کی طرف سے اس طرح آنکھیں کیوں بند کر رکھی تھیں۔'' ناصر خان نے کہا۔

''محض لاعلمی کی بناء پر۔ اُس نے تخریب کاروں کی سرکوبی کا ڈھونگ رچا رکھا تھا۔ اسی کی آڑ میں اس نے کیسے کیسے لوگوں کی پگڑیاں اچھالی تھیں۔ سوچ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ خان زمان اور خان ابوالخیر تو ملک ہی سے فرار ہو گئے۔''

فریدی کچھ نہ بولا۔ اُس کی آنکھیں دفعتاً کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔

''لیکن وہ لوگ آپ کو کہاں کہاں لئے پھرے تھے۔'' حمید نے داور سے پوچھا۔

''مجھے کچھ ہوش نہیں۔ پتا نہیں کس قسم کے انجکشن دیتے رہے تھے کہ دیکھ سکتا تھا، سن سکتا تھا لیکن کچھ سمجھ نہیں سکتا تھا۔ اپنی قوت ارادی سے کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔''

''لیکن اس وقت تو آپ پوری طرح ہوش میں تھے جب مجھ سے ملاقات ہوئی تھی۔''

''اُس سے ایک دن قبل حالت کچھ بہتر ہوئی تھی۔ کیونکہ انہوں نے انجکشنوں کا سلسلہ ختم کر دیا تھا اور مجھے ایک غار میں لے جا کر رکھا تھا اور اسی دن مجھے معلوم ہوا کہ میں کن حالات سے دوچار ہوں اور میرا کیا حشر ہونے والا ہے۔ نادر وہیں اس غار میں لاف وگزاف کرنے آیا تھا۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ کس طرح اُس نے شیر افگن بابا کو قتل کر دیا اور کس طرح مجھ پر ان کے قتل کا الزام آیا ہے اور شہباز کس طرح کرنل صاحب کو بھی غچہ دینے کی کوشش کرے گا۔ وہ مزے لے لے کر پوری اسکیم میرے سامنے دہراتا رہا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے ایک بھیانک خواب کی طرح یاد آتا رہتا ہے۔''

''بھول جایئے...... اسی کا نام زندگی ہے۔''

''لیکن میں شیر افگن بابا کو نہیں بھلا سکوں گا۔'' داور کا گلا رندھ گیا اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

''واقعی مرحوم ہی کی کوششوں سے ہمیں اس بھیڑیئے سے نجات ملی ہے۔'' خان ناصر نے کہا۔ ''میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ کم از کم اپنی زندگی میں اُنکی بیوہ کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔''

''وہ میری ماں ہیں۔'' داور بولا۔

''بڑے دل گردے کی عورت ہے۔'' فریدی نے کہا۔ ''محض اُسی کی رہنمائی کی بناء پر میں نادر تک پہنچ سکا تھا۔''

تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھ کر چلے گئے اور حمید نے فریدی سے کہا۔ ''میری بھی ایک پرابلم ہے۔''

''فرمایئے۔''

''قاسم اور سکی۔''

''وہ کہہ رہا تھا کہ تمہی اُس لڑکی کو ورغلاتے رہے تھے۔''

اتنے میں پھر کسی نے دروازے پر دستک دی۔ آنے والا قاسم تھا اور بہت زیادہ غصے میں نظر آ رہا تھا۔ حمید کو گھونسہ دکھا کر بولا۔ ''تم نے اچھا نہیں قیا۔''

''قیا اچھا نہیں قیا۔'' حمید نے اس کی نقل اتاری۔

''کیا ہوا کیا بات ہے۔'' فریدی اُسے گھورتا ہوا بولا اور قاسم اس طرح چونک پڑا جیسے وہاں اُس کی موجودگی کا احساس ہی نہ رہا ہو۔

''جی...... بس قیا بتاؤں۔'' قاسم ڈھیلا پڑ کر ہکلایا۔

''بہت غصے میں آئے تھے۔''

''جی ہاں...... بات ہی ایسی تھی۔'' وہ حمید کی طرف ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ ''یہ شخص مجھ قو جندہ نہیں رہنے دے گا۔''

''آخر ہوا کیا......؟'' حمید بگڑ کر بولا۔

''تم نے اُس کو قیوں بتا دیا......!'' قاسم نے آنکھیں نکالیں۔

''کیا بتا دیا۔''

''اب یہ مجھ سے پوچھ رہے ہو...... سس...... سس...... قچھ نہیں۔''

وہ شائد ''سالے'' کہنا چاہتا تھا لیکن فریدی کی موجودگی کا خیال آتے ہی صرف ''سس سس'' کر کے رہ گیا تھا۔

"اُوہ...... اچھا...... وہ......!" حمید سر ہلا کر بولا۔ "ہاں میں نے اُسے بتا دیا تھا کہ تم شادی شدہ ہو۔ وہ بھی اس خیال سے کہ شاید اسی طرح تمہارا پیچھا چھوٹ جائے گا۔"

"ابے جاؤ...... چھوٹ غیا پیچھا...... وہ قہتی ہے سیکریٹری نہیں بنوں گی۔ مجھ سے شادی کرو۔ تم لوگ تو چار چار شادیاں قرتے ہو۔ میں مسلمان ہو جاؤں غی۔"

فریدی بے اختیار مسکرا پڑا اور حمید بولا۔ "تب تو وہ بھی پاگل معلوم ہوتی ہے۔"

"تم خود پاگل۔"

"تو گویا تم چاہتے ہو کہ وہ مسلمان ہو جائے اور تم اُس سے شادی کرلو۔"

"یہ قون قہتا ہے۔"

"پھر کیا چاہتے ہو۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں قیا چاہتا ہوں۔" وہ اپنی پیشانی پر دوہتھڑ مار کر بولا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔" فریدی نے سخت لہجے میں کہا۔

"ج...... جی...... قچھ نہیں...... جہنم میں جا رہا ہوں۔" قاسم نے کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

"یہ کیا لغویت پھیلائی ہے تم نے۔" فریدی حمید کو گھورتا ہوا بولا۔

"میں کیا کروں۔"

"آخر وہ چاہتا کیا ہے۔"

"بطور سیکریٹری رکھنا چاہتا ہے۔ شادی نہیں کرنا چاہتا۔ پہلے وہ اسی پر تیار تھی۔ لیکن جب سے اُسے معلوم ہے کہ قاسم شادی شدہ ہے تو اُس پر اُتر آئی ہے کہ وہ بھی شادی کرے گی۔ دراصل اسی لئے وہ مجھے پھاڑ کھانے کو دوڑ رہا ہے کہ میں نے اُسے حقیقت سے کیوں آگاہ کردیا۔"

"ہمیں ڈیڑھ بجے والے پلین سے واپس چلنا ہے۔" فریدی گھڑی پر نظر ڈالتا ہوا بولا۔

"کیوں؟ کیوں؟ اتنی جلدی کیوں۔"

"سیکریٹری برائے اُمورِ مملکت نے طلب کیا ہے۔"

"کیوں؟ کیا اس کی باز پرس ہوگی آپ سے۔"

"کون باز پرس کرسکتا ہے۔ ثبوت اور شواہد کے ساتھ میں نے یہ قدم اٹھایا ہے۔"

"پھر کیا بات ہے۔"

"دوسری اُلجھن ہے۔"

"کیا مجھے بھی نہیں بتا سکتے؟"

"تم نے ابھی خان ناصر کی زبانی دو قبائلی سرداروں کا ذکر سنا تھا۔ خان زمان اور خان ابوالخیر جن کے بارے میں سرکاری ریکارڈ پر آچکا ہے کہ وہ ملک سے فرار ہوگئے ہیں۔"

"جی ہاں...... مجھے یاد ہے۔"

"لیکن وہ فرار نہیں ہوئے۔ پروفیسر خلجی کے تہہ خانے سے برآمد ہونے والے دونوں ہڈیوں کے ڈھانچے اُنہی کے تھے۔"

"خدا کی پناہ۔"

"نادر نے اُس کا اعتراف کرلیا ہے۔ شہباز اُن سرداروں سے کچھ اعترافات کرانا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اُس نے انہیں تہہ خانے کی ایک ایسی کوٹھری میں بند کرادیا تھا جہاں گوشت خور چوہے تھے۔"

"تو انہیں چوہے کھا گئے؟" حمید نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی ہوا تھا۔"

"ظاہر ہے کہ وہ اُن سے ایسے ہی معاملات کا اعتراف کرانا چاہتا رہا ہوگا جن کا ان سے تعلق نہ رہا ہو۔"

"ظاہر ہے ورنہ وہ چوہوں کا شکار کیوں ہوتے۔" فریدی طویل سانس لے کر بولا۔ "بہرحال اب مسئلہ یہ ہے کہ اس معاملے سے متعلق کیا کیا جائے۔ اگر یہ بات ظاہر کی جاتی ہے تو اُن قبائل کو قابو رکھنا دشوار ہو جائے گا جن کے وہ سردار تھے۔"

"واقعی بڑی خطرناک سچویشن ہے۔"

"غالباً سیکریٹری صاحب یہی فرمائیں گے کہ اُن ڈھانچوں کا ذکر میں اپنی رپورٹ سے حذف کردوں۔ ورنہ عدالت میں نادر اور شہباز سے اس کا بھی اعتراف کرایا جائے گا۔"

"آپ دشواری میں پڑ گئے ہیں۔"

"میں خود اُسے قلمزد نہیں کروں گا۔ اُن کا جو دل چاہے کریں۔"

”میں نہیں سمجھا۔“

”رپورٹ اُن کے حوالے کردوں گا۔اُن کا جو دل چاہے کریں۔ میں خود اپنے قلم سے وہ حصہ حذف نہیں کروں گا۔“

”یہ اتنا آسان نہ ہوگا۔“

”استعفے تو آسان ہوگا۔“

”اُوہ......تو کیا اس حد تک بھی بات بڑھ سکتی ہے۔“

”اُصولاً بڑھنی تو نہ چاہیئے......خیر دیکھا جائے گا۔روانگی کی تیاری کرو۔“

دفعتاً پھر کسی نے دروازے پر دستک دی۔حمید نے دروازہ کھولا اس بار سکی تھی۔

”وہ مجھے ٹالنے کی کوشش کررہا ہے۔“ اس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

”کس سلسلے میں۔“

”شادی کے سلسلے میں......حالانکہ میں تمہارا مذہب بھی قبول کرنے پر تیار ہوں۔“

”بات دراصل یہ ہے کہ ہم میں سے بہتیرے چار شادیوں کے رواج سے متنفر ہیں۔ قاسم کا باپ بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ہے۔“

”باپ سے کیا مطلب......؟“

”ہمارے یہاں باپ ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ باپوں کی زندگی میں ہماری کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔لہٰذا تمہیں شادی کے لئے اس کے باپ کی موت کا انتظار کرنا پڑے گا۔“

”میں انتظار کرلوں گی۔“

”آخر اُس میں کون سی خوبی نظر آئی ہے کہ تم اس حد تک جانے کے لئے تیار ہو۔“

”بالکل بیوقوف ہے۔ ایسے لوگ مجھے بے حد پیارے لگتے ہیں۔اپنے ملک میں مجھے ایک بھی ایسا نہیں ملا جو بالکل بیوقوف ہوتا۔“

فریدی اور حمید حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھے جارہے تھے۔

تمام شد